

پہلا دے رنگ کالے

فائزہ افتخار



”پھلاں دے رنگ کالے“ میرے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور کی تحریر ہے اور میری پندرہ تہیں تحریروں میں سے ایک۔ اسی لیے جب ادارہ خاتونِ دانش نے میری تحریروں کو کتابی شکل میں لانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے خود امتثل کو یہ ناول تجویز کیا۔

اس ناول کے بارے میں ایک دلچسپ بات بتائی چلوں کہ اس کی کہانی واقعات سبب تک فرضی ہیں مگر کردار تقریباً ”حقیقی“۔ بسم اللہ جان، معنی ”ڈاکٹر خوشنود، غٹ شعلے، زخم گل، ارباب خلک“ یہ میرے بچپن کے بہت دیکھے بھالے کردار ہیں جنہیں میں نے اس یقین کے ساتھ اس کتاب میں بدل دیا ہے کہ یہ ناول ان کی نظروں سے کبھی گزرے گا ہی نہیں۔ ان میں سے بیشتر شخصیات ابادی نیند سوچ گئی ہیں۔ دوسری اہم بات جو اس ناول کو میری نظروں میں اہم بناتی ہے وہ یہ کہ اس سے قبل میں نے کبھی طویل تحریر لکھنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔ میں طبعاً ”رسمی نہیں ہوں اور کچھ کچھ لکھ پڑھ بھی“ لیکن اس کہانی نے خود اپنا آپ مجھ سے لکھوایا اور مجھ میں یہ اعتماد بھی پیدا کیا کہ اگر میں چاہوں تو خود یہ گستاخ اور مسل پند کا لیل انارکتی ہوں۔

اس ناول میں میرا سب سے پندرہ کردار ”مومنہ“ کا ہے۔ میں نے کو شش کی ہے کہ اس کے کردار کی ان تمام خوبیوں یا خصوصیات کو ٹھیک اس انداز میں قارئین تک پہنچا سکوں جس طرح انہوں نے مجھے حاشا کیا اور لکھنے آکسایا۔

مجھ سے کہنے والوں نے اکثر پوچھا ہے کہ میری کہانیوں کا مرکزی کردار زیادہ تر مردوں کو ہوتا ہے اس سوال کا جواب تو مجھے بھی نہیں مطلوب البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں نے ایسا کبھی ارادہ نہیں کیا۔

یہ سچ ہے کہ میرے تخلیق کردہ کرداروں میں سب سے مضبوط اور تاثر انگیز کردار مردانہ ہوتے ہیں اور ان بہت سے کرداروں میں سے ایک ”عاشق ملک“ ہے۔ ”مارے گلاب لے جانا“ عاشر ملک

عاشق کوئی باورانی کردار نہیں ہے نہ ہی کوئی مثالی مرد۔ وہ اس معاشرے کا ایک عام مرد ہے۔ بہت سی فحاشت و فحاشت کے ساتھ ساتھ وہی روایتی فلیٹنگ رکھنے والا ایک مرد جو اپنے سے آگے کی کوئی بات نہیں سکتا۔ بالخصوص کسی عورت کو جسے جو رقاہت کی آگ میں اپنے سے رشتوں کو بھی بجھنے تیار نہیں ہوتا۔ ایسا مرد جو عورت کی کسی لغزش کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ایسا مرد جو ”برائی“ ہوئی عورت کے بارے میں وہی فحشہ نظریہ رکھتا ہے لیکن اس بہت عام سے مرد کے اندر کہیں ایک بہت خاص بات بھی موجود ہے جسے میں نے بعد ازاں نے کو شش کی ہے۔

اور یہی عام سے خاص اور خاص سے خاص تر بننے کا کیا ہے۔ یعنی خواہ شہابی کا عمل اس عمل سے گزر کے ہی عاشق ملک میری کہانی کا ہیرو بنے اور ابتداء سے اختتام تک اس کا کام وہاں کا توں برقرار رہا۔

آپ کو یہ کردار عام لگتا ہے یا خاص اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

میرا کتابی شکل میں چھپنے والا پہلا ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ کس کردار کی کن صفات میں اپنی پسندیدگی لاتے ہیں۔

فاطمہ افتخار کاہور

پھلاں دے رنگ کالے

پچھلے سال چھٹیوں کے بعد وہ جو یادیں لے کے اس گھر سے رخصت ہوئی تھی، وہی سرد روئے اس بار بھی اس کے استقبال کو موجود تھے، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا، وہی بی بی جان کی برقی ٹیڑھے چھوٹی لگاہیں، وہی چچی جان کا ڈھوپ چھاؤں سازاج، وہی تانی امی کا لائق ساروہ، وہی کزنز کا گریز اور وہی درود دیوار کی اجنبیت، باچا جان کی طبیعت میں بھی اسے کوئی خاص تبدیلی محسوس نہ ہوئی، وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتی انہیں بہتر پہ اسی طرح موت کی آہٹیں سننے دیکھتی۔ کوئی نہ کوئی نرس ان کی ڈرپ چیک کر رہی ہوتی اور ان کی کوئی نہ کوئی بہو یہ تیرہ کر رہی ہوتی۔

”باچا جان اس بار بچے نہیں لگتے، خدا خیر کرے۔“ اور خدا برسوں سے خیر کرتا چلا آ رہا تھا اور باچا جان فاقہ، ہارٹ، ایک، کینسر اور شوگر کے ہر ہر حملے کے بعد بچ جاتے تھے اور اگر کبھی طبیعت بہت تبھلی ہوتی تو زبان سے چند نونے چھوٹے لفظ بھی ادا کر لیتے، درنہ فاقہ نے ان کا تھلا دھڑوٹو مفلوج کیا ہی تھا، فوت ہوگیا بھی ستاڑ کی تھی۔ اس بار بھی شاید طبیعت کچھ بہتر تھی، چچی ساری اولاد کے اکٹھا ہونے پر انہوں نے وکیل کو بلوا کر وصیت تیار کروائی تھی۔

وہ عمر کے اس حصے اور صحت کے اس مرحلے پہ تھے کہ ان کا وصیت تیار کرنا کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہ تھی۔ انہوئی تو یہ ہوئی کہ انہوں نے تمام اولاد میں برابر ترکہ تقسیم کرنے کے بعد اولاد کی اولاد میں سے صرف ایک پوتی مقدس زریاب کو اختیاری حیثیت سے اپنے پرستار کا وٹھ اور خاندانی نوادرات و زیورات کا وارث قرار دیا۔

اکا وٹھ کے بارے میں تو وہی بہتر جانتے ہوں گے، البتہ نوادرات و زیورات کا تخمینہ لاکھوں نہیں کروڑوں میں لگایا جا رہا تھا۔ اگرچہ انہیں بچپن کا خاندانی حرمت و وقار کے سناٹی تھا

لیکن بڑی بات تو یہ تھی کہ نسلوں سے یہ ترکہ خاندان کے بڑے بیٹے کی ملکیت میں چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک غیر تحریری آئین تھا جس کی رُو سے تاجا یا جان افراسیاب خٹک اس کے امین تھے اور باچا جان نے بڑے اور چھوٹے بیٹے کو چھوڑ کر خاندانی عظمت کی یہ نشاںیاں اپنی اپنی جگہ کو سمیٹنے کی وصیت کی تھی، ایسی پوتی جس کی حیثیت ہی اس خاندان میں خشک بھی جانی جاتی تھی۔ نفرت، کراہیت، گریز، لافلتی کے وار تو بچپن سے سختی چلی آ رہی تھی باچا جان کے پھیلے بیٹے زریاب خٹک کی اکلوتی اولاد مقدس، اب عداوت بھی اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

☆☆☆

”داؤ، کتنی بیکاری ہے ناں سنا تھا، بالکل سنڈریلا جیسی۔“

فارحہ نے لیٹ ایڈیشن لینے والی اپنی نئی فریج کلاس فیلو کو دیکھ کے کوئی چوٹی بار کھا۔ اس سے قبل وہ اسے دیکھ کے سٹوڈنٹ اور باریٹی ڈول کے خطاب بھی دے چکی تھی۔ یہ پشاور کا سب سے مشہور کالونٹ تھا جہاں اکثر ممالک کے سفارت کاروں کے بیچے زیر تعلیم تھے۔

”سنڈریلا اتنی موٹی نہیں تھی، تم نے اسٹوری بک میں دیکھا نہیں کیا؟“ ریمانے چاکلیٹ سے چپکنے ہاتھ لٹو سے پونچھے ہوئے رنگ و وحید کے بلے ٹیلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ انگلش، جرسن، فریج فمیلیز کے بچوں کو ملنے والی قوجہ ہے وہ اکثر مجلس رتی۔

”اور کیا، وائٹ میٹلکشن ہونے سے ہر کوئی سٹوڈنٹ نہیں ہو جاتا۔ ہماری مقدس سے زیادہ کیوٹ نہیں ہے وہ سنا تھا۔“ شادو ہمیشہ کی طرح اپنی فیورٹ کزن کے گلے میں انہیں ڈال کے اسے گفتگو میں سمجھ لاتی۔

”لیکن وہ فارز ہے۔“ فارزہ اپنے پوائنٹ پے زور دیتے ہوئے بولی۔

”تو کیا ہوا؟“ شادو چپا چپا کے بولی۔ ”مقدس کی مدر بھی فارز نہیں۔“

”رنگی؟“ نوعمری بچیوں کا وہ پورا گروپ مارے ایکساٹمنٹ کے چلا اٹھا۔ جب کہ خود مقدس حیرت سے لگک بنی شادو اپنی چھوٹی زاد کو جھتی رہی۔ خود اس کی نو سالہ زندگی میں یہ پہلا انکشاف تھا اس کی ماں کے بارے میں۔

”آئی سویٹرز میں نے خود سنا ہے۔“ وہ مقدس کی طرف پلٹی۔

”یاد ہے جب ہم اسلام آباد بڑے ماموں کے ہاں گل ریز کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے گئے تھے، وہاں مناشا آئی پی کی اسکول فرینڈ بھی آئی تھیں انہوں نے آئی پی سے کہا کہ ویسے تو تم سبھی کزن پرینی ہو مگر اس لال گرل کے فچر ز بہت شارب ہیں اور لک بھی انگلش ہے تب ثانی آئی نے کہا کہ اس کی مدر یعنی ہماری آئی فارز تھیں اور ماما کہتی ہیں مقدس ہو جو اپنی مدر جیسی ہے۔“

اور یہ تھا پہلا تعارف اس کا اپنی ماں سے، مکتا عجیب سا لگتا ہے کسی ایسی بچی کے بارے میں یہ سننا، جو آج کے الیٹراکب دور میں میڈیا کی بدولت اپنی عمر سے دس گنا زیادہ میچور سوچ رکھتی ہو، جو ایک بھرے پرے خوش حال کنبے میں پرورش پادی ہو، لیکن نو برس کی عمر میں پہلی بار اس نے اپنی ماں کا ذکر سنا ہو، چاہے اس کی ماں مر ہی کیوں نہ گئی ہو۔

شادو اس کی واحد دوست، جس کے قریب آنے کی واحد وجہ بھی یہی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح ماں سے محروم تھی۔ لوریاں سننے کی عمر میں جب شادو اپنی ماں کے بارے میں فرضی قصے گفٹے کے سنا یا کرتی کہ کل رات ماما پر یوں کے سے سہری پر لگا کے کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آئیں اور مجھے ڈھیر سا پیار کر کے گلے لگے تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

شادو کے پاس اس کا باپ تھا جو جب بیٹی سے ملنے آتا اپنی شریک حیات کی یادیں تازہ کرتا، ثانی بھی جوانی کو گود میں بٹھا کے بیٹی کے بچپن کی شرارتیں سناتی اور ہنستے ہنستے رو پڑتی، ماں کی تصویر تھی جو اس کے بستر کے سر ہانے پر ایک دعا کی طرح آویزاں تھی۔ جب کہ اس کے پاس کیا تھا، ماں کی ہلکی سی شبیہ بھی نہیں تھی جس کے سہارے وہ اس کا سراپا تراشتی، نہ ہی باپ کی زلفات جو اس سے اس کی ماں کی باتیں کرتا، نہ ہی ماں کے حوالے سے کوئی اور قریبی رشتہ جو انوی کے نقوش میں بیٹی کی پرچھائیں تلاشتے۔

اور اگر اس گھر کے کمین اس کی ماں کا نام تک نہیں لینے، اسے مکمل فراموش کر چکے ہیں تو یہ کچھ ایسی حیرت کی بات نہیں۔ وہ ایک زندہ وجود لیے ہوئے بھی اس عالیشان گھر میں اپنے ہونے کا احساس دلانے میں ناکام ہے تو غیر موجود لوگوں کی بساط ہی کیا۔

مقدس زریاب نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ارد گرد رشتوں کا ہجوم دیکھا، دل کا نہ سہی مگر خون کے رشتوں کا۔ چچا جان تھے جن کے لیے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا ویسے بھی وہ اپنی لا باہالی فطرت کے تحت اپنے کے بچوں تک کے زیادہ قریب نہ تھے، وہ اور ان کی زمینیں، ان کی بڑی بڑی موچھوں اور کئی مگس لگیں رکھنے والے دوست، تاش اور شکار کی محفلیں، گھر میں وہ کم ہی نکلتے یا پھر اکثر سوئے ہوئے پائے جاتے۔ ان کی پڑھی لکھی اور گھر کے گھنے ماحول سے سدا کی بیزاریتیم، پچی جان جو بے حد موڈی سی تھیں، کبھی تو اپنے بچوں کے ہجوم میں اس کا اور شادو کا بے ضرر سا وجود انہیں سے طرح ٹھکاتا، بلا وجہ چڑ جاتیں وہ ان دونوں کی موجودگی سے اور خصوصاً اس کے سامنے تو دبا دبا سا اٹھار بھی کر دیتیں کہ اس سے زیادہ بھل کر بد ہتھ بھ ہونے کی ان کی تعلیم اجازت نہیں دیتی تھی۔ البتہ شادو کو بی بی جان یعنی اس کی سگی ثانی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کے سامنے وہ جتنا ہی زمینیں۔ کبھی بھی شخص بی بی جان اور ان کی لاڈلی نواسی کی چڑ میں مقدس پہ خاص مہربان بھی ہو جاتیں۔ جو بھی تھا بہر حال انہوں

نے محبت و شفقت کے نام پہ نہ سہی، انسانیت اور خدا ترسی کے حوالے سے دونوں لڑکیوں کا مقدور بھر خیال ضرور رکھا۔

باچا جان سدا کے پیار، اس نے ہوش سنہیلائی ہی انہیں بستر سنہیلائے دیکھا کبھی کبھی تو وہ اس قدر پیار پڑ جاتے کہ سارا خاندان اکٹھا ہو جاتا، کئی اہم تقریبات ملتوی ہو جاتیں، کئی ضروری کام التواء میں ڈال دیئے جاتے اس غرض کے پیش نظر کہ کہیں خدا خواستہ..... لیکن بڑی سے بڑی تکلیف کے بعد باچا جان جھلے چنگے ہو جاتے، ویسے جھلے چنگے کہنا تو غلط ہوگا یوں کہیں موت کو تال کے داہیں آ جاتے۔ انہیں اپنے کمرے سے نکلنے کی برس بیت چکے تھے۔ بی بی جان تھیں، باچا جان کی دوسری بیوی، انتہائی طرदार اور حسین خاتون، نہایت کم عمری میں شادی ہو جانے کی وجہ سے یہ پٹھان زادی، دادی اور تانی بننے کے باوجود انہیں چالیس سے اوپر کی زندگی تھی۔ جب کہ باچا جان اچھے خاصے ضعیف نکلے، بچی جان بچیں، بی بی جان اتنی بھی کم عمر تھیں، پچاس کے قریب ہیں۔ بس ویسے ہی عمر جانے کیوں ان پر بڑبڑائی گئی ہے۔ بالوں کو سفیدی چھو کے گزر گئی، بس چند تاریں سی جھلنا تھیں ان کے بارعقب سر پہ، نئی بلور آنکھوں میں چنگاریاں چھوٹیں اور باریک سرخ لب سختی سے ایک دوسرے میں جوست رہتے جیسے کوئی اہم راز اس قید سے باہر نکلنے کو بے تاب ہو اور اسے جبراً سینے میں دبا دیا گیا ہو۔ مقدس کو سامنے پا کے یہ چنگاریاں کچھ اور بھڑک اٹھیں اور لب زیادہ بچھ جاتے۔ وہ کم ہی اسے مخاطب کرتیں۔ اس کے لیے ان کے رویے میں یا تو جش ہوئی جھلسی ہوئی، یا خشک ہوئی بڑیوں میں خوف بھائی ہوئی۔

چچا جان اور مرحوم پچھو کی بی بی جان کی بھی اولاد تھی۔ پچھو کی شادی کے ایک سال بعد ہی شادور کو ختم دیتے ہی مرحومین وہ اور شادور تقریباً ہم عمر تھیں۔ جب کہ دو اب چچا کی انوشہ اور پلوشان سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی تھیں۔ ان بڑواں بہنوں کے بعد ان کے اوپر تلے کے تین بیٹے تھے۔ اس کے سگے تایا افراسیاب خلک اور باا جان دونوں بھائی بی بی جان کی مرحومہ سوکن کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے انہیں ماں جیسی ہی عزت دی۔

تایا جان ان کی پہلی شادی کے ساتھ اسلام آباد آسٹل تھے وہ کچھ سیاست وغیرہ کا شغل رکھتے تھے مقدس کے ساتھ ان کا رو بہ بھی کچھ مختلف تھا۔ انہوں نے بھی نظرمصر کے بھی سگے ماں جانے کی انکوئی اولاد کو نہ دیکھا۔ اس کے سلام کا جواب بھی وہ بے رغبتی سے منہ پھیر کے دیتے اس کے علاوہ اس کی کبھی ہمت نہ ہوتی ان سے بات کرنے کی، اگر کسی جھولے بھٹکنے ان کی نگاہ اس پہ پڑ بھی جاتی تو سرخ و سفید چہرہ دیکھنے لگتا۔ بڑی بڑی دادی آنکھیں پورے رنگ ہو جاتیں اور وہ لہجے ڈگ بھرتے باہر نکل جاتے حالانکہ مقدس کو تو انہیں اٹھتے بیٹھتے، بولتے بھڑکاتے ہر

طرح سے دیکھتے رہتا ہے حد پہنچتا۔ کیونکہ ہمیشہ سے اس نے یہ سنا تھا کہ اس کے بابا جان اور تایا جان میں خاصی مشابہت ہے۔ اگرچہ گھر میں اس نے اپنے باپ کی کئی قدر اور تعادیر آدیزاں دیکھی تھیں لیکن تایا جان کی صورت وہ انہیں مجسم دیکھ کے دل کو تسکین دے دیتی تھی۔ جب کہ ماں کے مال کے حوالے سے وہ کوئی بھی ذکر شقی تو تسکین کے بجائے عجیب سی دشت دل کو گھیر لیتی۔

اسے یاد تھا ایک بار جب وہ پلوشہ اور شادور تانی آ بی کی منگنی کی باتیں کر رہی تھیں۔

”تنتی خوب صورت لگ رہی تھیں آ بی۔ میروں شرارے میں اور ان کی لائی گردن میں وہ گلو بند کتنا چ رہی تھی۔“ یہ پلوشہ کی رائے تھی۔

”اتنے میک اپ اور جیولری کے ساتھ تو کوئی بھی خوب صورت لگے گا۔“ شادور کی متاثر آ بی کے ساتھ کم ہی بنتی تھی۔

”خرا کی بات بھی نہیں۔ وہ بے بسی خوب صورت ہیں۔ ہماری پوری فیملی میں صرف انہی کی آنکھیں اور بال بلیک ہیں۔ یہ بھی ان کی انفرادیت ہے۔“ مقدس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

واہ ایسے ہی، باقی کیا کم ہیں۔ ان سے تو تانیہ زیادہ اڑی گئے۔ میری بھی ہانٹ کچھ کچھ کم ہے، لیکن خیر امی میری اتنی بھی تو فطین ہے، تھوڑی سی ہانٹ اور بڑھ جائے تو تمہاری تانی آ بی کیا لگیں گی میرے آگے تم دونوں بھی اچھی لگو گی، بڑی ہو کے بہت اچھی لگو گی دیکھ لینا اور یہ مقدس تو بے ہی ہوئی کونین۔“

”پتہ ہے شانور ماں کہتی ہیں انہوں نے پاپا سے سنا ہے، مقدس کی ممالے حد خوب صورت تھیں، ایسے جیسے کوئی پری، انہوں نے آج تک ایسی حسین عورت نہیں دیکھی، ماما بہتی ہیں ایسی تعریفیں سن سُن کے ان کا اکثر پی جاتا ہے کاش انہوں نے بھی تمہاری ماما کو دیکھا ہوتا۔“

اس نے تانیہ پاپا کے لیے مقدس کی طرف دیکھا جو بے دھیانی میں سبز حیاں اُترتی بی بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ جگے آگوری رنگ کے چارچٹ کے شلوار قمیص چکن کی کریم کلر کی بڑی سی چادر اوڑھے وہ کسی قدر باوقار لگ رہی تھیں۔ سلیٹے سے کندھے بالوں پہ باریک ششون کا دوپٹہ تھا۔ کانوں سے لگی بایلوں کے ساتھ موہے کی تازہ اُدھ کھلی کلیاں لگی تھیں۔

ان کی نگاہ اب تک مقدس سے نہیں پڑی تھی، اس لیے اسے چہرے کے نقوش بگاڑتے ہوئے سطح تاثرات ناپید تھے۔ اس سے نہانے وہ کیوں اسے بہت اچھی لگیں، شاید اس لیے کہ اس نے بھی کبھاری انہیں نفرت اور بے زاری کے بغیر دیکھا تھا، اسی لیے بے ساختہ کہہ اٹھی۔

”بی بی جان بھی تو کوئی پری ہی لگتی ہیں، اب بھی اتنی حسین ہیں تو پہلے کیا لگتی ہوں گی تھیں؟“

اور وہ بھی اس قدر تفصیل سے، اتنے بھانپنے کے ساتھ۔ وہ بدن پہ لگی چٹوں اور ملازموں تک کے سامنے ملنے والی اس ذلت سے بے پرواہ، بس یہ سوچ رہی تھی کہ چلو یہ راز تو کھلا میں ہیتم نہیں ہوں، ورنہ زندگی کے کتنے برس اس الجھن کی کھون میں بیت گئے کہ میری ماں زندہ ہے یا میری ماں اس کو طلاق لگی، میرا باپ اس دنیا میں کہیں ہے یا..... وہ دونوں اس دنیا کے کسی نہ کسی میں موجود ہیں۔ اپنے کھوکھلے لعلق کی ایک بدگنا یادگار سے سیکرے خبر یا نکل انجان۔

اور اسی رات اس کے نکل پڑی چٹوں پہ گرم گور کر ہوئے شاد منت کر رہی تھی۔
 ”مقدس، تو انسان ہے یا پتھر، روتی کیوں نہیں، رو، خدا کے لیے رولو تھوڑا سا۔“
 ”شائو، کیا میری ماں ہندو تھی..... اور کیا اس کی وجہ سے میں کافر کی اولاد کہلاؤں گی؟“ وہ بولی بھی تو صرف یہ۔

”دیکھو پہلی بات تو یہ کہ تم ماموں زریاب کی اولاد ہو اور مسلمان ہی کہلاؤ گی۔ اور دوسرا یہ کہ میں نہیں ان کی تمہاری ماما ہندو تھیں۔ شاید وہ عیسائی ہوں یا پھر یہودی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اہل کتاب سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے تو پھر ضرور مسلمان ہونے کے بعد ہی وہ اس گھر میں آئی ہوں گی، اگر لڑکی بی بی جان کے کہنے کے مطابق وہ کافر تھیں ظاہر ہے کہ ہندو سے تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔“

”تو پھر..... پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے بابا جان نے ان سے..... تک..... میرا مطلب ہے نکاح ہوا ہی نہ ہو۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی خود اپنے لب دانتوں سے کاٹ لیے گویا یہ بات تنہو کرنا بھی کتنا اذیت ناک تھا اس کے لیے۔

”ہائمن..... اپنے خاندان کی روایات کو جانتی ہو تم اور یہ بھی کہ کس طرح ان کی پاسداری کی جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں تمہاری ماما ایک ڈیڑھ سال تک یہاں، اس گھر میں اس فیکل فیلٹی میں بہو کی حیثیت سے رہی ہیں کیا ہمارے گھر کے مرد ذاتی جرات کر سکتے ہیں کہ بغیر کسی نکاح کے، کسی عورت کو یہاں لا کے رکھ سکیں۔ ارے ہم لوگوں کے دادا، پرداد نے چھ چھ سات سات نکاح کر رکھے تھے لیکن ایسی حرکت..... تو بہ تو بہ ایسا تو سوچو بھی مت۔“ وہ اس عمر میں بھی خاندانی روایات سے بخوبی آگاہ تھی۔

”تو اگر میری ماما مسلمان ہو چکی تھیں تو ان کے پچھلے حوالے کو کیوں یاد رکھا گیا ہے۔ کیوں انہیں ہندی، کافر کی اولاد دیکھے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔“ وہ احتجاجاً بالک اٹھی۔
 ”اس لیے کیونکہ.....“ وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ جواز سوچ رہی تھی کہ چچی جان گرم دودھ کا گلاس لے کے اندر داخل ہویں اور اس کی مشکل آسان کی۔

”دیکھنے لی بی جان، مقدس کیا کہہ رہی ہے۔“ شادو، سدکا کی منہ پھٹ اور جذباتی، چلا اٹھی۔ اس کا مقصد محض بی بی جان کے دل میں کسی طرح اپنی دوست کے لیے جگہ پیدا کرنا تھی۔ وہ ان کے گریز اور سرد مہری کو ہمیشہ سوتیلے پن کی رعایت دیتی تھی۔ مقدس نے ”ن کا ہاتھ دبا کے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر تب تک وہ بی بی جان کو سیریاں نیچے اتر کر آنے کی مہلت دے بغیر شروع ہو چکی تھیں۔

”مقدس کو آپ اتنی پسند ہیں مجھے تو یہ ہی تھا۔ میں تو سمجھتی تھی آپ کو سب سے زیادہ پیار میں کرتی ہوں، لیکن یہ کہہ رہی تھی کہ لی بی جان اتنی خوب صورت ہیں اتنی خوب صورت ہیں کہ مجھے اس کی اپنی ماما۔ اس کے لیے دونوں ہی.....“
 لی بی جان کو طیش میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھ کے اس کی زبان گنگ ہو گئی اور مقدس کی انجانے جرم کے احساس سے سبھی، لڑتی ناگوں پہ کھڑی ہو گئی۔

”چٹانگ.....“ اگر محض جسمانی تکلیف کو ہی تشدد کا نام دیا جاتا ہے تو بے شک اس کی پندرہ سالہ زندگی کا یہ پہلا تھپڑ تھا جو اسے ماں کے حوالے سے ملا تھا۔

”تیری اتنی جرات، تو میرا مقابلہ اپنی ماں سے کرے گی۔ ارے میں اصل خاندان کی، عزت دار احمد شاہ کی مسلمان، ساری عمر اپنے دو کار کو سنت سینت کر رکھتے گزری۔ اور یہ..... یہ اس حرف کی نشانی، مجھے پل بھر میں دو کوڑی کا کر گئی، میرا نام اس ہندی کے ساتھ لے کر۔ وہ کافر کی اولاد اور میں اس بد بخت کی نظر میں ایک جیسے ہی، بتا، کہاں دیکھ لی تو نے اس ہندی (ہندو عورت) کی کالی صورت، جو میرے ساتھ مقابلہ کرنے چلی ہے۔ کس نے پھوٹک دیا تیرے کانوں میں اس کے حسن کے بارے میں۔

میں بتاتی ہوں تجھے اس کے کالے کر تو، خود تو کہیں منہ کالا کر رہی ہوگی میرے بیٹے کو ڈنٹ سے دو چار کر کے در بدر کر دیا۔ میرا خان برسوں سے اس کے انتظار میں نہ جی رہا ہے نہ سر رہا ہے۔“

تو تین کے احساس سے بھری بی بی جان اس پہ دھشوں کی مانند چل پڑی تھیں اور پھر باچا جان کی حالت پر اُدھی آواز میں روئے ہوئے غم حال ہو کے ایک جانب پڑ گئیں۔ پورا گھر حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس کے گھر کے در و دیوار نے بھی شاید کسی خان زاد کی اتنی بلند آواز کو نہ پہلی بار سنے تھے، یوں لگتا تھا جیسے افراد کے ساتھ ساتھ دیواریں بھی سکتے ہیں آگئی ہوں اور وہ..... کھنکھن کے بل زین پہ بیٹھی، نچے ہوئے بال، ادھڑی آستین، سو بے رخساروں اور ہونٹوں سے نکلنے خون سے بے خبر بی بی جان کا ایک ایک لفظ دہرا رہی تھی۔ پہلی بار اس نے ان کے منہ سے اپنی ماں کا ذکر سنا تھا

”اس لیے بیٹا، کیونکہ انہوں نے اپنا پچھلا حوالہ کسی کو بھولنے نہیں دیا۔ وہ اس خاندان میں رنج بس جاتیں یہاں کے قاعدے اصول اور روایات اپنا لیتیں تو آج شاید کوئی جان بھی نہ پاتا کہ خان زریاب خلک کی بیوی کہاں سے آئی تھی۔ لیکن شاید وہ آزاد فضاؤں کی ہاسی چادر اور چار دیواری کی پابندی برداشت نہیں کر پائی۔ کون جانے اب تک وہ مسلمان رہی بھی ہے یا نہیں۔“

تمہارے چچا ان دنوں بارود پر یونیورسٹی میں تھے انہیں تمہارے بابا جان نے تصاویر بھیجی تھیں، وہ بھی مہی کہتے ہیں کہ صحیح طرح نہیں جانتے وہ جرن تھیں یا انگریز یا فرخ۔ اپنی شادی کے وقت جب یہاں آئے تو انہیں خبر ہوئی کہ بھائی کی کڑی آجڑے کی ماہ ہو چکے ہیں۔ بی بی جان نے ابھی تفصیل کسی کو نہیں بتائی۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ تمہارے بابا کے ساتھ بھلا نہیں، نہ ہی مشرقی طور اوطار کے تقاضے پورے کر سکتیں، شوہر کی غیر موجودگی میں کسی اور کے ساتھ دوستی پیدا کر لی تھی انہوں نے، والد زریاب نے انہیں تو غیرت میں آکے فوراً گھر سے نکال دیا لیکن خود بھی جگ بھائی کے خوف سے کہیں رو پڑے ہو گئے۔

خاندان کی ناموس پہ لگا یہ زخم ہمارے بزرگ بھلا نہیں پار ہے۔“

”لیکن اس سارے قصے میں میرا قصور کہاں نکلتا ہے۔ میرے ساتھ سب کا رویہ نارمل کیوں نہیں؟“ وہ سر اٹھا سوال کی۔

”میں پھر وہی بات ہوں گی کہ اس بار تمہارے بابا نے یہ سب کسی کو بھولنے نہ دیا۔ وہ خود اگر اس سانچے کو فراموش کر دیتے تمہارے ساتھ سہا یہ بن کے رہے، اپنا گھر بسا لیتے تو لوگ بھی کب کے بھول بھال چکے ہوتے۔ ان کی خود ساختہ جلا وطنی اس زخم پہ کھرٹ نہیں آئے دیتی۔ ہر زخم کو فراموش کرنا چاہیے۔ جن زخموں کا منہ کھلا دے جانے وہ نہیں تو دیتے ہی ہیں۔ تمہارا وجود باجا جان اور بڑے لالہ کو لالہ زریاب کی یاد دلانا رہا گے۔ جو تمہانے کہاں ہیں اور کب آئیں گے۔ حیرت کی بات ہے دونوں بھائیوں نے ان کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مگر انہیں یقین ہے وہ ضرور ایک دن لوٹیں گے، چودہ سال سے اوپر ہو رہے ہیں مجھے اس گھر میں آئے، میں نے آج تک ان کا کوئی خط، کوئی پیغام، کوئی اطلاع آتے نہیں دیکھی۔ ایک بار تمہارے چچا سے کہا تھا کہ بڑے لالہ راستے انڈیا ورسون والے ہیں وہ کیوں نہیں کوشش کرتے بھائی کو ٹھونسنے کی بات کہنے لگے اس کی ضرورت نہیں، وہ لوٹ آئیں گے بلکہ لوٹنے ہی والے ہیں۔ اللہ کرے ان کا یقین سچ ہی ثابت ہو، اگر ایسا ہو جائے تو تمہارا احسان بھی ختم ہو جائے گا۔ کون جانے کہ خون کی کشش انہیں کب کھینچ کے لے آئے۔“ انہوں نے بات مکمل کرتے ہوئے دو دھکا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

”جی نہیں کرتا چچی جان۔“ اس نے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے ٹوٹے لہجے میں کہا۔
 ”یہ پکڑو شانو، اسے ملاؤ وہ یہ بھھاؤ کہ جن کے لیے اس کا وجود ہونے کے برابر ہے اور جو اسے دنیا میں لانے کی وجہ بننے کے باوجود اسے بھلائے بیٹھے ہیں ان کی خاطر کیوں خود کو ہلکان کرتی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، میں اتنی ہی تو گھر میں کیا ہوا، کیسے ہوا کی خبر ہی نہ ہوتی تھی، اسے اس کی عمر گھری کے باوجود میں نے وہ تمام تلخ باتیں اور انکشافات بتادے، جتنے کہ میں جانتی تھی صرف اس لیے کہ اس کے اندر کے کچھ سوال تو خاموش ہوں۔ جو ہے اسے بدلنا نہیں جاسکتا۔ اپنی زندگی کی قدر کرو۔ اسے جیوا پتی پہچان خود بناؤ۔“

اسے لاہور بھیج دیا گیا۔ کئی ڈکالچ میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے جب وہ پہلی بار داخل ہوئی تو اتنی پر اعتماد ہرگز نہیں تھی جتنے کڑے رے دوں نے اسے بنادیا تھا۔ یہاں کوئی اس پہ اس کی ذات پہ کچھ اڑھالے والا نہیں تھا۔ کیسوی اور ڈھنی سکون نے اسے پڑھائی کی جانب راغب کر دیا، ساتھ ہی محنتی صلاحیتیں کھل کے کھر کے سامنے آ گئیں۔ اب وہ کالج کی ہونہار طالبہ تھی۔ ایف ایس سی میں ٹاپ کر لینے کے بعد اس نے میڈیکل لائن کو پختا اور کنگ ایڈورڈ میں چلی آئی۔

یہ دو ڈھائی سال اس نے محض اپنی ذات کی ہمراہی میں گزارے۔ نہ خود کبھی ماں، باپ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا کہ وہ اس کے سونے درو جگا تا۔

تافیکہ شاد دھگی ایف اے کرنے کے بعد اس کے چچے چچے لاہور چلی آئی۔ اس نے یہ عرصہ بھی تمہانے کیسے اس کے بغیر گزارا تھا۔ بی بی جان تو بھی اسے نہ بھیجتیں مگر اس نے مقدمہ اپنے بابا پر حمل آفریدی کے آگے پیش کیا جو اکثر و بیشتر اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اگرچہ چھو پھوکی دفعات کے کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن وہ اس گھر سے اپنا رشتہ ختم نہیں کر سکے تھے۔ کیونکہ بی بی جان کے وہ مصل دانا دی نہیں، گئے بھانجے بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کے والد اور باجا جان پچا زاد بھی تھے۔ یوں وہ ہلا تکلف آتے جاتے رہے۔ اس بار مقدس بھی وہیں تھی۔

”بابا جانی بلیئر بی بی جان کو کبھی مانے، یہاں پورے سرحد میں کوئی آرٹ اسکول نہیں ہے۔ میں فائن آرٹس میں ماسٹر کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے این سی ایس میں ایڈمیشن نہ دلایا گیا تو مزید آگے ہرگز نہیں پڑھوں گی۔“

یہ دھکی لی بی جان کو بھی کچھ سوچنے پہ مجبور کر گئی۔ اس کی بات بہت پہلے سے افرا سیاب خان کے بڑے بیٹے گل ریز خان خٹک سے طے تھی جو لندن میں اعلیٰ تعلیم کی منازل طے کر رہا تھا۔ جب کہ شان کو کمرے سے پرہائی کی طرف دھکی ہی نہ تھی۔ وہ جانتی تھیں زمانہ بدل رہا ہے، بچے اپنے بزرگوں کے فیصلوں میں نقص نکالنے کو تیار رہتے ہیں، کہیں تعلیم کی کسی اور رشتے کے قلم ہونے کا جواز نہ بن جائے۔ شاید اپنی مرضی کی تعلیم اسے پڑھنے لکھنے کی جانب راغب کر ہی دے۔

”چلو کم از کم کوئی تو وارث ٹھہرے گا تمہارے ماموں کے رنگوں سے کھیلنے کے شوق کا۔“ وہ سکرا کے پوئے۔

”ماموں؟ کون سے ماموں۔ چھوٹے ماموں تو ہر گز اس طرف مائل نہیں ہو سکتے تو کیا بڑے ماموں مصوری کا شوق رکھتے تھے؟“

”نہیں وہ تمہارے مصلیٰ ماموں، خان زریاب خٹک، وہ دیوانہ تھا تصویروں کا، رنگوں کا، حسن کا۔“ وہ خجائے کیوں اداں ہو گئے آخر تجربہ نہیں، لڑکیوں ایک ساتھ گزرا تھا۔ شانواران کے بارے میں اور بھی کچھ پوچھنا جانتی تھی لیکن بی بی جان کے سبب چہرے اور بابا کے غصے تھوڑے کچھ کرالچھی گئی۔ ماحول پر ایک بوجھل پن ساطاری تھا۔ مقدس عمر سے بعد ابھرے جس کے احساس سے گھبرا گئی۔ وہ پھر سے اس کیا، کیوں، کب اور کیسے کے جال میں پھنسا نہیں چاہتی تھی۔ بہت مشکل سے اپنے منتشر ذہن کو ایک مقصد کی طرف مائل کیا تھا اس نے کچھ بن جانے کا، اپنی شناخت خود بنانے کا۔

شانوار کے لاہور آ جانے سے بھی اس کی یکسوئی میں خلل پڑا۔ وہ اکثر انجانے میں اس کے خوابوں پر تجسس کو جگا دیتی۔ ایک دن تو بعد ہوئی۔

”تم چلو تو ایک بار میرے ہاسٹل، دیکھو تو سہمی میں غلط نہیں کہہ رہی۔“

”میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔ ہو جاتی ہے اکثر ایسی مشابہت، لیکن میں کیا کروں گی اس عورت سے مل کے۔“

”قسم سے میں تو اسے دیکھ کے حیران ہی رہ گئی، ہو بہو تمہاری آنکھیں، یہی ناک، چہرے کا نکلا حصہ جلا ہوا ہے اس کا، ورنہ کیا پتا تم دونوں ہم شکل ہی کہلاتیں۔ بلکہ پوچھو تو ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ تمہاری عمارت نہ ہوں۔ لیکن خیر اس کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پھچان ہی ہے بالکل دیہاتی قسم کی کسی پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔ ماتھے اور زرخار یہ تل گودے ہوئے ہیں، یہ لہا گھٹھٹ نکالتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی لہو کی تعلق اور رشتے کے بھی کس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے دو انسانوں میں، تم ایک بار اگر دیکھو۔“

”لیکن میں کیوں دیکھوں۔ میں نے اپنی آنکھیں ہزار بار دیکھی ہیں، یہ چہرہ دن میں کئی بار آئینے میں دیکھتی ہوں، پھر ایسی ہی آنکھیں، ایسی ہی ناک دیکھنے کے لیے فضول وقت کیوں ضائع کروں۔ خدا کے لیے شانواب بڑی ہو جاوے، ایسی ایسی باتیں کرنی ہو کہ خدا کی پناہ، ایک پہاڑی دیہاتی عورت سے خواہوا مجھے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو محض اس بناء پہ کہ ہماری آنکھوں کا رنگ ایک ہے۔“ وہ ہیزاری سے بولی۔

”مجھے تو حیرت اس بات پہ ہوئی کہ پورے خاندان میں کسی سے تمہارے نقش نہیں ملتے، جب کہ ایک بالکل انجان عورت، ہمارے ہاسٹل کے کچن میں کام کرنے والی۔۔۔۔۔“

”پلیز شانوار جسٹ اسٹاپ اٹ۔ ایک بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ چپ ہوئی۔

”بی بی جان سے بڑی لمبی بحث کے بعد میں نے زریاب ماموں کے اسٹوڈیو کی چابی حاصل کی ہے۔ چلو اٹھو چلتے ہیں۔“

”کیا؟ بابا کے اسٹوڈیو کی چابی؟ مگر بی بی جان تو ان کے دونوں کمرے لاک رکھتی ہیں۔ کسی کو جانے کی اجازت نہیں، پھر کہیں کیوں جانے دے رہی ہیں۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”بہت مشکل سے سمجھا پائی انہیں کہ اعلیٰ اسائنمنٹ کے لیے مجھے بالکل فریش اور یونیک (منفرد) آئیڈیا چاہیے اس کے لیے میں ماموں جان کی کچھ پیٹنٹنگ اور ڈیو گرافٹس دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ کچھ انسپائریشن مل سکے۔“

”تو پھر جاؤ۔“ وہ میٹرین لے کے نیم دراز ہو گئی۔ اس کی اطمینان بھری ”اجازت۔“ یہ شانوار چل اٹھی۔

”کیوں؟ تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تم کیوں نہیں آستیتیں میرے ساتھ؟“

”دیکھو شانوار جان، میں چیمپوں کے چند دن یہاں گزارنے آئی ہوں۔ مجھے سکون سے رہنے دو۔ میں نہیں چاہتی میرے کسی بھی عمل سے بی بی جان کو سیرا سال میں چند دن یہاں گزارنا بھی دو بھر لگے، تم جانتی ہو میری لاکھ احتیاط کے باوجود کبھی کسی میری کوئی بات ان کا پارہ چڑھا دیتی ہے۔ اس کمرے میں جانے کی اجازت صرف تمہیں ملی ہے

”کیوں تمہارے پاس کیا یہ جواز کم ہے کہ وہ تمہارے بابا جان کا کمرہ ہے۔ عجیب ہے حس لڑکی ہو۔ وہ میرے ماموں ہیں جنہیں میں نے کبھی دیکھا تک نہیں، لیکن آج پہلی بار ان کے کمرے میں جاتے ہوئے میں اس قدر ایکسائٹڈ ہوں۔ تم ان کی بیٹی ہو کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تم اس کمرے میں جاؤ جہاں انہوں نے پہرہ تائے ہو گئے، ان چیزوں کو چھو جو کبھی ان کے استعمال میں رہیں۔ ان کی تخلیقات دیکھو۔“ اس نے اکسایا تو مقدس اداسی

سے مسکرا دی۔

”میں بھی ان ہی کی ایک چیز ہوں جسے کبھی نہ کبھی تو انہوں نے چھوایا ہوگا۔ میں بھی ان ہی کی ایک تخلیق ہوں جسے کبھی کو ان کا کبھی جی نہ چاہا۔“

اور واقعی ایک روز پہلے تک اس کے دل میں کوئی خواہش نہ تھی اپنی ہستی کے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کی۔ لیکن باچا جان کی وصیت نے تو گویا ایک دھماکا کر دیا۔ ہر ایک انگشت بدن اٹھا۔ ہر فرد خصوصاً تاجا جان اور چچا جان اسے قہراً اولاد گاہوں سے گھورنے لگے۔ چچی جان نے اسے لی بی جان کے قہر سے بچانے کے لیے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لیکن لی بی جان کی غضب ناک آوازیں اور تاتی جان کے بلند کونے اسے دیواریں چر کے دھکا رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا اس نے اپنی ذات اس گھر کے کینکوں سے اس قدر الگ تھلگ کر لی تھی کہ ان کے کسی قسم کے رویے کی دھوپ اس تک نہ پہنچ پاتی تھی۔

آج برسوں بعد وہ پھر زربخاں تھی اور اس بار گری کچھ زیادہ بھی تھی کیونکہ پہلے ان کا ہدف اس کی ماں کا مشتبہ حال تھا۔ خاندان کو اس کے ماں باپ کی طرف سے ملے نقصانات کا غم و غصہ تھا اور اب کی بار وہ خود افسوس منقطع کرنے کا باعث بنی تھی۔ اس کی خاطر اس کی بے مول و بے وقت ہستی کی خاطر باچا جان نے صدمہ پرانی روایت توڑ ڈالی تھی۔ معتبر بیٹوں کے ہوتے ہوئے اسے خاندانی ورثہ کا امین قرار دیا تھا۔ وہ خود نہیں سمجھتا تھا کہ ان کے اس فیصلے کے پیچھے کیا مقصد رہا ہوگا۔ ترس، ہمدردی، ازالہ یا آخری وقت میں کی گئی کوئی نیکی سمجھ کے وہ اپنی اس نظر اندازی جانے والی پوچھ کو خاندان بھر میں اہم بنانے جارہے ہیں۔

”لیکن ان کے اس عمل میں میری کوئی بھلائی ہو سکتی ہے۔“ وہ سوچتی رہی۔

”یہ لوگ، میرے سر پرست جو تمام تر کدورت کے باوجود میرے گمان کھلاتے ہیں، میری تعلیم، رہائش اور تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں، ان ہی کو لوگوں سے میری دشمنی پیدا کر دینے میں میری کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ کیا تاجا جان مجھے معاف کر پائیں گے میرا یہ قصور، کیا ان کی اولاد بھول پائے گی اس بات کو کہ میں ان کا حق انجانے میں ہی سہی ٹکڑ ٹکڑ کر گئی۔ کیا لی بی جان کو گوارا ہوگا وہ باشت بھر کی لڑکی، جسے مخاطب کرنا بھی وہ اپنی تو ہیں سمجھتی ہیں، ان کے گھر اتنا اونچا زربخاں حاصل کر بیٹھے گی۔“

باچا جان تو قہقہہ کر رہے ہیں میرے ساتھ میں پہلے ہی بے سہارا ہوں، وہ مجھے دشمنوں کے زعمے میں دیے جارہے ہیں۔ مجھے ان سے بات نہ کرنا ہوگی۔ انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پہ مجبور کرنا ہوگا۔ اگر انہوں نے میری دلجوئی کی خاطر یہاں بیٹھنے کے لیے کہہ دیا ہے تو پھر بیٹے کی غیر موجودگی میں بھی اسے کتنا اہم جانتے ہیں، یہ اقدام کیا ہے تو میں یہ تسلیم کر لوں گی

کہ ماں باچا جان، آپ نے انصاف سے کام لیا۔ آج بیس سال بعد میں آپ کو نظر آ رہی تھی۔ لیکن بس..... بس اتنا ہی..... اتنا ہی کافی ہے کہ..... میں آپ کی نظر میں آ گئی۔

بس..... مگر مجھے دوسروں کی نگاہ میں تو غائب مت ٹھہرائے میں جھلی ہوئی ہوں، تپتے مزا جوں کی مارے، انجانے جرموں کی سرا بھگت رہی ہوں، بیس برس سے۔ اب تک ماما بے وفائی اور بابا کی بے اعتنائی کی سرا میں جھپٹی آ رہی ہوں۔ اب آپ کی ہمدردی کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ آپ کی یہ مہربانی بہت پہنچ پڑے گی مجھے باچا جان، جو خاندان میری ماں کا ایک غیر قوم سے ہونا کتنا غمناک قرار دے کے مجھے اپنی مکمل شناخت دینے سے انکاری ہو جب کہ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کے لیے باعث افتخار ہے چاہے مجھے جہم اک ایسی عورت نے ہی کیوں نہ دیا ہو جو ان کے لیے باعث شرم ہے۔

یہ لوگ مجھے اپنی اولاد کے برابر کھڑا کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اصل نسل ہیں، جب کہ میرے خون میں ملاوٹ ہے ان کی نظر میں، تو پھر اپنی اولاد سے اوپر کیسے دیکھ سکیں گے، مجھے کبھی نہیں جانے پناہ نہیں ملے گی۔

اس نے فیصلہ کر لیا لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے کی ہمت پیدا کرنے میں وہ قطعی ناکام ثابت ہوئی اس کا اندازہ اسے اسی رات ہو گیا جب باچا جان کے کمرے میں اسے کاغذات پر دستخط کرانے کے لیے طلب کیا گیا۔

اوجھ پچوں والے بڑے سے کمرے میں پہلا قدم دھرتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد دھڑ دھڑ گئی اور یہ سرد دھڑ اس قدر غلام تھی کہ اس کا کلس پاتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی نے اس کے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

باچا جان کا استخوان وجود، اپنی بچی کبھی دشوار سانسوں کے ساتھ اس کا منظر تھا۔ وکیل صاحب بڑے غور سے اس دم بدہم تھی ہوئی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ چچا جان نے جیسے شکار کی چٹان سنبھالی ہوئی تھی ان کی نگاہیں مقدس کا نشانہ لے رہی تھیں اور تاجا جان اسے راستے سے ہٹانے کے لیے شاید کوئی سیاسی چال چلنے کا سوچ رہے تھے اور..... اور..... لی بی جان..... ان پر ایک ڈری ڈری سی نظر ڈالنے کے بعد تو اس کی ہمت نے دل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کس حوصلے اور جرات سے اس نے یہ ہمت مجتمع کی اور دل کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیا تھا، لیکن اب وہی ہمت ہاتھ چھڑا کر اسے ایک ایک میڑھی پھسلتی جا رہی تھی۔

دھڑا.....

اس کے گھٹنے بے جان ہو کر مڑ گئے، وہ فرش پر گرنے ہی والی تھی کہ زس نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا، باچا جان کے بستر کی قرسی پر ہی بیٹھا ہے ہونے ایک ہمدردی بھری

نظر اس کے ٹھنڈے ٹھار نیلے ہوتے چہرے پہ ڈالی اور پھر تاسف سے سر ہلاتی باہر چلی گئی۔ وہ انجان، بے گانی ملازمہ شاید اس سارے قصے سے اس کی نسبت زیادہ واقف تھی۔ اسے اپنی کم آگاہی پہ اور بے بسی محسوس ہونے لگی۔

”لو بٹنا، یہاں سائن کر دو۔“ وکیل صاحب نے قلم اور کاغذ اس کے آگے کیا۔

”یہ تحریری ثبوت ہوگا اس بات کا کہ ایک عاقل و بالغ آزاد فرد کی حیثیت سے تمہیں اپنے دادا کی اس وصیت پہ کوئی اعتراض نہیں جس کی رو سے تمہیں اس خاندان میں صدیوں سے چلے آ رہے جتنی نوادرات، زیورات اور اپنے آباؤ اجداد کی دیگر نشانیوں کا وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ تم ان کی حفاظت خلوص نیت سے کرنے کی پابند ہوگی، نیز تمہیں اس کی خرید و فروخت کرنے یا کسی غیر خاندان کے فرد کو انہیں تحفہ یا قیامت دینے کی ممانعت ہے۔“

”ایک منٹ وکیل صاحب“ تایا جان بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”باجا جان ایک بار اور سوچ لیجئے، آپ جذباتی ہو کے یہ فیصلہ کر رہے ہیں۔“ لیکن باجا جان نے اُن سنی کرتے ہوئے اپنا نیلی اُبھری ہوئی، زخمی رگوں والا ہاتھ آگے بڑھا کے وکیل کو کارروائی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اس کا گود میں دھرا کچپکا ہاتھ جب آگے نہ بڑھا تو وکیل صاحب نے کاغذ اس کے سامنے دھرا اور قلم مزید آگے کر کے اسے تھمانے کی کوشش کی۔ قلم اس کی انگلیوں سے ہنس ہوا تو ان کی کچپکاٹ بھی بھجھ ہو گئی اور اس کا بھاری ہوتا سر سائیں سائیں کرتا ہوا بے جان سا ہو کر اس کی گود میں آ کر گر۔

”اوخدا، ایسے بے ہوش ہو چکی ہے۔ نرس، نرس۔“ وکیل صاحب نے امیر خنی تیل دینے کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی دیں۔

باجا جان سر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔ نرس نے آگے بڑھ کے بلڈ پریشر چیک کیا۔

”اوہ بی بی بہت لو ہے۔ سر ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں میرے پاس اس وقت لوبی پی کی کوئی میڈیسن نہیں میں ٹیلیفٹ لکھ دیتی ہوں آپ منگوادیتے۔“ ان کے ہوش میں آنے پہ دے دوں گی۔“ وہ ہاتھ پیر ہلاتے ہوئے بولی۔

”یہاں..... اسے..... اوہ لاؤ“ باجا جان ہمت کر کے بولے۔ اس نے فوراً ہی اسے کرسی سے بیڈ پر ان کے پہلو میں منتقل کر دیا۔

”سر میں ان کے لیے جوس بنواتی ہوں۔“ وہ باہر نکل گئی تو وکیل صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”خان صاحب مجھے اجازت دیجئے۔ میرا خیال ہے اس وقت یہ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ

☆ ☆ ☆ پھر مجھے طلب کر لیجئے خدا حافظ۔

نبرے ہوش کے عالم میں اس نے خود کو چند قد آور گہرے سایوں کے نرغے میں پایا۔ وہ اپنی برف میں لگی انگلیاں ترخ ترخ کی آواز کے ساتھ کھولتے ہوئے قدموں میں پڑا قلم اٹھاتا چاہتی ہے، لیکن ہر بار اس کا ہاتھ قلم کو چھونے سے پہلے ہی کوئی ٹھوکر مار کے اسے چند قدم اور دور کر دیتا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے تو بی بی جان نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پہ جمادیا۔ وہ جھٹی پھٹی آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ ہاتھ پیر ہلاتی رہی اور تایا جان، پتچا جان اور بی بی جان اس کے سامنے ہی اس کے ایک ہم شکل وجود کے پر کھینچے ازار پہ تھے۔ یہ وجود جو خود اس کا تھا۔

”مگر میں..... میں تو..... بی بی جان نے میرے لیوں پہ ہتھیلی جمار کھی ہے اور..... میں خود ہی اپنے آپ کو کیسے ٹھہرتے دیکھ رہی ہوں۔“

یہ خیال اس کے بے ہوشی میں ڈوبے وجود کو ہاتھ تھام کے ہوش کی سرحد پہ کھینچ لایا اور اس کے کانوں میں آتی آواز میں اسے یاد دلانے لگیں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔

”آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں باجا جان۔“

تایا جان کی آواز میں برہمی تھی، غصہ تھا اور جھجھکا ہٹ تھی۔ وہ اتنا اثر و رسوخ، رعب و دبدبہ رکھتے ہوئے بھی اس خنیف وجود کے سامنے بے بس تھے۔ اُن کا ادب، ان کا لحاظ بہت کچھ سینے پہ مجبور کر رہا تھا۔

”ہمارا خاندان سرحد کے چند ممتاز اور قابل احترام خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اور ایک زمانہ مجھے خشک فمیلی کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے جانتا ہے، یہ حقیقت بھی سب پہ عیاں ہے کہ ہمارے ہاں باپ اپنے بڑے بیٹے کو خاندانی پشت در پشت چلے آ رہے فقیں درٹے کی چابی دے کر اس کی جانشینی کا اعلان کرتا ہے۔ جب کہ آپ کا یہ قدم میری حیثیت مشکوک کر دے گا۔“

”تمہاری..... حیثیت پر..... کک..... کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ باجا جان نے اطمینان دلانا چاہا۔

”کیسے نہیں پڑے گا۔ بلکہ میری سیاسی پوزیشن بھی خطرے میں پڑ جائے گی، آپ کا حوالہ میرے لیے محترم سہی مگر میں نے خود اپنی شناخت ایک لمبی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے۔ ملک کے سیاسی آفت پہ اس وقت میرا نام ایک بے دارغ شخصیت رکھنے والے سیاست دان کا ہے۔ لیکن اب لوگ میرے بارے میں چہ میگوئیاں کریں گے۔ جسے اس کے خاندان والے، اس کا باپ قاطبی اعتبار نہ جائیں، عوام کیسے اس کی ذات پہ بھروسہ کرے گی۔ اگر آپ

نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو اس بار لکشن میں میرا جیتنا ناممکن ہے۔ آپ جانتے ہیں ہماری پختون برادری کی ذہنیت کو وہ لوگ خاندانی ناموں کو اڈل جاتے ہیں۔ برائے مہربانی اپنے فیصلے میں ترمیم کیجئے۔“ وہ منت پر اتر آئے۔

”میرا فیصلہ..... اٹل..... ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈھونڈنے کھڑے ہو گئے۔

”میں اپنا حق وصولنا بخوبی جانتا ہوں۔ اپنی برسوں کی محنت سے حاصل کیا گیا یہ مقام ہر حال میں بچاؤں گا۔ اپنے بل بوتے پر بنائے اپنے سیاسی کیریئر کو میں آپ کی بلا جیہ کی ضد پر ہرگز قربان نہیں کروں گا۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تو اب تک خاموش بیٹھے چچا جان اور بی بی جان بھی چونک اٹھیں آخر دراب چچانے بولنے میں پہل کی۔

”وہ ہمارے پاس زریاب لالہ کی امانت ہے بڑے لالہ۔ یہ بات آپ کو یاد رکھنی

چاہیے۔“

”جانتا ہوں، اسی لیے تو..... اس لیے تو..... وہ مضیاں بھینچنے لگے۔

”ورنہ اس کی صورت مجھے اتنا مراد، بد بخت عورت کی یاد دلا دیتی ہے۔ بھائی کی یاد نے ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے منت کی تھی میری کہ یہ لڑکی اس خاندان میں ہی رہنی چاہیے۔ اس کی ماں کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اس پر۔“

”اور زمینیں یہ عہد بھمانا ہی ہے۔“ دراب خشک نے ہنسوج انداز میں کہا۔

”خاص طور پر اس لیے کہ اب زریاب لالہ کے آنے میں دیر ہی کتنی ہے۔ میرا تو خیال ہے باچا جان کہ آپ کچھ عرصہ صبر یہ انتظار کریں۔ لالہ کے آنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ لیجئے گا۔“ ان کی باوقوف پیشن گوئی سن کر مقدس پوری طرح حواسوں میں آگئی، اب اسے اپنا آنکھیں موندے رکھنا دشوار لگنے لگا۔

”کہاں ہیں میرے بابا؟“

”کب آنے والے ہیں وہ؟“

”کیوں اتنے عرصے سے غائب ہیں وہ؟“

ان سب سوالوں کے جواب وہ کمرے میں موجود دفنوں کے چہروں سے کھرچ کر پڑھنا چاہتی تھی۔

”اور کیا پتا وہ بھی اس بد بخت کی صورت دیکھنا چاہے گا یا نہیں۔“ بی بی جان کے سفاک تہرے نے اسے آنکھیں کھولنے سے پھر روک دیا۔

”اسی لیے..... اسی لیے تو..... میں یہ..... یہ کر رہا ہوں اتنے سالوں سے وہ ہم سب

کی وجہ..... کم از کم اب تو..... اسے اولاد کا سکھ، اس کے دل کو صاف کرتا ہے۔“ باچا جان کی دشواری کھڑی سانسوں میں مدھم فمدھم سے چند الفاظ بے ربط سے انداز میں اس کے کانوں میں پڑے۔

”بے وفائی کے داغ یومی نہیں صاف ہو جاتے دلوں سے۔“ دراب چچا تنگی سے بولے۔ ”بھانجے کیا دھن سوار ہو گئی ہے آپ کو باچا جان، بھلا جائیداد میں اس لڑکی کو کھدہ دار بنانے سے ان ساری باتوں کا کیا تعلق ہے۔ کیا بل جائے گا اس سارے بکھیرے سے۔“

”خلافی۔“ باچا جان کے کیوں سے کراہ کی صورت ایک لفظ نکل کر فضا میں ٹھہر گیا۔ لہجہ بھر کوب ساکت ہو گئے۔ تاجا جان اور چچا جان کی خاموشی میں استعجاب تھا اور بی بی جان کے سکوت میں کسی انہونی کا خدشہ۔

”کیسی خلافی کیا ظلم ٹوٹے ہیں یہاں اس پر۔“ کچھ دیر بعد تاجا جان گویا ہوئے۔

”کیا اس کی تعلیم یا تربیت میں کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔ یہی بات لاڈ پیار جتانے کی تو یہ دلوں کے معاملے ہیں اور خشک خاندان میں کوئی منافق نہیں۔ جو وجود آپ کے کھر ٹھ کھر چتا رہے اسے آپ سر آگھوں پر تو نہیں بٹھا سکتے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ اس عورت کی بیٹی ہونے کے باوجود اس سمجھتے تلے رہتی آئی ہے۔ پھر بھی..... پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں اس کے ساتھ کوئی نا انصافی ہوئی ہے اور اس کا احساس آپ کے دل پر بوجھ بڑھا رہا ہے تو اس کی خلافی کا کوئی اور طریقہ بھی تو ممکن ہوگا۔“ تاجا جان ہر صورت وہ فیصلہ بدلنا چاہتے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں ان کے بے تابانہ گھومتے قدموں کی دھمک اسے بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

”ہاں..... تم میں سے کون اسے اپنے بیٹے کے لیے عزت دے گا؟“ اس پیش کش پر صرف بی بی جان چونکیں، تاجا جان اور چچا جان محض ایک دوسرے کو ٹھونکنے والی نظروں سے دیکھ کر رہ گئے اور خود مقدس..... وہ تو متوجع انکشافات سے لرز رہی تھی۔

”لیکن افراسیاب کا ایک ہی بیٹا ہے اور سب جانتے ہیں وہ شاد سے منسوب ہے۔“ بی بی جان نے خشکی بھرے انداز میں جنایا۔ ”اور دراب کے دونوں لڑکے۔“ انہوں نے کچھ کہنے سے قبل بیٹے کی طرف دیکھا وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئے۔ ان کا تعلق اپنی اولاد سے ایسے ہی تھا۔

”نہیں بی بی جان وہ دونوں ہی اس سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں۔ کیوں باچا جان۔“ تاجا جان نے کہا۔

”ہاں..... اتنا فرق..... یہ تو ظلم ہوگا اس پر..... ایک اور ظلم۔“

”کیا ہوا؟“ ابھی طبیعت نہیں سنبھل گیا؟“ شادو توشیو سے بولی۔

”نہیں اب ٹھیک ہوں میں، پہلے سے بہت بہتر۔“

مقدس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر۔ ”شادو..... تمہارے پاس بابا جان کی اسٹوڈیو کی

چابی ہے نا؟“

”ہاں..... ابھی تک میرے ہی پاس ہے، کچھ فوٹو گرافس ہیں، ماموں جان کے کھچے

ہوئے جن سے میں لینڈ اسکیپ کے آئیڈیاز لینا چاہتی ہوں، لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔“ وہ

حیران تھی کل تک تو وہ کوئی دلچسپی نہیں لینا چاہتی تھی۔

”آج رات کو وہ چابی مجھے دے دینا۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”ابھی لو، رات تو ابھی کچھ دیر ہے، ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ جناب، آپ پورے پانچ گھنٹے

سوئی ہیں۔“ اس نے گچھا اس کے سامنے ہاتھ اڑے ہوئے کہا۔

”لیکن نہیں، پہلے تم کچھ کھاؤ، وگمہ سے کھانا منگوائی ہوں، وگمہ..... وگمہ۔“ وہ

کمرے کے دروازے سے جھانک کر ملازمہ کو بلائے لگی۔

”سٹوڈیو، مجھے کافی کے ساتھ سکس یا ایک آدھ سینڈویچ منگوا دو، بس اور کچھ نہیں۔“

کافی آنے کے بعد وہ جلدی جلدی سینڈویچ نگلنے لگی۔ گرم گرم کافی کے بڑے بڑے ٹھونٹ

بھرتے ہوئے اس کی نظریں بے تابی کے ساتھ لمبی نفرتی چابیوں والے اس گچھے پہ پھلتی

رہیں۔

”میں چلوں تمہارے ساتھ۔“ اسے گرم شال لپیٹتے دیکھ کے شادو نے پوچھا۔ وہ فشی

میں سر ہلاتے ہوئے بے آواز قدموں کے ساتھ کبھی راہداری میں مڑ گئی۔ راہداری کے اس

طرف سب لڑکیوں کے کمرے تھے اور سامنے کی لائن میں وہ اسٹور روم کے درمیان بی بی

جان کا بڑا کمرہ تھا جس میں سارا دن ملازماؤں اور مہمان خواتین کا ہتھکھانا لگا رہتا تھا۔ عشاء کی

نماز کے بعد کوئی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا کیونکہ انہیں جلد سو جانے کی عادت تھی۔

مقدس کو ان کے تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل واپس کمرے میں پھینا تھا۔ راہداری کا موزکات

کر وہ ایک لمبے کے لیے رُکی۔ گولائی میں، پیچھے لاؤنج میں غمناک تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ

بائیں جانب باچا جان کے کمرے میں موجود سٹور اور اینڈنٹ ساری رات چوکس رہتے ہیں،

سامنے کھانے والے کمرے اور ڈرائنگ روم کی لائٹس بھی آف تھیں لیکن ان کے پیچھے وسیع

کچن میں اس وقت تمام ملازمائیں ہلکی پھلکی گپ شپ کے ساتھ سارے دن کا پھیلا واسیت

”کیوں خان!“ بی بی جان نے دکھ بھرے انداز میں پوچھا۔ ”میری بیٹی کے لیے کسی

کو بارہ سال کا فرق نظر نہ آیا۔ اس بد نصیب پہ کس نے یہ ظلم توڑا۔ کبھی اپنی اگلی بیٹی کے

ساتھ کی گئی نا انصافی کی تلافی کا خیال آیا آپ کو۔“ تاجا جان کے بھریوں بھرے چہرے پہ وہ

آنسو پھسل گئے۔ ان کی سانسوں کا زیرو بم پھر پریشان ہونے لگا۔

”خدا کے لیے بی بی جان۔ اس قسم کے مسئلے مت چھیڑیں۔ ان کی حالت دیکھیں

آپ۔“ کب سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھے دراب خشک نے لپک کے باپ کو سنبھالا

اور ان کا سینہ سہلائے لگا۔ ”افراسیاب خشک نے نرس کو کال دے دی۔“

”بی بی جان، خود کو سنبھالیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ باچا جان بھی ٹھیک کہتے ہیں اب

وہ زمانہ نہیں رہا۔ بہر حال دراب کی بات میں بھی وزن ہے نہ سب کے آنے میں چند ماہ ہی

رہ گئے ہیں۔ تب تک کے لیے اس مسئلے کو اٹھا کے رکھ دیں۔ جو فیصلہ وہ کرے گا، مجھے اور

دراب کو اعتراض نہیں ہوگا۔ تو اس خاندان میں دو دیویاں رکھنے کا یہ پہلا واقعہ ہوگا اور نہ ہی

عروس کا فرق کوئی انہونی چیز ہے، یہاں سب ہوتا چلا آیا ہے۔“ افراسیاب خشک نے تسلی

دی۔

”باچا جان کو آکسیجن لگانے کے بعد نرس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔“

”اٹھو، بے بی، کیا تم سن رہی ہو..... بیلو!“ اس کے گلے تلخ تھینے کے ساتھ ساتھ وہ

اس پہ پانی کے چھینٹے بھی دیتی گئی۔ اب مقدس کے لیے بے سدھ بڑے رہنے کی اینٹنگ کرنا

دشوار ہو گیا۔ وہ ہلکا سا کسمپاسی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ تینوں یوں چلے گئے جیسے اب تک اس کی

موجودگی سے لاعلم ہوں۔ کمرے میں ایک بار پھر سکون چھا گیا۔ وہ نرس کا سہارا لیے دھیرے

دھیرے چلتی کمرے سے نکل گئی۔ اس نے تجانے کون سی ٹیبلٹ کھائی تھی کہ سر بھاری ہوتا

جار ہاتھا اور آنکھیں بند ہو جھل۔

☆☆☆

”میلوسوٹ کزن، کمال ہو گیا آج تو، اتنی لمبی نیند؟“ آکھ کھولتے ہی خود پہ شادو کو

بھٹکے پایا۔ وہ نکلیے اُونچا کر کے ذرا سا اٹھ بیٹھی۔ دماغ ابھی بھی نیم خوابیدہ تھا لیکن پورا وجود

سبک سا ہو رہا تھا۔ اس نے ہلکے پھلکے ہونے کے اس احساس کو سر تک کر پوری طرح محسوس

کرنے کی کوشش کی لیکن دوبارہ سے آکھ بند کر دی تھی باچا جان کے کمرے میں ہونے والی

کارروائی کی بازگشت سنائی دینے لگی وہ ایک بھٹکے سے پیٹھ لٹی۔

رہی ہوں گی اور دائیں جانب دراب چچا کے حصے میں بھی زندگی جاگ رہی ہوگی۔

انوش اور یلوٹ کے کمرے تو اوپر والے پورشن میں اس کے کمرے کے ساتھ ہی تھے، لیکن ان کے بھائیوں کے کمرے والدین کے ساتھ ہی متصل تھے۔ دراب چچا کی راتیں جاگتی تھیں اس لیے صبح میں، جسے ان کے ہاں ”حجرہ“ کہا جاتا ہے۔ ان کے دوستوں کی محفل عروہ پہ ہوگی۔ اگرچہ حجرہ اس عمارت سے باہر لان کے دائیں طرف بالکل الگ تھلگ ہے، لیکن مقدس جاتی تھی کہ چچی جان دراب چچا کی غیر موجودگی میں سوئی جاتی کیفیت میں رہتی ہیں اور رات بھر اٹھ کر کچن میں جا کر ملانہ ماؤں کے ہاتھ کبھی چائے، کبھی قبوہ خشک میوہ جات کے ساتھ بھجوانی رزقی ہیں۔ اس لیے وہ نہایت احتیاط سے چلتی ہوئی اوپر کی طرف جانی ضرعیاں چڑھنے لگی۔ اس نے سیزھوں کی لائٹ بھی آن نہیں کی، حتیٰ کہ ہاتھ میں دلی تارچ کی مدد بھی نہ لی۔ اوپر آ کے اس نے اندھیرے میں آنکھیں پوری کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔

سامنے کی طرف ٹیرس سے لان میں جلتی لائٹس کی روشنی اندر تک آرہی تھی، ساتھ ہی رات کے اس پہر کی ٹھنڈک تمام تر سفاکی کے ساتھ ہڈیوں میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس پورشن میں پہلی بار آئی تھی۔ یہاں بابا جان کا بیڈروم، ان کی اسٹڈی اور اسٹوڈیو تھا۔ اس نے سب سے پہلے دروازے میں ایک ایک کر کے چایاں لگا تا شروع کر دیں۔ اگرچہ شادو نے اسے چایوں کے نمبر بتا دیئے تھے لیکن تاریکی کی وجہ سے وہ نمبر پڑھنے سے قاصر تھی اور کمرے میں جانے سے پہلے لائٹ جلاتا بھی نہیں جانتی تھی۔ آخر کار چوٹی چابی ڈالتے ہی لاک ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

اس نے پینڈل گھما کر دروازہ کھلیا، کم استعمال ہونے کی وجہ سے دروازے میں چرچر اہٹ سی پیدا ہوئی اس نے سہم کے خو کو ساکت کر لیا اور دم سادھ کر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے دروازہ مزید کھولنے کی بجائے ترچھا ہو کے سرکتے ہوئے اندر آنا زیادہ بہتر جانا۔ اندر کی ٹھنڈک تاریکی میں اس کے جسم پہ ایک عجیب سا رزہ طاری ہو گیا۔ کئی منٹ لاک کے آہستہ آہستہ رک رک کے اس نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ اس سے پہلے وہ اس کمرے میں کبھی نہیں آئی تھی، اس لیے اندازے کے ساتھ ٹوٹتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی اور پردے برابر کر کے اطمینان کیا تاکہ اندر کی روشنی باہر نہ جائے پہلے اس نے تارچ آن کی۔ ہلکی زرد روشنی میں سفید سفید لمبے چوڑے سامنے اسے خوفزدہ

کر گئے۔ جلدی سے سوچ بورت پڑا ہاتھ مار کے اکٹھے دو تین مٹن نیچے کر دیئے۔ ٹیوب لائٹ کے ساتھ ایک لیپ اور پچھلا بھی آن ہو گیا۔ وہ لمبے سفید سامنے دراصل جہازی ساز کے صوفوں اور بیڈ پہ ڈھکی سفید چادروں کے تھے۔ ٹھکے کی تیز ہوا نے اس کے دانت کرکڑا دیئے۔ پھر سے ٹھکے اور ٹیوب لائٹس کے مٹن آف کرتے ہوئے وہ لیپ کی خوابناک روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

شادو نے پہلے ہی بتایا تھا کہ اس کمرے میں اس کے بابا جان اور ماما کی کوئی تصویر موجود نہیں، پھر بھی اس نے ڈرینگ ٹیبل اور بیڈ کی سائڈ ٹیبلز کی ایک ایک دروازہ کو کھٹکا لیا۔ ان میں برائے اختیار، چند ایک کاروباری نوٹیت کی بوسیدہ فائلز اور رسالے موجود تھے۔ ڈرینگ ٹیبل پہ کچھ بھی، چاندی کا چہرہ کی باکس موجود تھا۔ دروازوں میں ڈھیروں پراندے اور سوکھے گجرے پڑے تھے، لیکن نہیں اس کے ماں باپ کی کوئی تصویر موجود نہ تھی۔ شاید کسی نے پورا کرہ جوں کا توں پھوڑتے ہوئے صرف اس جگہ سے اس کی ماں کی موجودگی کے اثرات کو غائب کیا تھا وہ ٹیبل دروازہ کھول کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ دیواروں پہ کئی قدرتی مناظر مہارت سے پینٹ کیے ہوئے تھے۔ زمین پہ رنگوں کے ڈبوں اور ٹیوبز کا خشک ہوا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ کمرہ گرد سے آنا پڑا تھا، شاید صفائی کرنے والے نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

لان میں کھٹنے والی کھڑکی کا شیشہ شاید نیچے کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس درز سے آتی ٹھنڈی ہوا اسے کپکپائے دے رہی تھی۔ ٹیبلٹ میں ڈھیروں الیمز اور گٹھن پڑے تھے۔ اس ایک آدھ گھنٹہ کے دوران اسے ان تصویروں میں سے کچھ ایسے اسرار ہر قیمت پہ حاصل کرنے تھے جو اس تھی کو الجھا سکیں۔

”لیکن اس سے پہلے کیوں نہ میں اسٹڈی میں بھی ایک نظر ڈال ہی لوں۔“ اس نے سوچا اور اسٹڈی کے دروازے میں چابی گھمائی۔ اگرچہ شادو پہلے ہی اسے آگاہ کر چکی تھی کہ اسٹڈی کی تمام بکس وہ دیکھ چکی ہے اور ان میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو اس کی الجھن ختم کر سکے، پھر بھی وہ طائرانہ نظروں سے تمام فیلٹوں اور الماریوں کا جائزہ لینے لگی۔ بلاشبہ کتابوں کی یہ لکچن اس کے بابا جان یا ماما کے ذوق کی عکاسی کر رہی تھی، کہیں کلاسیک انٹلکٹل لٹریچر کا خزانہ تھا تو کہیں جدید اردو شاعری کا ذخیرہ، سیاست، تاریخ اور مذہب پہ بھی لٹریچر موجود تھا۔ ایک بند الماری کے آگے وہ رک کے کھڑی ہو گئی۔ شیشے میں

”خیریت تو ہے، بہت دیر لگا دی۔“ شادو حسب توقع اس کے انتظار میں دروازے پہنچی۔

”ایک گھنٹہ بھی نہیں لگا۔“ اس نے شال ایک طرف بھیٹکی۔ وہ جس طرح غصہ خیزی ہوئی تھی، اب اتنی ہی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

”کچھ ملا؟“ اس نے پانی کا گلاس اُسے تنہا یا جسے مشکور نظروں سے تھمتے ہوئے وہ اثبات میں سر ملائی۔

”یہ ڈائری؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری لہراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگایا۔ شادو نے کچھ اور کہنا فی الحال مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی اسے نوٹس مکمل کرنا تھا۔

حلاف میں وہ یک کر کا پتلی انگلیوں، دھڑ دھڑ کرتے دل اور پیاسی آنکھوں کے ساتھ اس نے ڈائری کھولی۔

۱۲ مئی ۱۹۸۰ء

تھکاوٹ سے جسم ٹوٹ رہا ہے اور یہ تھکاوٹ پورا ایک مہینہ گھرنے کی ہے۔ پیر کے چکر چکر تک کے بیٹھے ہی نہیں دیتے۔ ایک مدت ہوئی گھر میں اتنا وقت گزارے ہوئے لیکن زرا سنگہ باجی کی شادی، اتنے ڈھیر دل کام۔ اتنی ذمہ داریاں..... بڑے لالہ کا پہلا پہلا ایجنٹ تھا تو دراب کا لاسٹ سمسروں کی تمام تر توجہ اسی جانب پا کے اچا جان نے مجھ پہ نظر لگائیں تو میں نے بھی اپنی سلائی فطرت کو کچھ روز کے لیے تھک کے سلا دیا اور اپنی اگلی بی بی کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بے جی، میری اپنی ماں بھی انہیں سلی بیٹیوں جیسا پیار ہی کرتی تھیں حالانکہ بی بی جان سے ان کی کم ہی جتنی تھی۔ افراسیاب لالہ کے بعد ان کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں تو کم از کم زیادہ جی نہیں اور جب بی بی جان کے پہلو میں بی بی ہوئی تو بے جی نے کتنی خواہش کی تھی کہ اب ان کے ہاں بھی ایک ایک بی بی ہو۔ زرا سنگہ جیسی پیاری پیاری ہی، لیکن میں آ گیا ان کا دوسرا بیٹا۔ پھر وہ جتنا عرصہ زندہ رہیں بی بی کے ختم کی منتا ابھی پلانی رہیں، اسی لیے زرا سنگہ باجی سے میرا تعلق اور گہرا ہو جاتا ہے ان میں مجھے بے جی کی خواہش کا عکس ٹھہلانا نظر آتا ہے۔ کتنے پریشان رہتے تھے سب ان کے لیے، وہ خاندان جس میں سولہ سترہ سالہ لڑکی کا بہن بیا ہے رکھنا ہی ممنوعہ وہاں میری بہن تینواں سال شروع ہونے تک بھی..... خیر..... شکر ہے

سے نظر آتی سیاہ مجلس جلد والی وہ موٹی موٹی کتابیں، جن پہ کوئی نام نہیں لکھا تھا، الہمر بھی ہو سکتی تھیں اور ڈائریاں بھی۔ اس نے بے تابی سے تمام چارپایاں ایک ایک کر کے اس میں گھمائیں کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ جھنجھلاہٹ سے اس نے ہنڈل کوئی جھکے دینے پھر مزید وقت ضائع نہ کرتے ہوئے دوبارہ اسٹوڈیو آ گئی۔

ایک کے بعد ایک الہمر کھولتے ہوئے وہ حیران ہوتی گئی۔ سمنزر لینڈ، فرانس، اسکاٹ لینڈ سے لے کر ابراہام مصر، خانہ کعبہ تک کے مناظر عکس بند کیے گئے تھے۔ تاج محل سے لے کر نیا گرا فال کی رفتار تک کیمرے کی زد میں تھی۔ وہ دس بارہ الہمر کھٹال بیٹھی۔

لیکن اس سے سوائے اس راز کے اور کچھ ثابت نہ ہوا کہ اس کے بابا جان نہ صرف ایک حساس مصور ہیں، ایک اہم فوٹو گرافر ہیں، بلکہ ایک سیلائی سیاح بھی رہے ہیں۔ اس نے وقت کی کمی کے پیش نظر باقی الہمر دیکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بی بی جان کے تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی اس لیے تمام الہمر ترتیب سے گھمیں۔ ایک کونے

میں ایک میلا کچلا سا تولیہ کسی کھوشی پہ لگا تھا۔ تولیے کا ایک کونا چند الہمر کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ جس سے بے قرار ہو کے وہ جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس طرف بڑھی۔ شاید کسی

نے ارادہ ان الہمر کو ڈھک کر رکھا ہو، اس نے تولیہ کھینچا اور ان الہمر کا جائزہ لیا، ایک تو پھولوں کی کسی نمائش کی تھی اور دوسرے کے نوکمر کرنے والے کوہ پیاؤں کے کسی گروپ کی۔

اس نے سخت مایوسی کا شکار ہوتے ہوئے ڈھول میں اُٹے اس آئٹم سے ہوئے بدرنگ تولیے کو دوبارہ کھوشی سے لٹکانا چاہا تو وہاں جھلوتی ایک سنہری چابی پہ اس کی نظر جم گئی۔ ایک ذخیرہ کے ساتھ دوسرے کو نے پہنہ دل کوئی چیز جھول رہی تھی، اس نے چابی اُتاری اور میکا کی انداز میں اسٹڈی میں گھس گئی، منتقل الماری میں وہ سونے کی چابی گھمائی، ہی کلک کی آواز آئی اور مقدس کارل جیسے اچھل کر قتل میں آ گیا۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ بابا جان کو مقصوری، سیاحت اور فوٹو گرافی کے ساتھ ساتھ ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ایک ترتیب کے ساتھ سال بہ سال لکھی سیاہ کور والی ڈائریاں اپنے اندر اس کے ہر صفت باپ کے کتنے راز چھپائے پڑی تھیں۔ چوترا، پچھتر، چھیتر سے ہوتے اس کے ہاتھ انہیں سوائی کی ڈائری پہ رک گئے۔ یہ اس کی پیدائش سے ایک سال پہلے کا سن تھا اور یہی یہاں موجود آخری ڈائری تھی۔ اس نے شال کے اندر اس کے متاع عزیز کی طرح چھپایا اور جس خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔

رب العزت کا جس نے آفریدی خاندان کی نظر اس پنہر ادبی اس خاندان سے ہمارے اور بھی رشتے نکلتے ہیں اس حوالے سے یہ لوگ ہمارے لیے بھی قیمتی نہیں۔ اپنے ہی اپنوں کا بوجھ بٹا کر تے ہیں، یہ بات بلی بی جان اکثر کہا کرتی ہیں۔

رحیم گل آفریدی عمر میں زرساگد باجی سے چند برس چھوٹا ضرور ہے، لیکن آفریدی اور خشک خاندان میں اتنا کچھ ہوتا چلا آیا ہے کہ اب کچھ بھی انہونی بات نہیں لگتی۔ اب باچا جان کو بھی سمجھتے۔ ان کے والد اور والدہ دونوں اپنے اپنے بھائیوں کی بیٹیاں لانا چاہتے تھے، باچا جان نے میری بے نیکی اپنی چچا زاد سے شادی کے ڈیزہ برس بعد ہی بلی بی جان یعنی اپنے ناموں زاد سے بھی نکاح کر لیا اور اس کے علاوہ..... اب کیا کیا کھسوں۔ رشتوں کی دُور میں اتنے بل ہیں کہ ایک کا ذکر چھیڑ تو دوسرا قصہ نکلتا چلا آئے اسی لیے تو میں سارے ماحول سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہر وقت خاندانی مسائل، جائیداد کی تقسیم کے تنازعے، وراثتی جھگڑے، ویدسہ، وغیرہ وغیرہ۔ میں تو بس منہ کا ذائقہ بدلنے سال میں دو تین بار ایک آدھ ہفتہ یہاں رہنے چلا آتا ہوں۔ اس بار بھی کچھ زیادہ دن لگ گئے۔ کل ہی شادی کے ہنگامے ختم ہوئے ہیں اور میں خت بوریت محسوس کر رہا ہوں۔ آج رات سوئے سے پہلے یہ فیصلہ کر کے رہوں گا کہ میرا اگلا پڑاؤ کون سا ہوگا۔

۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

کل رات جب میں اپنے متوقع سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے خت مایوسی ہوئی۔ مصر، لبنان اور شام سے لے کے چین، ملائیشیا، نیپال تک اور فرانس، امریکہ سے لے کر سوئٹزر لینڈ اور جاپان تک میں آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکا تھا اور ان ہی جگہوں پہ دوبارہ جانے کا میرا کوئی موڈ نہیں تھا۔ میری آنکھ کبیرے کی آنکھ ہے۔ ایک بار جو منظر دیکھ لوں ذہن کی سلیٹ پہ نقش ہو جاتا ہے اور میں ہو ہوا سے کیوں یہ آنکھ بند کر کے بھی اُتار سکتا ہوں اس لیے کہ باری دیکھی جگہیں میرے لیے کسی دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ اسی ذہنی کلکشن میں مجھے فیروز خان وردگ کی آفریاد آئی۔

پچھلی سردیوں میں جب باچا جان کے ساتھ ان کے دوست بسم اللہ جان کی شکار کی دعوت پہ سوات گیا تھا تو وہیں فیروز سے ملاقات ہوئی تھی۔ بسم اللہ جان والی سوات کے خاندان سے ہیں، سوات کے آخری ولی عہد کیشن میاں گل اور گل زیب خان ان کے والد کے قریبی عزیز تھے، اسی حوالے سے پورے سرحد اور خصوصاً آزاد قبائل کے چیدہ

چیدہ خاندانوں کے خان مدعو تھے ان میں یوسف زئی بھی تھے، شنواری اور خشک بھی اور وردگ بھی، بعض ٹیپیکل خان حضرات تھے بعض اپنے خول سے باہر آنے کی کوشش میں مصروف ان ہی میں فیروز خان وردگ مجھے چونکا گیا۔

غضب کا ذہن پایا ہے اس شخص نے، تعلیم اگرچہ اس کی رکھی ہے لیکن اس کی ذہنی اپروچ اور پختون تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات قابل رشک ہیں، بہت کم وقت میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی میری اس سے۔

میرے سباحث کے شوق کے بارے میں جان کے اس نے مجھے آفر کی تھی کافرستان وادی کیلاش کے دورے کی، اس کی زبانی وہاں کے واقعات سُن سن کر میں تو تب ہی ارادہ کر چکا تھا جانے کا لیکن فیروز نے منع کر دیا کہ سردیوں میں برف باری وہاں تک کے تمام رستے مسدود کر دیتی ہے، ان علاقوں میں جانے کا آئیڈیل وقت مئی سے ستمبر تک کا ہے۔ اس سے کیا وعدہ یاد آنے پر میں نے فوراً ہی وہاں جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ کل ہی صبح فجر کے بعد میں پشاور سے سوات کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ انشاء اللہ ۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

اس وقت میں فیروز خان کی سفید اینٹوں سے بنی حویلی کے مردان خانے کے متشل جالی کے پاس بڑے سے گیس لیمپ کے نیچے بیٹھایا ڈائری لکھ رہا ہوں۔ رات گئے تک فیروز کے دوستوں کی محفل جی رہی میری آمد کی خوشی میں اور اب وہ مجھے گھنڈہ دو گھنڈہ آرام کی تاکید کرتے ہوئے گیا ہے، تاکہ صبح کا آجالا پھیلے ہی سفر پہ نکل جائے، لیکن میں بھلا ڈائری لکھتے بغیر سو سکتا ہوں۔

یوں تو میں سات آٹھ بجے کے درمیان ہی سوات پہنچ گیا تھا لیکن فیروز کے گھر شام کو آیا۔ اس کی رہائش سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں ہے وہاں تک پہنچنے کے اس کی حویلی جاتے ہوئے عجیب سی جھجک نے مجھے اس عہد اور مہمانی عرصے میں، میں نے اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا اور اب اچانک اسے میرا بھان کا شرف بخشنے پہنچ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے کسی ہول کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سیزن ہونے کی وجہ سے سربتا، مرغزار اور پلنی ڈی سی جیسے پائے کے تمام ہول یک تھے۔ میں نے نہتا درمیانے درجے کے ”رستم“ میں کمرہ بک کروایا اور وہاں پہنچ کے فیروز سے رابطہ کیا لیکن وہ گرم جوش پیمانہ زادہ میری آواز سننے ہی دیوانہ ہو گیا۔

اور چند منٹ کے اندر اندر مجھے لینے آ گیا۔

سوات کے پُر رونق بازار گھماتا ہوا وہ مجھے اپنی حویلی لے کے آیا۔ پُر کھلف پکوانوں، خوشبودار قبوؤں کے درمیان گپ شپ لگاتے کب رات بھی گیت پیدہ ہی نہیں چلا، اب مجھے تھکا دہا سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کچھ دیر کمر سیدھی کر رہی لی جائے۔

۱۵ مئی ۱۹۸۰ء

اور اس وقت میں گویا جنت کے ایک قطفے پہ بیٹھا خود کو یہ یقین دلا رہا ہوں کہ میں واقعی اس منظر کا ایک حصہ ہوں۔ مجھے حیرانی ہے کہ پشاور میں رہنے کے باوجود میں اپنے اس قدر قریب واقع ان حسین وادیوں سے اب تک انجان کیسے رہا، دنیا بھر سے لوگ نہجانے کتنا کتنا لہا سفر طے کر کے یہ جنت نظیر مقام دیکھنے آتے ہیں، فیروز نے بتایا۔

”سوچیان، فاہان، ساگ یون، ہیون ساگ اور اویان پاکے سفر نامے کی تلاش کے چپے چپے کے قصبہ دیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ بدھ مت کا متبرک مقام بھی ہے۔ دُنیا بھر سے بدھ مت کے ماننے والے یہاں اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں۔ سوات کا ایک سابق بادشاہ ”ابھی تابا“ بدھ مت کا مذہبی رہنما بھی تھا اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ بھی نہ بھی ضرور واپس لوٹے گا وہ بدھ کا اورتا تاریخ ۲۶ ہوگی۔“

اس کے علاوہ بھی اس نے ان اطالوی، فرانسیسی اور برطانوی سیاحوں کے اقتباسات سنائے جو سوات اور کالاش سے مسحور ہو کر رہ گئے تھے۔ حقیقتاً بھی میں اس وقت ڈنگ رہ گیا تھا، جب سید و شرف نے تقریباً ہوکلومیٹر کے فاصلے پہ واقع مشہور چوٹی ”فلک سیر“ میری نگاہوں کے سامنے آئی۔ میرا تو دل ہی نہ چاہتا تھا اتنی جلدی وہاں سے کوچ کرنے کو لیکن سفر طویل بھی تھا اور پینچ دو شوار گزار بھی۔

”تم کہاں کہاں رکو گے۔ یہاں سے ایوان تک کا راستہ یوں پیچلوں سے لدا اور گھساروں، آبشاروں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن اب ہمیں ایوان تک بغیر کسی سفر کرنا ہے۔“ فیروز نے تنبیہ کی۔

”ایوان؟“ میں اپنی اعلیٰ پہ خاصا شرمندہ تھا۔

”ہاں جڑال سے آگے یہ سبز بگاڑوں کا فرستان کا دروازہ کہلاتا ہے۔ یہاں سے ہی کیلاش کی وادیوں کو راستے نکلتے ہیں۔“

”کیا یہ کوئی ایک وادی نہیں ہے۔“

”نہیں وادی کیلاش، بمبوریٹ، بریر اور بمبورتا میں تین حصوں پہ مشتمل ہے۔ تینوں کا قدیم مذہب آتش پرستی اور ناگ پرستی ہے۔ لیکن یہ لوگ تین قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں بظاہر ان کا بودو باش ایک سا ہے۔ لیکن بمبوریٹ نسبتاً ترقی یافتہ کہلایا جاسکتا ہے۔ ایوان پینچ کر فیروز نے جب اپنے ایک جاننے والے مقامی شخص کے حوالے کی۔ ”ان راستوں پہ ڈرائیونگ صرف یہاں کے ماہر ڈرائیور ہی کر سکتے ہیں۔“

”تو اب ڈرائیور کہاں سے لیا جائے۔“ اندھیرا چھلنے کی وجہ سے میں فکر مند تھا۔ ”چلو اڈے چلتے ہیں، وہاں دن میں ایک دو بار وین آتی ہے اور مسافر بھر کے“ دو باش“ لے جاتی ہے۔“ اڈے پہ کئی سیاح گروپ بنائے کھڑے تھے، کچھ ہی دیر میں ایک بس آئی اور سب لوگ کرایہ ملا کے ڈرائیور کو دینے کے بعد اپنے اپنے سامان سمیت اس پہ سوار ہو گئے۔ فیروز کا کہنا درست تھا وہی اس پہ خطر پہاڑی راستے پہ ڈرائیونگ کرنا اناڑی شخص کے لیے رکھی تھا۔ دو باش کے مقام پہ فیروز کا ایک مقامی دوست ژان خان جیپ لیے کھڑا تھا۔ مجھے سی سا وجود، سرخ، سفید رنگت، بادامی شلوار سوٹ پہ براؤن جیکٹ سپرول سے بھری ہوئی قلبی والی روایتی ٹوپی کے ساتھ وہ خوش مزاج شخص، حد سے زیادہ مہمان نواز لگ رہا تھا۔ راستے میں میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

”یارا فیروز خان، یہ بندہ ژان خان خاں کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ژان بھی اور خان بھی۔ ژان تو بدھ مت نام سے پوچھ رہے ہیں؟“ وہ زور سے ہنس پڑا۔

”آگے آگے دیکھو، ہوتا ہے کیا۔ یہاں ایسے ایسے نام سننے کو ملیں گے کہ بس۔ یہ لوگ پکارنے کے لیے کوئی بھی نام رکھ لیتے ہیں۔ مذہب کھنگالنے کی فکر، مذہب وقوم کا خیال۔ یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں کے نام پہ بھی یہ اپنے بچوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔ ویسے ژان خان شیعہ مسلم ہے۔ یہ کیلاش کے قصبے کا رہنے والا ہے، بمبوریٹ کی کافر آبادی سے نہیں میں نے کہا ناں یہاں وہ تہذیبوں کا میل ہے۔“

قصباتی لوگ اکثر تو مسلمان ہی ہیں، سیکھ اور اکاڈکا ہندو بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ان کی زبائیں بشو کے علاوہ گوجری، کوہستانی اور کشمیری بھی ہیں۔ یہ قدرے تعلیم یافتہ اور تہذیب پسند ہیں، لیکن کلام حقیقی معنی میں کافرستان ہے۔ صدیوں سے چلی آ رہی اپنی تہذیب و تمدن اور مذہب میں یہ رتی بھر تیزی کرنے پہ تیار نہیں۔ یہ اپنا مخصوص لباس پہنتے ہیں، اشوبی اور گاروی زبان بولتے ہیں اور اپنی قوم میں کسی انقلاب اور جدت کے سخت خلاف ہیں۔ ہاں

ناموں کے سلسلے میں یہ اصول کچھ کمزور ہیں۔ یہاں کوئی ڈیوڈ ہے، کوئی رامل لعل، کوئی پھول خان ہے تو کوئی گوبھی خان، کوئی سکندر ہے تو کوئی بندر۔

”ڈونٹ نیل کی بار“ میں بیٹنے لگا۔

”ابھی دیکھنا ذرا تم“ اس نے گیٹ پہ بیٹھے چوکیدار کو پشتوں میں مخاطب کیا۔

”جگے ایران چا چا؟“ (کیسے ہوا ایران چا چا؟)

”مختصر راسطے“ مختصر راسطے۔“ (خوش آمدید، خوش آمدید) وہ اس کے ہاتھ چومنا

ہوا مزاج نہی کرنے لگا۔

”یہ کمانڈر خان ہے اور یہ اس کا بھائی جرنیل خان۔“ اس نے آٹھ سال کی عمر کے دو بڑواں لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ژان کے بھائی پان خان کے بیٹے ہیں اور یہ ہے جمرے کا نانی، غضب کا فنکار ہاتھ ہے اس کا، انجیر نام ہے اور یہ مسٹر جناح بڑے کمال کے ڈرائیور ہیں، یہی ہمارے گائیڈ کا کام بھی کریں گے۔“

اس نے فرود اُردان سب دلچسپ ناموں والی سیٹوں کا تعارف کر لیا اور پھر ہم حجرے

میں چلے آئے۔

رات کے سائے پھیل رہے تھے، لیکن تاریکی اس حسن کو میری نظر سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتی جو جگ کے پہلے اجالے کے ساتھ میرے حواسوں پہ چھانے والا ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۸۰ء

واوی کی لکاش میں آج صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہونے والا میں پہلا شخص تھا یا شاید میں تو سورج کے طلوع ہونے سے بھی پہلے ہی حجرے کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ نیکیوں تاریکی میں بے چستے تک میں حجرے کے احاطے میں موجود چھائیں گھاس پہ ہی ٹپک کر وہاں کی فرحت افزا اور خوشبوؤں بھری فضا کی تازگی اپنے اندر اُمتارتا رہا۔

فیروز کے سونے کے انداز سے تو ظاہر ہوتا تھا وہ اور دو تین گھنٹے تک جانے کے موذ میں نہیں۔ میں اسے جگاتے جگاتے رہ گیا، یہی کم تھا کہ وہ دوستی اور میزبانی کے تقاضے نبھاتے ہوئے میرے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔ اپنے کاروبار اور بیوی بچے کو چھوڑ کر، مجھ جیسے ہر ذمہ داری سے آزاد، بے فکر سے سیاح کا ساتھ دینے کے لیے اس صبح صبح اس کی نیند خراب کرنے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔ ایران چا چا بھی شاید رات بھر کی چوکیداری کے بعد اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ دُور دُور تک کوئی ڈی زون نظر نہیں آ رہا تھا۔

مرغ کی لڑک دار بانگیں پرسکون فضا کا سینہ چیرے دے رہی تھیں۔ مرغ کی آواز کے ساتھ ہی مجھے سید و شریف میں گزار دی رات یاد آگئی۔ جب فیروز خود بھی حلق تک بھی مرغی ٹھونس رہا تھا اور مجھے بھی نے تماشا کھانے پہ مجبور کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے نوکا کہ ”کیا آج سے پہلے کبھی مرغی نہیں دیکھی، یا آج کے بعد دیکھنے کو نہیں ملے گی کیا، جو دیگر پکان چھوڑ کر بے چاری مرغی کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔“ تو اس نے ایک دلچسپ انکشاف کیا تھا۔

”کیلاش میں باورچی، نانی اور چوکیدار وہاں کی مقامی آبادی کے ہوتے ہیں اور کافرستان کے مذہب میں مرغ حرام ہے۔ اس لیے کسی کیلاش باورچی کے ہاتھ میں مرغ پکانے کے لیے دینا گویا اس کی مذہبی عقیدت پہ وار کرنا ہے اس لیے خوب چھٹی مرغی کھانی ہے آج ہی کھالو بچا نے اور کتنے ہفتے ڈبے اور ٹپکس کھانی پڑیں۔“

اس کا ندیدے پن سے مرغی پہ مرغی اُڑانا یاد کر کے میرے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی۔ دُور کہیں سے فجر کی اذان سنائی دینے پر میں لکڑی کا پھانک کھول کے سرنگی چھروں والی گلی میں آ نکلا۔

سامنے ڈھلان کی جانب سے ایک سیاہ پوش وجود بغل میں گھڑو نیچے دبائے قدم بہ قدم ابھر رہا تھا۔ ٹی وی یا میگزین میں کلام کے اس روایتی لباس اور زور کے ساتھ کئی بار وہاں کی دو شواؤں کو دیکھ کھا تھا لیکن..... پہلی بار ایک کالا شادو شیزہ کو آتے دیکھ کے میرے قدم خود بخود رک گئے۔ وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتی میرے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ ٹپکے سے اُجالے اور ہلکی ہلکی دھند میں اس کے نقوش واضح نہ تھے۔ لیکن تدریساً مکمل خود اعتمادی کے ساتھ میرے سامنے تھا۔ اس کے لبوں سے چند ناقابل فہم الفاظ والا ایک جملہ نکلا شاید اس نے اپنی مقامی زبان میں گھڑو نیچے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ میں انھوں کی طرح دیکھنے لگا۔ لڑکی بھجوا رہی تھی، میرے کچھ کچھ بغیر ہی کچھ گئی اور اب کے پشتوں میں مخاطب ہوئی۔

”بکری کا تازہ دودھ ہے صیب، کتنا لوگے؟“ اپنی مادری زبان میں اسے بولتے دیکھ کے مجھے عجیب سے احساسات نے آن گھیرا۔ پوری دنیا کو مجھ کا تھا میں مختلف ممالک میں بھانت بھانت کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا مجھے، ہندو، مسلمان، عیسائی یا رنگین مزاج کہا تو کس طور جائز نہ ہوگا۔ ہر حال صحت نازک سے قطعی پرہیز مجھے بھی نہیں رہا۔ اٹلی کی سلویا اور قاہرہ کی نجواس میری اچھی خاصی دوست رہی، لیکن کیا کیا جائے رگوں میں اُٹلے اس خون کی تاثیر کا۔

میرے اندر کا بختون زادہ اپنی فضاؤں میں آ کے پورے کرو فر سے سر اٹھالیتا تھا۔ اپنی برادری اور خطی کو خاتین کو سانسے پاکے میں بھیجی تھی بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے خاندان میں فرست کزنز سے بھی عمر کے ایک حصے میں آ کے پروہ کر لیا جاتا ہے۔ جو بلی کے زمانہ اور مردانہ حصوں کے ملازمین تک کے سلسلے میں احتیاط کی جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے زمانہ خانے میں مرد ملازم کا جانا حامل ہے، اسی طرح بی بی جان مردانہ خانے اور حجرے میں گھریلو ملازماؤں کا جانا بھی پسند نہیں کرتیں اور اب سحر کی اس اولین ساعت میں، ڈور دور تک پھیلے سناٹے اور تہرائی میں ایک لڑکی کو خود سے ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلے پر اپنی بادی زری زبان میں خود سے مخاطب پاکے میں ایک لمحے کے لیے بھول ہی گیا کہ وہ ایک غیر قوم، غیر مذہب لڑکی ہے قصہ ڈرا سا ایک جانب ہو کے میں نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اندر جا کے گھر کی خواتین سے پوچھ لو۔“ اس نے گھڑ بچی سنبھالتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھایا اور ایک ٹوٹتی ہوئی مگر سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی۔ غضب کا اعتماد تھا اس کی بے پرواہ چال میں۔ میں آگے بڑھی کی طرف بڑھ گیا۔ دو گلیاں پرے ایک مٹی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی اور ٹہلتا ہوا واپس آ گیا۔

ناشتا ڈان خان کے گھر کے اندرونی حصے میں ہوا۔ میں گھریلو خواتین کی موجودگی میں کچھ ان ایڑی ٹیل کرتا رہا، لیکن شاید ڈان کی ماں، بہنیں وغیرہ سب فیروز سے خاصی بے تکلف تھیں۔ وہ پشتو نہیں جانتی تھیں اور میں ان کی زبان سے ناہلہ، البتہ فیروز ٹوٹے پھوٹے الفاظ، کچھ ہاتھ کے اشاروں کے ذریعے اور کچھ ڈان کے سمجھو سمجھاؤ مکالمہ جرنیل کی مدد سے مسلسل شامل گفتگو رہا۔ ناشتے کے دوران کیلاش ملازمائیں اندر آتی جاتی رہیں کوئی دسترخوان بچھانے، کوئی گرم روٹی پیش کرنے۔ ایک وہ بیٹی پھل کاٹ رہی تھی۔ اور دو چار نوعمر لڑکیاں کونے میں لگیں کھسک پھسک کر رہی تھیں اور فیروز کے غفروں پہ کھلکھلائی رہی تھیں۔ اس نے میرا کریم بھاپ کے مجھے گفتگو میں شریک کرنا چاہا۔

”یارا زریاب تو ان کے نام نہیں پوچھے گا۔ ذرا دیکھ تو سہی حسن و شباب کے ان شاہکاروں پہ لبیل کیا کیا لگے ہوئے ہیں۔“ میں نے مسکرا کر اٹھنا چاہا، مجھے خاتین کو یوں تحقیر مجھے نے انداز میں موضوع گفتگو بنانا پسند تھا پھر چاہے وہ کوئی آن بڑھ گھریلو ملازمہ یا کافر پہاڑی ہی کیوں نہ ہو، لیکن شاید وہ لوگ بھی ان دو شیرازوں کے ساتھ چمپیز جھاڑ کے عادی

تھے اور وہ بھی ان صاحب لوگوں کے ساتھ خاصی گھلی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”یہ دیکھو سب سے پہلے تمہارا تعارف ”غٹ فٹلے“ سے کراتا ہوں۔“ اس نام پہ میں نے بے ساختہ سر اٹھا کے سامنے دیکھا اور اس مسکراتی ہوئی اچھڑی لڑکی کو دیکھ کے بمشکل اپنی ہلکی حسیہ کر سکا۔ جس نے بھی یہ نام رکھا تھا بڑا ہی ”برجستہ“ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ کچی کچی اگر نمایاں تھی تو وہ عانی رنگ کے خاصے بڑے بڑے ہونٹ تھے جو پیلے دانتوں کو خاصی حد تک ڈھانپے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بلاشبہ بے حد شفاف اور معصوم سی تھیں لیکن لمبے لمبے پیلے دانتوں اور مونہ لٹکے ہوئے ہونٹوں کا کبھی نشن اس کی آنکھوں کا حسن غارت کر رہا تھا۔ ”غٹ“ پشتو میں بڑا کاور ”فٹلے“ ہونٹ کو کہا جاتا ہے یقیناً کسی پشتو دان نے اسے یہ نام دیا ہوگا اور اس کے مان پاپ نے بغیر مطلب جانے اسے تینے کی طرح اس بے چاری پہ بجا دیا۔

”اور یہ ہیں مس لندن“ اس نے بارہ تیرہ برس کی دہلی پتلی سی شرمیلی بچی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور ایک مس پیرس بھی ہوتی ہیں وہ آج اتفاقاً غیر حاضر ہیں۔ یہ نام یہاں آنے والے غیر ملکی ساحلوں سے متاثر ہو کر رکھے گئے ہوں گے۔ بے تکلف ہونے میں تو یہ قوم کمال رکھتی ہے۔ بنا زبان سمجھے جانے یہ ہر ملک سے آنے والے لوگوں سے گھل مل جاتے ہیں۔ انہیں اپنی تقریبات میں مدعو کرتے ہیں اور بدلے میں اور کچھ نہیں تو ان کے دیئے نام تول ہی جاتے ہیں اور یہ..... یہ دیکھو۔“

اس نے موٹی موٹی غلافی آنکھوں، بھرے بھرے گالوں اور سونے کی سی رنگت والی ایک دو سالہ بچی کی انگلی تمام کے آگے کیا۔

”کیا اسے دیکھ کے قدرت کی فیاضی پہ ایمان لانے کو بی نہیں چاہتا؟ لیکن جانتے ہو اس کا نام کیا ہے؟ عربی“ میں نے نظر بھر کے اس بچی کو دیکھا۔ کون سا رنگ تھا فطرت کا جو خدا نے اس کے چہرے پہ سچا نہیں دیا تھا۔ سبز آنکھیں، گلابی ڈورے، سرخ گال، مرمریں ہونٹ، بھورے بال، سنہری جلد اور نام غریبی میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں نے جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کے بچی کے منہ سے سنے ہاتھ میں تھمایا اور کہا۔

”اس کا نام ”انمول“ ہے۔ اس کی ماں سے کہہ دینا۔“ اور اٹھ کے باہر نکل آیا۔ نویں کے پاس ”کچے“ میں ایک اور سیاہ پوش لڑکی بیٹل کی گھڑ بچی کھنگال رہی تھی مجھے یوں ہی شبہ سا ہوا کہ یہ وہی صبح والی لڑکی ہے۔ ذرا قریب جا کے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اگرچہ صبح کے

دھندلکے میں اس کے نقوش نہیں دیکھ پایا تھا لیکن مدھم مدھم سروں میں مگھاتی اس کی آواز میں فوراً پہچان گیا۔ میرا ارادہ اٹھنے سے گزر کر سامنے ایران چاچا کے پاس جا کے گپ شپ لگانے کا تھا کہ وہ واحد ملازم تھے جو پشتو بول سکتے تھے، لیکن نجانے کیوں میرے قدم اس کے قریب آ کے رک گئے۔

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“ اچانک میں نے اپنی آواز سنی۔ اس نے ذرا سا سر اٹھانے پر گھڑو بچھے پہ ڈالی۔ گھڑو بچھے سے پانی بھارنا، گیلے ہاتھ اپنے گھیر دار کرتے سے پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مومن علی“ پُر اعتماد لہجے میں جواب دیتی ہوئی وہ آگے کو قدم بڑھا گئی اور میں جو کسی عجیب و غریب نام کا منتظر تھا۔ مومن علی سُن کے ڈگ رہ گیا اور جہاں کا تھاں کھڑا اس نام پر غور کرتا رہا۔

”کیا ہوا؟ کہاں گم ہو؟“ فیروز میرے نزدیک چلا آیا۔
”کچھ نہیں، یار مذاق سے قطع نظر یہ لوگ واقعی نام رکھنے کے سلسلے میں بہت لاپرواہ لگتے ہیں۔“ میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

”مومن علی“
مقدس کی نظریں پھر سے دو سطریں اوپر پھسل کر ”مومن علی“ پھٹھ گئیں۔ اس نے زیر لب یہ نام دہرایا۔

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر“
جھڑکی اذان کی آواز ماحول کے ہر احساس پہ حاوی ہو گئی۔

اسے شروع ہی سے صبح صادق کے ٹپکے آجائے میں اذان سننا بے حد اچھا لگتا تھا۔ بابا جان کو بھی تو وہ..... مومن علی جھڑکی اذان کے سے..... اور اب مجھے بھی، اس وقت اس کی ذہنی رد بینک کر پھر وہیں چلی گئی تو سر جھٹک کے وضو کرنے کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کر کے اس نے دُعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ آج سے پہلے اس نے خود کو کسی اتنا جتنی دست نہ محسوس کیا تھا، یہاں تک کہ دُعا مانگنے کے لیے اس کے منکھوں میں الفاظ کے سکتے بھی نہ تھے۔ وہ کیا مانگتی۔

ماں باپ کی سلامتی اور ان کی لمبی عمر کی دُعا۔

یا۔

پھر ان کی مغفرت کے لیے۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ لرز گئی۔ ”یا اللہ میں نہیں جانتی میرے ماں باپ کہاں ہیں اور کیوں ہیں، وہ کیا وجہ ہے جس نے انہیں مجھ سے غافل ہو کر اپنی اپنی زندگی الگ الگ گزارنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ مجھے ان سے لاطم رکھنے میں تیری کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ لیکن یا مسبب الاسباب مجھے ایک بار صرف ایک بار ان سے ملوادے۔ میں ایک بار..... زندگی میں صرف ایک بار ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہتی ہوں، ایک بار ماں کی آغوش کی گرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں، ایک بار اپنے سر پہ باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔“

میں جانتا چاہتی ہوں وہ ہنڈنک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پرسکون ہوگی جو ماں کی پھیلی ہوئی ہانہوں کی پناہ میں ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں کپکپاتے لیوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ یا اللہ تو سب جانتا ہے..... کیا میرے ماتھے کے نصیب میں وہ بوسہ ہے؟ یا اللہ رحیم و کریم پروردگار بس ایک بوسہ ذرا سی گرمی تھوڑی سی چھاؤں میرے نصیب میں بھی۔“

رات بھر کی جاگی آنکھیں خدا کے حضور گریہ زاری کے بعد اتنی متورم ہو گئیں کہ اسے انہیں حزیہ چند سیکندہ کھولنے رکھنا بھی دشوار ہو گیا۔ دل میں برسوں سے دلی خواہشوں کو جب دعا کے ذریعے رستہ ملا تو زور تک شانت ہو گئی۔ اس نے مُندی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش نہ کی اور جانے نماز کا ہی ایک کوناموڑ کے اس پہ بے سدھ ہو گئی۔

”ہیلو..... ہیلو زون ویک اپ.....“

شادر نجانے کب سے اسے آواز دیں رہی تھی۔ اس نے پلکیں کھولنے کی کوشش کی۔ سُوئی سُوئی آنکھوں سے گھٹھوں کے بل کا رپٹ پہ بیٹھی شادر کو خود پہ تشویش سے جھٹکے پایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے نیم غنودگی کے عالم میں جھٹکے یا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”اُٹھیے محترمہ، گیارہ بج رہے ہیں..... بہت سولیا۔ اس طرح راتیں جاگ جاگ کے اور دہر چڑھتے تک سونے کی عادتیں کچلی کر لیں تو بڑی پراہم ہو جائے گی۔ واپس تو ہاسٹل میں جاتا ہے ناں، اب چھٹیاں ہی کتنی باقی رہ گئی ہیں۔“

اس کے اتنا کہنے پر مقدس کو یہ یاد آ کر وہ باہل کے کمرے میں نہیں بلکہ بیٹار میں بس
 موجود ہے۔ اس نے بازوؤں پر رکھا سر اٹھا کے اُٹھنے کی کوشش کی تو کراہ نکلی گئی۔ کئی گھنٹے ایک
 ہی پوزیشن میں سونے کی وجہ سے گردن اور شانے کے پچھلے حصے گھٹے گئے تھے اور کلاہنیوں تک
 ہاتھسں ہو چکے تھے۔ نماز کی چادر اسی طرح سر کے گرد لپیٹی تھی اور یہ کبل یہ یقینی شانوں نے
 ہی اُڑھایا ہوگا۔ وہ مسکرائی۔

کیے ہیں اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں خوب صورتی اور وہ بھی فطری خوب صورتی بہت اڑیکٹ کرتی ہے۔ لازمی بات ہے کہ اس کا اظہار ان کی تحریر میں بھی ہوتا ہوگا۔ جس خوب صورتی کو وہ مطلقہ کے ذریعے ناپ بھار سکتے ہوں گے اسے قلم کے ذریعے خراج تحسین پیش کرتے ہوں گے، لیکن تم یہ باتیں کیا جانو..... ایک آرٹسٹ کی فیکٹو دوسرا آرٹسٹ ہی جان سکتا ہے۔“ اس نے شکاری دکھائی۔

درباب کی کم از کم یہ بات تو مان لینا چاہیے کہ وہ زریاب کے آنے تک اپنا فیصلہ ملتوی کر دیں۔
اب تو وہ آنے ہی والے ہوں گے، غلطی کے بابا کا تو یہی کہتا ہے۔“ چچی جان کے کمرے
سے آتی تائی جان کی دینگ مگر جھٹھلائی آواز نے اسے پھرے رک جانے پہ مجبور کیا۔
”اللہ کرے، ایسا ہی ہو..... زریاب بچہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر لوٹے
اور..... اور..... سب ٹھیک ہو جائے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو ہی جائے گا..... سب ٹھیک
جائے گا۔“ لی بی جان کی حشکر آواز سنائی دی۔

اللہ کرے.....“ تائی جان نے تائید بھرا ہکا رالیا پھر دے لفظوں میں کہنے لگیں۔
”وہیے میں نے سنا ہے مردوں سے کہ زریاب کو یہاں آنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے،
وہ سو سال بعد بھی آئے تو فیروز خان کے لوگ اسے زندہ تو چھوڑ دیں گے نہیں۔“

”اللہ نہ کرے..... خیر کی بات کر گھل لی بی..... خیر ماگو خدا سے۔“ لی بی جان نے دہلی
کے انہیں گھر کا اور وہ جو خود کو ان سب مذاکرات سے بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کرتے
ہوئے آگے بڑھنے پہ آمادہ کر رہی تھی۔ فیروز خان کے نام پہ سر تا پاہل کے رہ گئی۔

فیروز خان..... فیروز خان وردگ..... یہ تو وہی بابا جان کے سوات والے دوست
ہیں جن کا تذکرہ ڈائری میں ہے۔ اس نے تمام حواس مجتمع کر کے دروازے کے پیچھے سے
آنے والی آوازیں کی طرف متوجہ کیے۔

”میں تو یونہی ایک بات.....“ تائی جان منمنائیں۔
”پھر کبھی گل بھائی آپ کو سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہیے۔“ چچی جان کے لہجہ میں
حشکی تھی۔

لی بی جان کی دہلی دہلی سسکیاں کرے میں گونج رہی تھیں۔
”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ یہاں بھی خطرہ ہی خطرہ ہے۔ یہ وردگ بھی ہماری طرح
دشمن دار لوگ ہیں۔ نسلوں تک بدلے کا زہر ان کے ذہن سے نہیں اترتا۔ اللہ میرے بچے کو
اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کیا اب میں اس کے یہاں آنے کی دُعا بھی نہ کروں؟“ لی بی
جان کا جھٹلا اور بیگ لہجہ اس کے لیے جی بیز تھا۔ وہ بھاری ہوتے وجود کو آگے تھمبٹ لے گئی۔
فیروز خان وردگ بابا جان کا عزیز تر دوست یا خون کا پیسا سا دشمن۔ اس سوال کے
جواب کی طلب نے اسے ایک بار پھر وہی ڈائری کھولنے پہ مجبور کر دیا۔

☆☆☆

۷ مئی ۱۹۸۰ء

مئی کا مہینہ یہاں کاسب سے خوش گوار مہینہ ہے اور اسی مہینے میں وہ جشن بہار اہل منایا
جاتا ہے جس کی اکثر جھٹھلائی لی وی پروگرامز میں دکھائی جاتی ہیں۔ آگ کا بڑا سالانہ جس
کے گرد خوشی سے دکتے چڑوں کا سادہ مگر منظم رقص۔ جب فیروز نے بتایا کہ ہم لوگ بھی کل
رات ہونے والے اس جشن میں مدعو ہیں تو میں بے حد نہ جوش ہو گیا۔ آج صبح ہی فیروز مجھ
سے اجازت لے کر ایک دن کے لیے آگے کی قصبے میں اپنے والد کے کسی دوست کی عیادت
کے لیے چلا گیا۔ مجھے اور تو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، لیکن میں نے اسے کل تک ہر حال میں
واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ میں جشن میں اس کے بغیر شرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس
کے حوالے سے اس کے مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔

آج کا سارا دن میں نے بمبوریٹ کے اُونچے نیچے راستوں پہ بھٹکتے ہوئے گزرا،
ایران چاچا پیر سے ہمراہ تھا۔ میں نے وہاں کا رواجی قبرستان بھی دیکھا۔ ایک کھلا سامیان
جس میں ٹوٹی ہوئی چار پائیاں، شکستہ استخوان اور پتہ نہ پتہ ہوئے تابوت ہیبت ناک ماحول
پیدا کر رہے تھے۔ ایران چاچا بتاتے لگا۔

”یوں تو ہمارے ہاں مردے کو تمام آخری رسومات ادا کرنے کے بعد چار پائی سمیت
یہاں ڈال دیتے ہیں، لیکن کچھ صاحب حیثیت لوگ اب تابوت بھی بناتے لگے ہیں، مردے
کے ساتھ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خوراک بھی رکھی جاتی ہے۔ فرشتے جب مردے کے
پاس آتے ہیں تو وہ ان کی تواضع کے لیے یہ خوراک پیش کرتا ہے۔“

جنگلی جانوروں، چیلوں اور گھد گھو کی نوچ کھسوت اور بربریت کی نشانیاں وہاں
صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے جھرجھری لی اور آگے چل پڑا۔
عورتوں کے ٹولے کے ٹولے روٹیوں کی چنگیریں اٹھانے، سر پہ پھل کے ٹوکے
رکھے، جنگلی کی طرف نکل رہے تھے۔

”چاچا تم تو کہہ رہے تھے جنگل کے اندر کا حصہ بہت خطرناک ہے، ہر طرح کا زہریلا
سانپ اور خنوار جانور اندر موجود ہے، پھر یہ عورتیں چمک مٹانے وہاں کیوں جا رہی ہیں۔“
میرے سوال پہ چاچا الجھا۔

”ہیں، کف؟ وہ کیا بکلا ہے؟..... بچہ یہ تو ملوش دیوتا کی خدمت میں کھانا پیش کرنے
جا رہی ہیں۔ کل ہمارے ہاں، ہر تہوار میں دیوتا کی دعوت کے لیے کھانا جنگل میں بھیج دیا

جاتا ہے۔“

”بڑے بیٹو دیتا ہیں تمہارے۔“ میں بڑبڑایا۔
”وہ دیکھو، تمہارا قبر۔“

میں ایک شفاف جمیل کے کنارے اُونچے سے پتھر پہ بیٹھا ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا جب چاچا کی پاٹ دار آواز پہ جھپٹے پتھر سے پھسلے پھسلے بجا۔ میں نے مڑ کے اسے دیکھا، شاید اس کے دیتا کی شان میں گستاخی کرنے کی یاداش میں میرا اُٹل کا منصوبہ تیار ہو گیا ہو، لیکن اس کے تاثرات نازل ہی تھے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں میں نے ذرا سا اچک دیکھا۔ کچھ فاصلے پر..... چناروں کے سائے میں ایک اکیلی قبر تھی۔ قبر پر بھی مگر اس کے گرد پتھر لگے گویا حد بندی کر دی گئی تھی، اُوپر چکنی مٹی کا لپ بھٹی تھا۔

”اوہ۔“ اب میں سمجھا۔ کسی مسلمان کی قبر تھی جسے وہ میری قبر بنا رہا تھا۔

”تمہیں اللہ سمجھے چاچا۔“ میں نے فطقی سے اسے گھورا اور دوبارہ سے وضو کر لگا۔

اس حسین وادی کے سرسبز قلعے پہ پھولوں بھری سرزمین پہ بچہ ادا کرتے ہوئے کچھ عجیب سا لطف اور سکون محسوس ہوا۔ یہ سچ ہے کہ فطرت آپ کو خدا سے اور قریب کر دیتی ہے۔ چہرے کو چھو کے گزرتی بدلیاں بدن میں بھر بھری پیدا کر دیتی ہیں۔ سلام بھیرتے ہوئے میری نظر پھر اس قبر پہ پڑی تجانے میرے دل میں کیا آیا کہ چند چوکوں بعد میں اس قبر کے سرہانے کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ بڑھ کے ایک بڑا سا گیندے کا پھول توڑا اور اس کی چپٹاں قبر کے سرہانے پھیلا دیں۔ واپس پلٹتے ہوئے ایک سرشاری کی کیفیت مجھ پہ چھائی ہوئی تھی۔

۱۸ مئی ۱۹۸۰ء

مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود فیروز آج نہیں لوٹا۔ میں سخت چھٹھلایا ہوا تھا۔ صبح سے اس جشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کمرے میں قید کرنے کے لیے بے چین تھا اور اب فیروز غائب تھا۔ موسم کی خرابی مجھے اس کی بے بسی کا یقین دلارہی تھی کہ یقیناً سارا دن چلتی تیز آندھیاں اسے سفر کرنے سے روکتی ہوں گی اور شام کے بعد تو ان علاقوں میں سفر کرنا یوں بھی ناممکن ہوتا ہے۔ پھر بھی مجھے رہ رہ کے اس پر غصہ آ رہا تھا۔

میں اُٹسنا ہوا سا چارپائی پہ سیدھا لایٹا چھت کی کڑیاں مگن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اپنی جس ساعت اور جس شام سے کام لیتے ہوئے کڑھ کڑھ کر وادی میں ہونے والے جشن کی گہما گہمی محسوس کر رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے اُونچے اُونچے نغموں میں انجمنی زبان والے گیتوں کی مدھم

مدھم آواز میں آ رہی تھیں۔ الاؤ کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ چلتی لگتی یوں کی کڑوی خوشبو، چاول دم لگنے کی اشبا انگیز مہک کے ساتھ ساتھ چرلی کھیلنے کی ناگوار سی بڑبڑ بھی آ رہی تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی یہ اچانک اور زوردار دستک ایران چاچا کی مخصوص تھی۔ میں نے بے دلی سے اسے اندر آئے کو کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ چند اور مقامی لوگ بھی زور زور سے بولتے چلے آئے۔

میں پھرتی سے اُٹھ بیٹھا۔ ان کے انداز سے فطقی اور اپنائیت بیک وقت عیاں تھی۔ ایران چاچا نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”صیب، یہ لوگ بہت سخت تھا ہیں۔ تم نے ان کی دعوت کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا، اس لیے تم صرف فیروز خان صیب کے مہمان نہیں پوری وادی کے مہمان ہو اور وادی کا کوئی مہمان یوں اکیلا پڑا ہو تو کیا خاک تہوار ہو گا۔ بھلا کیا جشن منائیں گے ہم لوگ۔ خان صیب نہیں تو کیا ہو تا تم ہم لوگ کے ساتھ چلو، اگر کوئی کسر رہ گئی تمہاری خاطر میں تو فیروز خان صیب سے کہہ کر سو جوتیاں لگو الینا۔“

اس کے استحقاق میں مسکرا دیا اور مزید غرے نہ کرتے ہوئے ان کے ہمراہ چل پڑا۔ پوری کیلاش عوام اس وقت ایک کھلے سے میدان میں جمع تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان سب اپنے اپنے ٹولے بنائے بیٹھے تھے۔ ایک طرف چند بزرگ خواتین برتن نما ساز بجا بجا کے کا پتتی آوازوں میں گیت گارہی تھیں اور الاؤ کے گرد میں سرودن کی ٹولی دائرہ بنا کے رقص کر رہی تھی۔ کچھ کچھ دیر بعد ٹولی کے ارکان بدل جاتے تھے۔

میں دلچسپی سے ان سادہ چہروں پہ پھیلے مسرت کے عکس دیکھ بھی رہا تھا اور اپنے کمرے میں ان کے مختلف زاویے قید بھی کر چکا تھا۔ میری توجہ رقص سے زیادہ ان کے چہروں پہ تھی۔ اتنے آئینہ چہرے میں نے کہیں اور نہیں دیکھے تھے۔ جودل میں وہی چہرے کے خدو خال سے ظاہر ہوتا تھا اور اس وقت ہر چہرے پہ صرف ایک ہی چہرہ جھللا رہا تھا اور وہ تھا خوشی کا..... محبت کا..... میری نوعیت کا ایک سترم آواز نہ توڑا۔

”صیب..... میں..... میں نے مڑ کے دائیں جانب دیکھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ژان خان اور اس کے ساتھیوں کو ان کی کیلاش دوست رقص کے لیے لے جا چکے تھے اور اس وقت میرے دائیں طرف وہی عجیب سے نام والا لڑکی بیٹھی تھی جو میری مادری زبان بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔

”تم..... وہی ہوتاں..... مریم علی۔“ میں نے ذہن پر زور ڈالا۔

”نہیں، مومنہ علی..... مومنہ علی ہے میرا نام۔“ وہ ذرا سا سسکرائی تو قدح ہماری اتار کے رنگ والے اس کے گداز لبوں سے موتی جیسے جھلکے خوب صورت دانتوں نے لشکارا مار کے جیسے روشنی کی میرے اطراف بھردی۔ الاؤ کی کئی فٹ اُونچی ہوئی آگ کی روشنی بھی مدھم سی پڑ گئی۔ میں سکھ رہ گیا، جب میں نے پہلی بار اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کی ہلکی بھوری رُفص وہاں کی روایتی عورتوں کی طرح سینڈھیوں کی صورت تھی اور صفائی سے گندھی تھیں، ماتھے اور زخسار پر بھرے تل گودے تھے۔ اس کی آنکھیں یہاں کے لوگوں جیسی بنزی یا نیلی نہیں تھیں، بلکہ بھوری۔ نہیں..... قمر حزی یا شاید شہد..... ہاں شہد جیسا ہی رنگ تھا اور ان شہد کے قظروں کے گرد پھیلی وہ لانی جیسے شفق..... یہ نہیں کب تک میں خود کو بھلائے ان آنکھوں کا رنگ دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہتا کہ وہ پھر سے گویا ہو گئی۔

”میں تمہارا شکر یہ ادا کرتا جی جی صیب وہ تم ہی تھے جس نے کل میرے ابا کی قبر پر فاتحہ پڑھی تھی۔ میں نے دور سے دیکھ کے بھی تمہیں پہچان لیا تھا، میرے دوڑ کے آنے کے باوجود تم وہاں سے جا چکے تھے۔ برسوں سے سوائے میرے اس قبر پر کسی اور نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اللہ تمہیں بڑا اجر دے گا، تم نے ایک اجنبی شخص کے لیے دعا کی۔“ وہ آبدیدہ ہو گئی تو میں بے چین ہوا تھا۔ لیکن پانی کی یہ بوندیں کہیں شہد میں نہ مل جائیں۔

”وہ تمہارے والد تھے۔ میرا مطلب ہے تم تو.....“

میں نے اس کے سیاہ لباس، سر پر روایتی ٹوپی، اس پر لگی سپیٹاں اور موتیوں کو بخور دیکھا۔ وہ فوراً بولی۔

”الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان باپ کی بیٹی ہوں۔ میرے ابا کا نام محمد علی تھا اور انہوں نے ہی مجھے مومنہ کا نام دیا، تاکہ میرے نام سے ہی یہ ظاہر ہو جائے کہ میں کون ہوں۔“

”اوہ.....!“ میں نے سر ہلایا، اب اسے کیا بتاتا کہ اس کا نام جاننے کے بعد بھی میں یہی سمجھتا رہا کہ کسی کم فہم نے بغیر مطلب جانے کو نبی ایک خالص مسلم نام ایک کافر لڑکی کو دے رکھا ہے، بلکہ اس وقت تو مجھے اس انجانے شخص پر غصہ بھی آیا تھا۔ جس نے میری دانست میں یہ نام مقول حرکت کی ہوگی۔ لیکن اب یہ جان کر کہ وہ ایک مسلمان شخص کی مسلمان بیٹی ہے، مجھے طمانیت سی محسوس ہوئی اور وہ گھبراہٹ جو اسے اپنے قریب پاکے مجھ پر طاری ہو گئی

تھی، پل میں زائل ہو گئی۔

میں پھر سے جشن کی طرف متوجہ ہو گیا، اسے شاید کچھ اور بھی کہنا تھا، جب ہی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ بار بار مجھے دھکتی لیکن میرے اس کی طرف دوبارہ پلٹ کے نہ دیکھنے پہ چپ رہ جاتی۔ آخر میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”تو تم رقص میں بھی اس لیے شریک نہیں ہو رہی۔ لیکن یہاں خزان خان، اس کے علاقے کے دوسرے بہت سے لوگ تو یہ جشن پورے جوش و خروش سے منارہے ہیں اور تم تو پھر بھی یہاں کی رہنے والی ہو، انہی لوگوں میں سے ایک ہو، وہی لباس پہنتی ہو، وہی زبان بولتی ہو، پھر اس موقع پر سب سے الگ تھلک کیوں ہو؟“

”نہیں سوائے مذہب کے میں نے بھی خود کو ان لوگوں سے الگ محسوس نہیں کیا، نہ میں نے، نہ میرے ابا نے، اصل میں میری ماں کی تلاش تھی۔ اس لحاظ سے یہاں موجود بہت سے لوگوں سے میرا خون ریشی ہے۔ ایک غیر قوم، غیر مذہب کے شخص کی اولاد ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی مجھ سے غیریت نہیں برتی بلکہ پندرہ سال پہلے مرنے والی میری ماں کے حوالے سے آج بھی مجھے اپنا عزیز جانتے ہیں تو میں اپنی ماں کے حوالے سے انہیں اپنا کیوں نہ سمجھوں۔ ابا نے بھی تو یہی کہا تھا۔ میری ماں کے عشق نے انہیں ہر اس چیز سے عشق کرنے پہ مجبور کر دیا جو میری ماں سے متعلق تھا۔ یہاں کے لوگ، یہاں کی زبان، یہاں کے گیت، یہاں کے پہاڑ، ندی، ٹالے، یہاں کا چنچہ چنچہ انکس عزیز تھا جہاں جہاں میری ماں نے قدم رکھا ہوگا۔“ اس کی آواز بھر اٹھی۔

”وہ بڑے اہتمام سے اس رقص میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے اپنے ابا کا ماں کے ساتھ اس جشن میں آخری رقص آج تک یاد ہے۔ جب میں پانچ چھ برس کی تھی۔ یہی مقام تھا، یہی گیت فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ اتنی ہی روشن آگ بھی ایسا ہی ستاروں بھرا آسمان تھا۔“ وہ کی طلسم کے سے عالم میں الاؤ پہ نگاہیں جمائے ساکت بیٹھی تھی، صرف اس کے لب نامحسوس کی حرکت کر رہے تھے نہایت مدھم آواز میں کہے گئے اس کے الفاظ مجھے جکڑ رہے تھے۔

”میری ماں کا پورا وجود دک رہا تھا، ابا کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ نہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھے وہ دائرے میں رقص کر رہے تھے۔ میں یہاں اپنی نانی کی گود میں بیٹھی انہیں دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، اچانک ابا کا ایک قدم ذرا آگے پڑ گیا۔ سنبھلتے

سنہیلے بھی اس کا ہاتھ ماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور..... اور ماں..... وہ مُت بنی کھڑی رہ گئی۔ سب لوگ حیرت کے عالم میں اسے دیکھنے لگے۔ کچھ شاید بات سمجھ گئے تھے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک میری ماں نے.....

اس کے چہرے پہ آتے ڈڑنے کے آثار مجھے مکمل طور پر ارگرد کے ماحول سے بے خبر کر کے اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ پہنے پہنچو کر گئے۔ وہ مجھ سے تو کیا خود سے بھی بے خبر تھی۔

”وہ جینتی..... جینتی چلی گئی۔ میری نانی مجھے گود سے اُتار کے روٹی جینتی اس کی طرف لپکی، میرا ابا بکا بکا اس کی حالت دیکھتا ہوا، پھر سب لوگوں کے ساتھ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن وہ جینتی رہی، اپنے بال نوجبی، اپنا سینہ جینتی رہی، پھر اس نے اپنا آپ سب سے چھڑایا اور بھاگ گئی۔ اتنا پیچھے پیچھے بھاگا..... بھاگتا گیا۔ لیکن سب کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نیچے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پھر..... پھر سب نے بہت ڈھونڈا..... مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا، اس کے لباس کی ایک دھجی تک کسی کے ہاتھ نہ لگی۔ اس رات دریا کو بھی جلال آیا ہوا تھا، اتنی تیز لہریں..... اتنی خوفناک موجیں..... نہانے کہاں بھاگے گئیں اسے.....“ آنسو اس کے گالوں پہ پھیلے تو وہ ہوش میں آگئی۔ دونوں تھیلیوں سے آنسو پونچھ کر وہ سر جھکانے اپنی بیچکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی دل پہ ایک انجان عورت کی اچانک اور عجیب سی موت کا ڈھک لے لے خاموش بیٹھا رہ گیا۔

”لیکن اسے ہوا کیا تھا؟ کیا پہلے بھی کسی اسے یہ پاگل پن کے دورے پڑتے تھے؟“

میرے سوال پہ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

”پاگل پن..... ہاں وہ پاگل ہی تو تھی۔ کسی بہت اپنے کے اچانک پھجر جانے کا خوف شاید یونہی پاگل کر دیتا ہے۔ دراصل میری ماں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ ایک اچھی مسلمان عورت بننے کی پوری پوری استقامت رکھتی رہی، لیکن اس کے خون کی تاثیر، مٹی کی محبت اسے اس سرزمین سے دور نہ جانے پہ مجبور کرتی رہی، اس نے شادی سے پہلے یہی شرط رکھی تھی ابا کے سامنے کہ وہ کبھی یہ وادی اور اپنے لوگ نہیں چھوڑے گی۔ اپنا پیدائشی مذہب چھوڑ دینے کے باوجود وہ اتنی جلدی یہاں کے رسم و رواج اور عقیدوں کو فراموش نہیں کر سکی جو اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اپنی ماں اور نانی کی طرح وہ بھی اپنا اور ابا کا

کھانے کا پیالہ الگ رکھتی تھی کہ مرد کا پیالہ بھرتا کرنے والی عورت جلد بیوہ ہو جاتی ہے، یہ اس نے سن رکھا تھا اور یہ بھی کہ تہوار کے رقص پہ ہاتھ چھوٹ جانا بہت بڑی بدگلوئی ہوتی ہے اور جس کا ہاتھ اپنے سامنے سے چھوٹ جائے وہ اسی ماہ مر جاتا ہے۔ یہ خوف میری ماں کو لے ڈوبا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسا کو..... شاید اسی لیے اس نے خود کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ تب سے میرے ابا نے رقص کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ اس جشن میں شریک ضرور ہوتا رہا۔

جن لوگوں نے کڑے وقت میں ان کا ڈھک بٹا، ان کی خوشیوں میں شریک نہ ہونا تو کم ظریفی ہوتی ہے اس لیے ابا کے بعد میں بھی اس جشن میں باقاعدگی سے شامل ہوتی ہوں، لیکن اس دائرے میں شامل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ گھنٹوں کے گرد بازو لیے ٹھوڑی گود میں ٹکاے ہوئی رہی۔ گنگ نہ رہا تھا کہ کچھ منٹ پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل اجنبی تھے، یکسر ناواقف.....

”منو، تم کیا ہر اجنبی سے یونہی گل مل جاتی ہو۔“

بات تو کل ہی چکی تھی منہ سے اب سمجھتے تھے اسے سوا کیا ہو سکتا تھا، لہذا اس میں بھی اس وقت اس کا خیال سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کے خود کو اس قدر نامعقول سوال پرکوس رہا تھا۔ وہ لب کلچن کھڑی ہو گئی میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی ایک قدم آگے بڑھا کہ پلٹ آئی۔

”صیب، تم اجنبی تھے لیکن میرے باپ کی قبر پہ دو پھول چڑھا کے اور دُعا پڑھ کے تم مجھے اپنے اپنے سے لگے تھے، میں تو صرف یہاں تمہارا شکر یہ ادا کرنے آئی تھی۔ مجھے تو خود پتا نہیں کہ اب اور کیسے میں اتنی دیر باتیں کرتی رہی، مجھے معاف کرنا صیب اگر میری کوئی بات بُری لگی ہو اور ہاں میں ہر اجنبی سے تو کیا کسی بھی اجنبی سے باتیں نہیں کرتی، اگر وہ اجنبی ہو تو.....“

وہ چلی گئی اور میں اس کے آخری الفاظ پہ غور کرتا رہ گیا، ماحول کی ساری رنگینیں، رقص و سرور کی گہما گہما اب افسردگی کی کبر میں لپٹ چکی تھی۔ اس کا بیٹا لہجہ میرے اعصاب بھگور رہا تھا، اس کی کینکپا آواز میری ادا لہزار ہی گئی اور اس کی درد میں ڈوبی آنکھیں میری روح کے اندر تک شکاف ڈال کے مجھے یہ باور کرائی تھیں کہ کسی اجنبی کا ڈھک، اپنا ڈھک نہیں بن جاتا..... اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو.....

آج صبح ہی فیروز کی واپسی ہوئی، میرے کچھ کہنے سے قتل ہی وہ معذرتیں پیش کرنے لگا۔ جب وہ جی جی یعنی موسیٰ کی خرابی۔

”تم نے جشن تو انجوائے کیا ہوگا؟“ اس کے سوال پر میں چپ کر گیا۔ کیا کہتا، میں اپنی فیلنگز کسی کے ساتھ بھی شیئر کرنے میں بڑا تنہا ہوں، واقعہ یہ ہوں یا یوں کہنا چاہیے قطعی نااہل ہوں اس معاملے میں۔ سوائے تمہارے اے میری ڈائری، کوئی نہیں جس سے میں اپنے احساسات و جذبات بیان کر سکوں، لیکن کل رات کے بعد سے جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ ابھی میرے قلب کی گرفت میں کیا آئے گا، اس جذبہ کو ابھی تک میرا دل بھی صحیح طریقے سے پرکھ نہیں سکا۔ کبھی میں خود کو بے حد افسردہ محسوس کرتا ہوں، اداس، قنوطی، کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے خزانوں کے منہ کھل گئے ہوں، میرے لیے اور میں جموں میں خوشیاں بھر بھر کے تھک رہا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنا آپ یکدم تنہا تنہا سا لگنے لگا ہے۔ ہر چہرہ نا آشنا محسوس ہوتا ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ابھی دس میں کسی بہت اپنے نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا ہو۔ پتہ نہیں یہ سب کیا ہے۔

میں آج سارا دن کمرے سے نہیں نکلا۔ میرے میزبان اسے رت جگے کی تھکن سمجھتے رہے، حالانکہ وہ کیا جانتیں تھکن سے تو مجھے جیسے آوارہ گرد کا کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ فیروز مجھ رہا ہے میں اس کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہا اور ایک بات کہہ کر تو اس نے مجھے چونکا ہی دیا۔

”یارا زریاب جاؤ لالہ کہیں گھوم پھر آؤ، پھر نہ کہنا فیروز نے اپنے گھٹنے سے لگا کے بٹھا دیا تھا کون جانے دوبارہ تم یہاں کبھی آ پاؤ یا نہیں۔“

”دوبارہ.....“ ہاں مجھے واپس بھی تو جانا ہے.....“ میں اُسی طرح چونک گیا تھا۔ اپنے ہی الفاظ پر..... آ کے واپس جانا تو ایک حقیقت ہے اس حقیقت کو کیسے فراموش کر بیٹھا اور کس کے لیے۔ میری خاموشی محسوس کر کے وہ بولا۔

”یاد رہے تو بختیارے چمڑے ہو، میں ٹھہرا از میدانم کا بندہ اور وہ بھی ایک عدد پٹھانی کا شوہر..... اگر تم دو دن اور ٹھہرنا چاہتے ہو تو میں اپنا پروگرام آگے کر لیتا ہوں اور اگر زیادہ دن زکے کا ارادہ ہے تو یار پھر مجھے فی الحال اجازت دو، چند انتہائی ضروری نوعیت کے کام وہاں زکے کے پڑے ہیں۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد پھر آ جاؤں گا۔ میرے لیے پہاڑوں کا یہ سفر کوئی نئی بات نہیں۔ تم کہاں آئے دن یہ ٹکلیفیں اٹھاتے پھر دو گے۔ ابھی بات ہے کچھ دن اور دلو، لو، اگر دل

لگ گیا ہے تو.....“

وہ تو سو گیا، لیکن میرے لیے پھر سے کئی سوال چھوڑ گیا۔ میں الجھنے لگا کہ واپس جانے کی بات سن کر میرا دل رکنا تو کیوں رکھا؟

ٹھہرنے کا سن کر میرے اندر اطمینان نے ڈیرے ڈالے تو کیوں؟ وہ کیا ہے جو ان وادیوں میں میں تلاشنا چاہتا ہوں؟ وہ کون ہے جس کی کشش مجھے اس زمین سے قدم آگے نہیں بڑھانے دیتی؟ میں نے آنکھیں موندیں تو شہد کے دو جتنے جھرجھر کرتے ہوئے پہنچے، میں نے آنکھیں کھول لیں۔

جواب مل چکا تھا۔

ایسا جواب جو اپنے غلو میں بہت سے سوال لیے ہوئے تھا۔

۲۰ مئی ۱۹۸۰ء

دوباش تک میں اور ژان فیروز کے ساتھ گئے۔ اس نے میرے بارے میں اسے اتنی تاکیدیں کیں کہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ اسے دین میں سوار کر کے میں نے ژان خان کو بصد اصرار اس کے کام پر بھیجا، ورنہ وہ فیروز کی تازہ ترین ہدایات کے زیر اثر مجھے ایک بل کو جودا کرنے پر تیار نہ تھا۔ وہاں سے میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔

کچھ ہی دور بعد میں نے خود کو محو علی نافی فیض کی قبر پر موجود پایا۔ تجانے کون شخص تھا یہ..... اور کتنا بڑا زور عشق تھا اس کا جس کے کھونے کے ڈرنے ایک عورت کے حواس بل بھر میں ضائع کر دیئے، اسے ایک ساعت میں دیوانگی کی سرحد پر لا کھڑا کیا اور وہ عورت..... کتنی کشش ہوگی اس کی محبت میں، جس نے ایک شخص کو اپنا خاندان، رشتے ناتے، ذات پات، وطن، کاروبار، سب بھلا کے اس حسین مگر پسماندہی وادی میں کافر قوم کے ساتھ غربت میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ میری خیریت ٹوٹی، جب میرے عقب سے دو ہاتھ طلوع ہوئے اور قبر پر گلاب کے پھولوں کی بارش برس گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ حد درجہ تنہائی کے لیے وہ مومنہ تھی۔ میں ذرا سا مسکرایا، لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر قبر کے قریب بیٹھ گئی اور زیر لب آیات کا ورد کرنے لگی۔ یقیناً اس کے گریز کا سبب میرا وہ دل آزار جملہ تھا۔ مجھے نئے سرے سے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں کاش کی آرام دہ فراؤ زرد زار سا آؤ کچھ بیچنے کے اس کے نزدیک دو زانو بیٹھ گیا۔

اس نے پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور بلند لرزہ دراز پکڑوں کے ساتھ وہ مجھے اتنی مقدس، اتنی نورانی لگی کہ مجھے اپنا اس کے اس قدر نزدیک بیٹھنا گستاخی محسوس ہوا، میں ڈراما سمجھا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کے اس نے ایک نظر میرے پیچھے ہونے پر ڈالی اور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”اچھا ہوسب تم خود ہی پرے ہو گئے ورنہ پھر کہتے پھرتے، کیا میں ہر اجنبی کو اتنا ہی قریب بیٹھنے دیتی ہوں۔“

”لاحول ولا قوۃ“ اس کی جلی کئی بات بہ مجھے تازہ آ گیا۔

”مومنہ مجھے گھما بھرا کے بات کرنا نہیں آتی، بلکہ کیوں کو آتی ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس وقت میری بات کا یہ مطلب نہیں وہ تھا دراصل تم اتنی اداس تھیں اور دور ہی تھیں، مجھے کسی لڑکی کو چپ کرنا نہیں آتا اور نہ ہی تسلی دینا۔ میں نے اس وقت صرف یہ سوچا تھا کہ کوئی ایسی بات کروں جس کا تعلق اس بیٹے واقعے سے نہ ہوتا کہ تمہیں اداسی کی اس کیفیت سے نکال سکوں۔ ہاں میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ جلدی میں انتہائی فضول بات منہ سے نکل گئی۔ تمہیں برا لگتا ہی چاہیے تھا لیکن اگر میں معافی مانگوں تو کیا تم اپنا دل میری طرف سے صاف کر لو گی؟“

وہ کوئی جواب دیے بغیر قبر کی گرد سے سوکھے پتے اور پھنیاں اٹھانے لگی۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی جواب دیے بغیر لوٹ جائے گی لیکن جاتے جاتے وہ پھر سے ایک عجیب سی بات کہہ گئی۔

”مجھے صرف یہ برا لگا کہ صبح کے تم نے خود کو اپنی کہا۔“ اس کی سادہ سا جملہ مجھے سن کر گھبرا گیا اور پھر سے سوالوں کے جنگل میں پھنسنے لگا۔ آج پھر طویل تاریک رات ہو گی، چیتے چنگھاڑتے سوال ہوں گے اور جواب میں میرے دل کا خوف ناک سنا۔

آف..... میں کیوں رکا..... کیوں نہ آج ہی لوٹ گیا، فیروز کے ساتھ مجھے بیڑیاں پسند نہیں۔ ابھاتے سوالوں سے نفرت ہے مجھے..... ایک جگہ ٹھہرنے سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر میں کیوں رکا..... کیوں..... آج رات مجھے اس کا جواب ڈھونڈنا ہے۔ ورنہ واپس لوٹ جانا ہے۔

۲۱ مئی ۱۹۸۰ء

اور میں واپس نہیں لوٹا۔

مجھے لوٹنا بھی نہیں تھا۔ کم از کم اسکے تو نہیں۔ اس طرح خالی ہاتھ تو نہیں، کبھی کبھی خود سے ہار مان لینا سوجھتا تھا۔ رات بھی یہی ہوا تھا۔ اپنے ذہن و شعور کے تمام دلائل، جواز اور خلیے بہانوں کے پر اٹھاتے دیکھے تھے میں نے، صرف دل کی ایک ذرا سی ضد پہ..... جو ہلکے ہلکے کے بس یہی کہتا جا رہا ہے۔ صرف وہ..... بس وہ..... اور کوئی نہیں..... اور کچھ نہیں..... صرف وہ.....

۲۲ مئی ۱۹۸۰ء

کل کا سارا دن میں اُسے دادی کے مختلف حصوں میں تلاشتا رہا، لیکن وہ مجھے نہ ملی اور آج میں نے اسے جمیل سوک کے پاس پایا۔ وہ سنو بایاں ٹھنڈے پانی سے دھو دھو کے ٹوکری میں رکھتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کا ذرا سا سترانا مجھے حوصلہ دلا گیا کہ اس دن ہونے والی کئی کا اثر اس کے دل سے زائل ہو چکا تھا۔

”کہاں تھیں تم، مومنہ میں کل سارا دن تمہیں ڈھونڈتا ہی رہا۔“

میں لپچی کے لیے چینی چھپانے میں قطعاً ناکام رہا تھا اور یوں بھی میں اب اس سے کچھ چھپانا ہی کب چاہتا تھا۔

”کوئی کام تھا صبح؟“ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول تھی۔

”مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے، تم سے اور یہ تم مجھے صاحب صاحب کیوں پکارتی ہو، خان زرباب تنگ ہے میرا نام۔“

”اچھا نام ہے۔“ وہ منہ پہ زور زور سے چھپا کے مارنے کے بعد اس بڑے سے پتھر کے ایک سرے سے پک گئی، جس پہ میں ناگہیں پارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر پھر کے اس کے شفاف چہرے سے پڑ سکتے ہوئے پانی کے قطرہ کو دیکھا۔

”تم نے بتایا میں کل سارا دن کہاں غائب رہیں تم۔ پوری سستی میں ہر جگہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔“ اس نے میری بے تالی اور لپچی کی توپ کو حیرت سے محسوس کیا۔

”میں..... میں.....“ بٹا لپچی، گئی تھی۔ میرے ماموں کی بیٹی ہے وہاں، اس کی خبر خبر کے لیے کل میں سارا دن وہاں رہی تھی۔ آج میری خالہ وہاں گئی ہے اور میں ان دونوں کے لیے یہ پھل، انڈے اور بخنی لے کے جا رہی ہوں۔“ اس نے ٹوکری کی طرف اشارہ کیا، جس میں اس کا ایک سیاہ جوڑا بھی رکھا تھا۔

”کیا تم اور کچھ دن وہاں روکی۔“ میرا دل تنگ پڑنے لگا۔

”نہیں تو..... بس دے دے کے آ جاؤں گی۔“

”تو یہ کیڑے، میں سمجھا ہوں رہنے جاری ہو۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ ٹوکرا کر پہلے کھڑی ہو گئی۔

”میں بھی چلوں تمہارے ساتھ، یہ سامان اٹھالیتا ہوں۔“ میرے ہاتھ آگے

بڑھانے پر وہ گھبرائی۔

”نہیں نہیں..... تم کیسے جاؤ گے، تم نہیں جانتے، وہاں یہ کوئی.....“

”بہت دور ہے کیا، یہ بٹائی گاؤں“ اس نے بے ساختہ سراپٹ روکی۔

”بٹائی۔“ گاؤں نہیں ہے وہ سامنے جو پھیل کے اس طرف گارے کا بڑا سا مکان

نظر آ رہا ہے ناں اسے بٹائی کہتے ہیں ادراپ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“

وہ بیچ ہی ہو گئی، اس کے چہرے پر پھلک سرفی مجھے لطف دے رہی تھی، پھر بھی میں

نے اس کی حالت پر مزید تم نہ دھارتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

”اچھا جاؤ، لیکن میں کل اسی وقت اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔ ضرور آنا اور مجھے

بتانا کہ تمہارے ماموں کی بیٹی کو لڑکا ہوا یا لڑکی۔“

وہ جاتے جاتے چونک کے چلتی اور میرے شرارت بھرے چہرے پر ایک خفگی بھری

نظر ڈال کے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ اس کی حیا اور جھجک نے میرا دل موہ لیا۔ باپ کے

مسلمان خون کی تاثیر اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ جس نے اسے یہاں کی دیگر

دو شیراؤں کی طرح بے باک نہیں ہونے دیا اور ایک عام سی بات کہنے میں اس کا یہ

تذبذب مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں بٹائی کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس

کے سامنے انجان بنارہا۔

فیروز کے ساتھ پہلے دن کی ساخت کے دوران میں اس جمیل پہ بھی آیا تھا اور اس

کنارے کے بالکل سامنے موجود بغیر کھڑکی اور روشن دان کے پتیلی چھت والے اس

کچے مکان کو دیکھ کر میں نے ایران چاچا سے استفسار کیا تھا کہ یہ مکان آبادی سے اتنا الگ

تھلگ کیوں ہے۔

”یہ بٹائی ہے۔ ہمارے ہاں جب کسی عورت کو بچہ ہونے والا ہو تو وہ یہاں قیام

کرتی ہے، اپنے مرد اور اہل خانہ سے کٹ کر، ناپاکی والی عورت کو آبادی میں قدم رکھنے کی

اجازت نہیں۔ یہاں صرف اس کی دائی رکھتی ہے اس کے ساتھ، یا پھر گھر کی عورت ملنے آ

سکتی ہے۔ لیکن اسے بھی رات رات کے کی اجازت نہیں۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک صاف لباس

لائی ہے جو بٹائی کی حدود سے باہر رکھا جاتا ہی۔ زچہ سے ملنے کے بعد وہ پھیل کے پانی

سے غسل کر کے اپنا پہنا ہوا لباس دھوئی ہے، اور صاف لباس پہننے کے بعد ہستی میں قدم

رکھتی ہے۔ مردوں کا اس عمارت کے قریب جانا منع ہے۔“

ایران چاچا کے تفصیل سے بیان کرنے پر فیروز نے رینارکس دیا تھا۔

”تو عورتوں کا کیونٹی سینٹر ہے یہاں۔“

۲۳ مئی ۱۹۸۰ء

مجھے اس سے تقریباً دس بجے ملنا تھا، لیکن فجر کی اذان سے بھی کچھ پہلے مجھ پہ بے

چینی چھائی اور ناشتے کے بعد تو مجھ سے ایک پل بھی نہڑکا گیا اور میں جمیل سوک کی طرف

نکل پڑا۔ وہاں پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس سرسٹ کی پٹری پر

مومنہ کو بیٹھے دیکھا۔

”تم کب آئیں؟“

”بس ابھی۔“ وہ بھی شاید اپنی جلد بازی پر چٹکی سی تھی۔

”پھر کیا خبر ہے؟“ میں نے اسے چھیڑا۔

”بتاؤ ہے۔“ اس نے خوشی سے پورے لہجے میں بتایا۔

”چھ بیٹیوں کے بعد۔“

”مبارک ہو۔“ میں اس کی بڑ غلغلے اور بے پایاں محبت سے متاثر سا ہو گیا جو اس

کے دل میں خود سے وابستہ ہر شخص کے لیے تھی۔

”اور چہ ہے میں نے اس کا نام بھی رکھ دیا ہے۔“ ”زریاب خان۔“ اس نے جھپکتے

ہوئے بتایا۔ اس کی زبان سے پہلی بار اپنا نام سن کر میں سحر زدہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس

نے میرا نام نہیں بلکہ میرے نام پر پھول ہی پھول جن دے دیے ہوں۔ میری خاموشی محسوس

کر کے وہ الگ الگ کے بولی۔

”کیا ہوا صیب..... برا لگا تمہیں..... تمہارا نام میں نے ایک..... میرا مطلب ہے

کہاں تم کہاں وہ..... شاید میں نے غلط کیا ناں۔“

”بالکل غلط کیا..... مجھے دوبارہ صاحب بکار کے تم نے بالکل غلط کیا۔ میں نے کل

جی تمہیں منع کیا تھا کہ اب مجھے صاحب مت پکارنا۔ سخت برا لگتا ہے مجھے۔“

”اس میں بُرا لگنے کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی خراب لفظ ہے کیا..... میں تو تمہیں عزت دینے کے لیے صیب کہتی ہوں۔“

”مجھے تم سے اجترام نہیں..... محبت چاہیے۔“ میری اس بات پہ اس کا رد عمل وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ وہ حسین لگی۔ یہ تو میں جانتا تھا، مگر اس موقع پہ جبر سے پہچانے کے لیے اس نے رنگ اس کے لیے کہاں چھپا کر رکھے تھے اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی مگر اس کے نیم واکھیا پاتے لبوں سے سانسوں کی مدم آواز پس آنکھیں اقرار کر رہی تھیں۔ شہد لٹاتی جھلکی آنکھیں ایک ہی بار حیرانی سے مجھ پہ اٹھی تھیں پر پھٹکنے سے پہلے خاموشی سے ایک عہد کر گئی تھیں۔

۲۴ مئی ۱۹۸۰ء

۴ مومند کا ایک اور وصف کھلا مجھ پہ۔ وہ اچھا لگتا لیتی ہے یہ تو میں پہلی ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔ آج میرے بار بار اُسے کہنے پہ بھی لگتا ہے یہ تیار نہ ہوئی۔

”میں نے سنا ہے یہاں کے لوگ خاصے شاعرانہ اور عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں۔ دو شیرازیں اپنے محبوب کے لیے گیت گیتی ہیں اور گاتی ہیں۔ تم پر تو ذرا اثر نہیں دیکتا ہے ان فضاؤں کی رنگینی کا۔“ میں نے جھوٹ موٹ منہ پھیلا دیا۔

”اچھا میں تمہیں۔“ ”برہ“ سنا ہی ہوں، مگر تم میری طرف دیکھنا مت، بالکل بھی نہیں ورنہ میں گائیں پاؤں گی۔“ وہ ہار مان کے بولی۔

”کیوں..... یہ کیسی پابندی ہے، میں کیوں نہ تمہیں دیکھوں..... ایسا ہی مشکل لگتا ہے، تمہیں میرے سامنے گیت گانا تو تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

میں ایک بل کے لیے بھی اس سمت رنگے چہرے کی دید سے خود کو محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے شہد کی جھلیوں پہ گلائی پونوں کے بادل گرا لیے۔ پلکے سُرد اور اسادہ سی لے میں اجنبی الفاظ کا جادو میرے ارد گرد پھیلنے لگا۔ اس کے پونوں اور شفاف گردن پہ بیک وقت ہلکی نیلی رنگیں ابھر اور ڈوب رہی تھیں، زرخاروں پہ بکھرے لیے جھینوروں میں، میں ایسا کھو گیا کہ وہ کب خاموش ہوئی یہ تو میں نہ چلا۔

”کیا لگا؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا وہ مزید بتانے لگی۔

”برہ“ یہاں کا لوگ گیت ہے، جس میں ایک لڑکی اپنے ایسے محبوب کے لیے غو انتظار ہے جو سفر میں ہے۔ وہ اس کی جدائی میں اپنی حالت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سفر

میں اٹھائی جانے والی اس کی صوبتوں پہ بھی فکر مند ہے۔

اے میرے محبوب

میں ہر روز تمہارا لیے اپنے بالوں کے کنڈل بنا کے رکھتی ہوں۔

میری آنکھیں تمہاری راہ دکھا رہی ہیں

تم نے چھ ماہ دکھا اٹھایا ہے

اے میرے محبوب

لوٹ آؤ

میں تمہاری ناگوں کی تھکن، اپنے ہاتھوں میں سولوں

اس نے بڑی خوب صورتی سے گیت کا ترجمہ پشتو میں دہرایا۔ تو مجھے ایک خیال آیا۔

”سنو تم کچھ لکھنا پڑھنا جانتی ہو؟“

”تھوڑا بہت، جتنا پڑھا سکا۔ یہاں کتابیں عام نہیں ملتیں اس لیے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، میرا ابا کوئی عالم فاضل تو نہیں تھا، بس پڑھنا اور لکھنا سکھا دیا۔ نماز، کلمے بھی یاد کرادیے۔ ماں کے بعد ابا بہت بھر گیا تھا۔ شادی کے پانچ چھ سال بعد تک بھی وادی کے اکثر لوگوں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ابا، ماں کا مذہب اختیار کر کے ہم لوگوں میں مل جائے لیکن اس کے برعکس ماں نے اس کے رنگ میں رنگنا مناسب سمجھا، یہ بات بہت سے لوگوں کو غصہ نہ ہوئی انہوں نے اس پہ اسی وادی میں رہنے کی شرط عائد کی اور ان کی توقع کے برعکس اس نے یہ بات مان لی۔ اس لیے وہ مجبوراً اسے برداشت کرتے رہے۔

ماں کے بعد ابا چاہتا تھا مجھے لے کے یہاں سے جاسکتا تھا۔ اپنے شہر یا کہیں اور بھی، اس کے ماں باپ زندہ نہ تھے، مگر بہن بھائی ذات برادری سب تھا۔ وہ کہیں جا کے سنے سرے سے زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن وہ نہیں گیا، اس وادی کو چھوڑ کے نہیں گیا، جو اس کے عشق کی گواہ تھی جو اس کی محبت کی گواہان ہو گئی۔

یہاں اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے، ان لوگوں کو اپنانے کے لیے اس نے کیا نہیں کیا۔ یہ چند ایک زار پڑا ہے لیکن وہ جوان نظر آ رہے ہیں۔ یہ ابا ہی کی بدولت ہیں۔ یہاں کے کاشت کاروں کو سنہری میں صبح بھاؤ لگوانا بھی ابا نے سکھایا۔ بہت سی عورتیں اپنے شہر خوار سچے لیے اس کے پاس آتیں کہ وہ قصبے جا کر اس پرین، کھانسی کے شربت اور درد وغیرہ

کی گولیاں لا کے رکھتا تھا۔ زیادہ بیمار بچوں کو خود قہیے لے کر جاتا، علاج کے لیے۔ میری بوڑھی مائی کا سارا خرچہ اٹھایا، اس کی اپنی ماں جیسی خدمت کی۔ اپنی اپنی عادتوں کی وجہ سے اس نے اپنی عزت اور مقام تو بٹائی لیا، آج میں بھی صرف اس کے کمروں کا پھل ہی کھا رہی ہوں، یہاں کا بچہ بچہ مجھے تنظیم دیتا ہے، میرے رشتے دار مجھے کسی امانت کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہتی ہوں لیکن اپنے ابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وہ تمام عقیدے اور ارکان ادا کرتی ہوں، روزے رکھتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں۔ کبھی کسی نے میرے کسی عمل پر اعتراض کیا نہ روکنے کی کوشش کی۔

”تمہارے ابا کہاں کے رہنے والے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”لاہور مانا بتاتے تھے اپنے شہر کا۔ سنا ہے بہت بڑا اور خوب صورت شہر ہے۔ تم نے دیکھا ہے۔“ وہ فرط اشتیاق سے بولی۔

”ہاں کئی بار، وفاقی بڑا نہ رشتہ نہیں ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ لاہور کا رہنے والا کوئی شخص اسنے برسوں تک کیسے اس شہر کو بھلائے رہ سکتا ہے۔“

”عشق..... صرف عشق.....“ وہ جذب کے سے عالم میں کہنے لگی۔

”ابا جیسا عشق کوئی اور نہیں کر سکتا۔“ اس کی بات پر میں گنگنا یا۔

ہم بھی اڑائیں خاک بیاں دشت سے تم گزرتو کسمی
ہم بھی دکھائیں چاک کرپاں لیکن جانوں دیکھو تو

”دیکھیں گے۔“ اس کے منہ سے پہلی بار شاعر اردو کے الفاظ سن کر میں بُری طرح چونکا۔

”تم..... اردو بھی.....“ اس سے پہلے ہمارے مابین صرف پشتو میں ہی گفتگو ہوا کرتی تھی۔

”تم نے پہلے بتایا ہی نہیں کہ.....“

”تم بھی صاحب.....“ وہ کھلکھلائی۔

”ابھی میں نے بتایا تھا ان کہ میں پڑھنا اور لکھنا جانتی ہوں تم تب ہی سمجھ جاتے۔“

”ہاں بس وہ.....“ میں خجل سا ہو گیا اس کے سامنے میں اتنا ہوش میں رہتا ہی کب

تھا کہ ہر بات کی بارگاہی میں جاسکوں۔

۲۸ مئی ۱۹۸۸ء

زندگی اتنی خوب صورت ہو جائے گی یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دن اسنے مہینے لگائیں گے، خبر ہی نہ تھی۔ پھر دن اس کے ساتھ پتا کے بھی چھڑتے وقت اداسی دل پہ بچنے کا ڈرتی ہے۔ کھٹوں اس کے ساتھ اچھر اچھر کی ہزار باتیں کرنے کے بعد بھی واپس آ کے لگتا اس نے وہ سب تو کہا ہی نہیں جو پچھلی شب سوچ کے رکھا تھا اور تو اور برسوں بعد ایسا ہوا ہے کہ میں نے کئی راتیں ڈائری نہ لکھی۔ اپنا دل میں کھولنا ہی ڈائری کے ذریعے تھا اور اب جب دل کو اک بنار فیل لگیا ہے تو.....

وہ بولتی بھی تو اتنا اچھا ہے کہ کھٹوں سننے رہنے سے بھی تھکتا نہیں ہوں۔ وہ خود بھی جب تھک جاتے تو چپ کر جاتی ہے اور تب میں اسے کچھ نہ کچھ کہہ کر چھپتا ہوں۔ غصہ بھی تو اسے اس قدر جلد آتا ہے وہ بھرے بولنا شروع کر دیتی ہے۔ میرا دل کرتا ہے وہ بولتی رہے، میں سننا رہوں چاہے وہ غصے میں ہی کیوں نہ کچھ کہہ رہی ہو۔ ابھی کل ہی وہ میری معلومات میں اضافے کے لیے وادی کے مختلف رسم و رواج اور عقیدے بتا رہی تھی۔

”یہاں کے لوگ نہایت کمزور عقیدہ رکھتے ہیں۔ کچھ تو تدبیریں سے بے بہرہ رہنے کی بدولت بھی ہے۔ بہر حال جو بھی ہے اسنے عقائد پر یہ سختی سے عمل کرتے ہیں۔“ ”اگر“

یعنی جود کہ مقدس ہوتا ہے اس دن کوئی کام نہیں کیا جاسکتا، البتہ تقریبات وغیرہ منعقد کرنے کے لیے یہ دن مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح 20 کا ہندسہ اور مارچ، اپریل مئی کے مہینے مقدس کہلاتے ہیں۔ پیاز کو یہ لوگ جنت کا مبارک پھل سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے لیے سیاہ رنگ مخصوص ہے، انہیں بال کٹوانا اور سر رنگا رکھنا منع ہے۔ مرغ حرام ہے۔ اسی طرح اپنا پالا جانور خود کھانا بھی حرام ہے۔ عورت پر خرمنی کا گوشت کھانا حرام ہے وغیرہ وغیرہ، ہر آسانی آفت اور نظام کے بارے میں ان کا اپنا نظریہ ہے جیسے کچلنے کا مطلب ہے پریاں لڑائی کے دوران تلوار چلا رہی ہیں۔ اور جب گھوڑا اور گائے آسان پہ دوڑ لگاتے ہیں تو آندھی آ جاتی ہے۔ پہاڑوں پہ پریاں رکتی ہیں، جن کی خدمت میں نذر چڑھانا ہر شخص پر فرض ہے جو کوتاہی کرے، پریاں اس کی زندگی پہ اچھا بُرا اثر ڈال سکتی ہیں۔“

وہ چپ ہوئی جیسے میری عدم دلچسپی کو محسوس کر لیا ہو۔ میں دلچسپی لے تو رہا تھا مگر اس کے ہاتھوں کی حرکت میں جو الفاظ کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اسے دوبارہ بولنے پہ اُکسانے کے لیے میں نے چھیڑا۔

باد جود دل پہ اثر کرتا تھا۔ ماں کے بعد ابا کے اس گیت کے بولوں میں اور بھی درد آ گیا تھا۔

”پنجابی میں ہوگا۔“ میں نے قیاس کیا۔

”پتہ نہیں، بہت مشکل زبان تھی، اردو کے دو تین لفظ تھے اس میں عراں کا لیا۔“ وہ ذہن پہ زور ڈال رہی تھی۔

”عراں لنگیاں پہاں پار“ میں بھانپ گیا۔

”ہاں..... ہاں وہی۔۔“ وہ اچھلی۔

”پنجابی کا گیت ہے، بڑا مشہور۔ جہاں پنجابی بولی نہیں جاتی وہاں بھی پسند کیا جاتا ہے۔ مجھے بھی اسے سننا بہت اچھا لگتا تھا، میری ایک پنجابی دوست نے اس کا لفظ لفظ ترجمہ جب سے مجھے بتایا مجھے اس گیت سے اور مجھے محبت ہوئی۔“

”مجھے سناؤ ناں۔“ اس کی فرمائش پہ میں نے صاف انکار کر دیا۔

”میں گاؤں کا نہیں۔“ مجھے کانٹا نہیں آتا البتہ تمہیں ویسے ہی اس کے بول سنا دیتا ہوں، مطلب کے ساتھ۔“ تب میں نے اس کی بول مطلب سمیت سنائے جو بات اسے زیادہ اچھی لگتی تھی وہ دوبارہ فرمائش کر کے نہتی۔

عراں لنگیاں پہاں پار

ہالے نہ دس او کا لیا

یعنی ساری عمر بچوں کے بل رستہ کھنکے زگر مٹی۔ کچھ بل اور ضمیر جاے کالے بادل۔
ابھی نہ برس شاید وہ آتا ہی ہو۔

پھلاں دے رنگ کالے

سرخ گلاباں دے موسم دج

پھلاں دے رنگ کالے

جدائی میں گزری بھاری مٹی ویران دکھتی ہے، اور سرخ گلابوں کے موسم میں پھولوں کے رنگ سیاہ نظر آتے ہیں۔“

یہاں اس نے مجھے ٹوک کر دوبارہ اشعار اور مطلب سنے۔

”مجھے کچھ عجیب طرح سمجھ نہیں آئی۔ جدائی کا کرب اپنی جگہ، لیکن پھولوں کا تو جو رنگ ہے سو وہی رہے گا۔ بھلا سرخ گلاب کالے کیسے نظر آتے لگتے ہیں۔“

”یہ تم بار بار۔“ وہ لوگ، وہ لوگ۔ کیا کہہ رہی ہو۔ تم خود کون سی کم ہو۔ یاد نہیں اس دن بستی میں گھر دکھاتے ہوئے کیا ہوا تھا۔ ہر گھر کے داخلی دروازے پہ بکرے کے دو سینک اور چنگر لٹک رہے تھے۔ میں نے ہاتھ لگنا چاہا تو تم نے فوراً روک دیا۔

”نہ نہ ہاتھ مت لگنا۔ انہیں ہاتھ لگانے والا فوراً بیمار پڑ جاتا ہے۔“ حسب توقع اس کا منہ پھول گیا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے، میں کوئی ان کے مذہبی عقیدوں پہ تو یقین نہیں رکھتی۔ نذر نہیں چڑھاتی، قربان کا نہیں جاتی، میرا ایمان بھی وہی ہے جو تمہارا ہے کہ باش، آندھی، طوفان بھی زندگی اور موت کی طرح خدا کی طرف سے آتے ہیں اور ہر انسان کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ کسی کو کیا خبر میں، کن کن حالات میں اپنا ایمان بچانے کی سعی ہوں۔“ وہ زیادہ ہی گرم ہو گئی۔

”اوہو تم تو ایمان رکھیں۔ میں نے ایسا کہا کہ تم خدا خواستہ..... وہ تو اس دن تم نے ہی یہ بات کہی تھی جو میں نے یاد دلادی۔“

”تو کیا ہوا..... ان لوگوں میں پلٹے پڑھنے کا کچھ اثر تو ہونا ہی تھا۔ میری فطرت نہیں بدل سکتے یہ لوگ، عادتوں پہ تو اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پتا ہے ہمارے ہاں چار پانی شام سے پہلے پہلے جہاں بچپانی ہو وہاں بچھائی جاتی ہے، شام کے بعد کہیں اور ٹھنک نہیں کی جاتی۔ گھر کی باقی لوگوں کی طرح میں بھی اسی معمول پہ قائم ہوں۔ لیکن یہ اور اس جیسی دوسری بے ضرری باتیں یہ تھوڑا ظاہر کرتی ہیں کہ میں ان میں سے ہوں۔ میرا اتنا تو بکا مسلمان تھا۔ لیکن گھر سے نکلے ہوئے اگر کالی بلی راست کاٹ جائے تو سب کام چھوڑ کر واپس آ جاتا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی تو بے جا رگی سے کہنے لگے۔

”پتہ نہیں، مگر ماں ہمیشہ بہتی مٹی کالی بلی کا راستہ کاٹ دینا منحوس ہوتا ہے۔“
”اچھا تمہارے ابا تم سے اپنے گھر کی، اپنے شہر کی باتیں کرتے تھے۔“ بمشکل میں موضوع تبدیل کر سکا تھا۔

”ہاں بھی کبھی انہیں شہر سے زیادہ اپنا گاؤں یاد آتا تھا، جس میں انہوں نے اپنا بچپن گزارا۔ اپنے اسکول کی باتیں اور ایک گیت تھا اردو میں نہیں، کسی اور زبان میں شاید ان کی مادری زبان میں وہ اکثر گنگنا تے تھے۔ مجھے بہت پسند تھا۔ سمجھ میں نہ آنے کے

”جتنی میں تو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہی دہرا سکتا ہوں، کوئی شاعر تو نہیں جو شعر کی روح میں اتر کر معنی چراغوں۔ اتنی شاعرانہ جس ضرور ہے کہ شاعر نے جو کیفیت بیان کی ہے اس کو دل کے اندر تک محسوس کر سکوں لیکن معاف کرنا میں اتنا بڑا زبان دان نہیں جو مکمل تشریح کے ساتھ تمہاری تسلی کر سکوں۔ ہاں اگلے سولو جو میں بڑے دل اور جذب کے ساتھ کہہ رہا ہوں شاید یہ بات سمجھ جائے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ساری مٹھاس اپنے اندر سموتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

غلام فرید میں تان دوزخ سڑساں

جے میں کھکھ مانی دلوں موزاں

”اگر کبھی میں نے تم سے کچھ موزاں کبھی زندگی میں تمہارا دل دکھایا، کبھی بے وفائی کا سوچا بھی تو خدا مجھے دوزخ میں پھینک دے، مجھے آزل تک جلنے کے لیے۔“

میں اپنا عہد پوری سچائی کے ساتھ دہرا رہا تھا، جب ان شہدے بھری جھیلیں میں ہلکا سا سلاطین پیدا ہوا اور ایک گلابی پھلی میرے لبوں پہ ٹھہری۔

☆☆☆

۳۱ مئی ۱۹۸۰ء

فیروز کی اچانک آمد پہ میں حیران رہ گیا۔ وہ دو ہفتے کا کہہ کر گیا تھا اور بمشکل ایک ہفتہ رہ کر واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کا متفکر رویہ اور کھوجے انداز ابھی مجھے متوجہ کر گئے اور پھر اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

”لالہ میں کیا سن رہا ہوں، تم اور..... لڑکی؟“

”لڑکی؟“ میں چونکا۔ ”تمہارا مطلب ہے سوسن۔“

”ہاں وہی۔“ مجھے سوات تک اطلاع مل چکی تھی، مجھے یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ تمہارا نام کسی لڑکی اور وہ بھی کسی پہاڑی لڑکی کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ بہت کم عرصے میں کافی جان چکا ہوں تمہیں اور مجھے یقین ہے تم نے کوئی نئی دن رنگیں گزارنے کے لیے تو یہ کھیل شروع نہیں کیا ہوگا۔ یہ تمہاری فطرت میں ہی نہیں اور دوسری صورت میں..... یعنی اگر معاملہ یہی نہیں ہے تو..... پھر۔“

”پھر؟“ اس پھر تک تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”پھر یہ کہ آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ میں نے ایران چا چا ہے تمام معلومات لی ہیں اس کے بارے میں۔ اگرچہ وہ وادی کے مذہب سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن تمام لوگ اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس کے والد کے ان لوگوں پر کافی احسانات ہیں اور وہ احسان فراموش لوگ ہرگز نہیں، اس لیے کسی قیمتی امانت کی طرح اسے سنبھال کر رکھا ہے۔ اس کے باپ کی وصیت کے مطابق اس کے خضیال والے کسی مسلمان گھرانے میں ہی اس کی شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بستی والے اور یہاں قصبے کے لوگ بھی کم ہی یقین کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے، کافر قبیلے کے درمیان پرورش پانے کی وجہ سے اس پر کافر ہونے کا ٹیٹل لگ چکا ہے۔ ایسے میں تمہارا سہارا دینا ان لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ مشکل اگر کوئی پیش آئے گی تو وہ یقیناً تمہاری طرف سے ہوگی۔

پتہ نہیں تم اتنا بولڈ اسٹیپ لینے کی جرات کر پاتے ہو یا نہیں اور اگر کبھی لینے ہو تو یہ پتا نہیں کہ تمہارا خاندان تمہارے اس فیصلے کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ قبول کرتا بھی ہے یا نہیں؟ اگر بعد کی بات ہے پہلے تم فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا ہے، تم کس حد تک انوالو ہو؟ اگر یہ کچھ وقتی جذبہ ہے اور تم خود میں اس کی خاطر سارے خاندان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں پاتے تو میرا اعلان مشورہ ہے اس تمام قصبے کو یہیں ڈن کر دو اور میرے ساتھ واپس چلنے کی تیار کی کرو۔ کیونکہ ایران چا چا کو ان کے قبیلے کے بڑوں نے میرے پاس بھیجا تھا اور اس الٹی بیٹم کے ساتھ کہ عزت کے ساتھ لڑکی رخصت کرانی ہے تو باقاعدہ اس کے ماموں کے پاس رشتہ بھیجا جائے، ورنہ ساری مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ایک طرف۔

اپنی لڑکی اور وہ بھی ایسی لڑکی جسے انہوں نے کسی مقدس امانت کی طرح رکھا ہو، اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے کی اجازت وہ نہیں دے سکتے۔“

اس کی طویل تقریر کے اختتام پہ میں نے لمبی سانس کھینچ کے کب سے تھے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

”بہت بہت شکریہ۔“

”کس بات کا؟ خبردار کرنا۔“ وہ میرے رد عمل پہ حیران تھا۔

”نہیں میرے جذبول کو ایک واضح صورت دینے کا۔ میرے قدموں کو ایک صحیح سمت موڑنے کا، اور یہ جو کئی دن سے ایک بے نامی الجھن تھی میرے دل میں کہ اب کیا

ہوگا۔ کیا کروں گا میں..... کیسے واپس جاؤں گا..... کیسے رہ سکوں گا اس کے بغیر.....
اس الجھن کا حل میرے سامنے پیش کرنے کا، بہت بھرپور شکر ہے۔ میں کھل کر ہنسا۔
”ہاؤ اسٹو پڈ آئی ایم (کتنا احمق ہوں میں) اتنی ہی بات تھی اور کبھی میرے ذہن
میں آئی ہی نہیں۔“

”واقعی؟“ فیروز تعجب سے بولا پھر تعجب مار کے ہنس پڑا۔

”کمال شے ہے ٹو بھی یارا زریاب۔“

”اب راہ بھائی دے ہی گئی ہے تو میرا خیال ہے در نہیں کرتا چاہیے۔ کیا کل ہی
چلیں بات کرنے؟“ میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا، جیسے اگلے قدم پہ ہی تو ”کل“ ہے وہ
کچھ تجیدہ ہو گیا۔

”میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے اپنے بزرگوں سے بات کرلو۔ شاید انہیں کچھ اعتراضات
ہوں۔“

”شاید نہیں بھینا وہ کبھی نہیں مانیں گے کوئی فائدہ نہیں بات کرنے کا۔“

”پھر بھی..... بے شک تم اپنے فیصلے پہ قائم رہو۔ اپنی مرضی سے ہر کام کرو۔“

لیکن رکی طور پہ یہ سبھی تمہیں ان سے بات تو کرنی چاہیے۔ یہ عمر بھر کی بات ہے نہ تو تم
ہمیشہ کے لیے خاندان سے کٹ کے رہ سکتے ہو نہ ہی بیوی کو پوشیدہ رکھ سکتے ہو، اگر تم نے
ان سے چھپا کے شادی کر لی تو۔“

”میں چھپا کے شادی کر رہا ہوں، نہ چھپا کے بیوی کو رکھوں گا۔ ہاں میں فی الحال
انہیں اطلاع دے بغیر ان کی غیر موجودگی میں یہ شادی کر کے رہوں گا۔ رکی طور پر بھی ان
سے اجازت طلب کرنے کا مطلب ہے انہیں الٹ کر دینا۔ جب ان کے انکار کے بعد
میں نے اپنی مرضی سے یہ شادی کرنی ہے تو ابھی کیوں نہیں، کم از کم ابھی کسی کی دخل
اندازی کا اندیشہ تو نہیں، لیکن اگر باچا جان اور بڑے لالہ کو بھنگ بھی پڑ گئی تو وہ ہر ممکن
کوشش کریں گے۔ مجھے اپنے فیصلے اور ارادے سے باز رکھنے کی اور پھر بی بی جان..... تم
جانے ہی ہو یہ خونی رشتوں کی ایموٹل بلک میٹنگ، میں بغیر کسی دہنی دباؤ اور پریشانی کے
اپنی زندگی کا یہ سہرا اور شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا تم میری
مدد کرو گے۔“

میں نے اچھی طرح اپنا نقطہ نظر اس پر واضح کرنے کے بعد اس کا تعاون طلب کیا تھا

اور جوا بااس نے پوری گرم جوشی کے ساتھ مجھے وسیع بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔
یکم جون ۱۹۸۰ء

مومن کا طرز عمل میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ میری بات سن کے
کھل جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے خوف کے سائے ناپید ہو جائیں گے اور دل
میں اپنے بے یقین مستقبل کے حوالے سے بے سوالوں کو جواب مل جائے گا۔ لیکن میری
بات سن کے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور واضح ہو گئے۔ وہ یوں بدک کے
اُبھل جیسے میں نے اسے شادی کی پیش کش نہ کی ہو بلکہ آگ کے دریا میں کودنے کی
دعوت دی ہو۔ اس کے دھوکا انکار یہ میں بھڑک ہی تو گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیوں نہیں شادی کر سکتیں تم مجھ سے، میں یہ نہیں پوچھوں گا
کہ کیا کی ہے مجھ میں۔ اس لیے کہ کوئی بھی شخص خامیوں سے مبرا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم ہر
کئی اور خامی سمیت مجھ سے محبت کر سکتی ہو، تو شادی کیوں نہیں.....“

”بس نہیں کر سکتی، کہا ناں بالکل نہیں کر سکتی۔“ اس کے مسلسل نفی میں سر ہلانے پر
غصے کے ساتھ ساتھ بے بسی نے بھی مجھے گھیر لیا۔

”میری مجبوری ہے کہ میں تمہاری محبت پر شک بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بھی نہیں تصور
کر سکتا کہ تم مجھ سے محبت کا ذرا مد کیا، مجھ سے بھوٹے اقرار کیے، نہیں..... نہیں کیونکہ
میں جانتا ہوں مومن ایسا نہیں کر سکتی، یہ چہرہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا، یہ آنکھیں کوئی
جھوٹ نہیں بول سکتیں۔“

اس لمحے شدت سے میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں
میں تھام کے اسے اپنی آنکھوں میں جھانکے۔ یہ مجبور کروں، لیکن میں نے خود پہ قابو پایا اور
دورا نو اس کے رو رو بیٹھ کے عاجزی سے کہنے لگا۔

”مومن خدا کے لیے کچھ سوچو..... وہ کیا وجہ ہے کون سی مجبوری ہے جو تمہیں اس
شادی سے انکار پہ اکسار رہی ہے۔“ میرے بار بار کے اصرار پر وہ اپنے اندیشوں کو زبان
دینے پر تیار ہو گئی۔

”تمہیں بہت آسان لگ رہا ہے ناں یوں سارے خاندان سے کٹ کر مجھے
اپنا لینا۔ سارے جہان سے مگر لے کر اپنی من مانی کرنا۔ ایک فرد کی محبت پانے کے لیے
دوسرے تمام رشتوں کو ٹھکرا دینا اتنا ہی کھل نہیں۔ یہ جو تم بار بار کہہ رہے ہو۔“ بعد میں

دیکھیں گے اور بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کی کیا خانت ہے تمہارے پاس۔
ہوسکتا ہے تمہارے پاس کچھ بھی نہ بچے، نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن بھائی، نہ خاندان، نہ
جانیاد۔“

”اور تم..... تم تو رہو گی ناں۔“

”فرض کرو میں بھی نہ رہی تو۔ اپنے بھی ماں کے بھروسے سب کو چھوڑا۔ لیکن ماں کو
تو زندگی نے بس کچھ سال کی مہلت دی۔ اس کے بعد کیا رہا میرے ابا کے پاس۔ میری
صورت میں ایک مستقل ذمہ داری اور بس..... میں نہیں چاہتی کل کو پھر سے تم اور میں اسی
عذاب سے گزر رہیں۔ اپنوں کی بے اعتنائی کا کرب کہیں۔ ماں کے پاس تو پھر بھی اس کے
تمام رشتے موجود تھے۔ میرا دامن تو خالی ہے۔ میں خود ہی دامان، مہیں کیا دے سکوں
گی۔“

”مجھے صرف تم چاہیے ہومومنہ، صرف تم اور تمہارے لیے میں کوئی بھی نقصان اٹھانے
کو تیار ہوں۔ تمہارا ساتھ میری زندگی کے لیے اتنی بڑی آسائش ہے کہ اس کے بعد مجھے
کوئی خسارہ خسارہ نہیں لگے گا۔“

”اور میرے بارے میں کیا سوچا تم نے، میں کتنے خسارے میں رہوں گی۔ کل بھی
تمہی دامان، آج بھی، اور آنے والے کل میں بھی میرے لیے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تمہاری
اور میری محبت آج بھی اتنی ہی تیار ہے، کسی رشتے کے بغیر بھی، ہماری شادی نہ بھی ہوئی،
تم مجھے بھی نہ بھی منے تھے، کسی میرے دل میں تمہارے لیے وہی مقام رہے گا۔ تم دنیا کے
کسی کو نے میں بھی چلے جاؤ میں تمہاری یادوں میں زندہ رہوں گی۔ اس بات کا یقین ہے
مجھے۔ پھر میں صرف محبت کے نام پر تم سے شادی کیوں کروں۔

اگر مجھے کسی سے شادی کرنا ہوئی تو وہ ایسا شخص ہوگا جو مجھے ایک ہی رشتے سے
متعارف نہیں کر دے گا، جو مجھے کسی کی بہو، کسی کی بھانجی بنائے گا، جو مجھے ایک بھرے
پرے کنبے میں بٹائے گا، مجھے وہ دے گا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے اور پھر
چاہے مجھے اس سے محبت ہو یا نہ ہو، وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے۔ اگر شادی صرف ایک ہی بار
ہوتی ہے تو میں اسی سے کروں گی۔ درنہ بے نام و نشان تو میں یہاں بھی ہوں، تمہارے
ساتھ جا کے بے سائبان نہیں ہونا چاہتی۔“

”تو پھر میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ مومنہ علی، ایک خشک مرد تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم

پوری آن بان اور وقار کے ساتھ اس کے گھر جاؤ گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا
پڑے۔“

”تم مجھے آن بان اور وقار کے ساتھ وہاں لے تو جاؤ گے لیکن سب کو مجبور تو نہیں
کر سکو گے کہ وہ میرے وقار کا احترام کریں۔ نہیں خان زبردستی تم مجھے ان کے سروں پہ
تھوپ کے اور بھی بے وقور کر دو گے۔ میں سب سہہ سکتی ہوں اپنی بے عزتی اور تذلیل
نہیں۔“

اس کے لیے میں جتنی محسوس کر کے میں چپ کر گیا کہتا بھی کیا، میں ہر طرح کے بلند
دبانگ دعوے کر سکتا ہوں اور شاید ان پہ عمل بھی نہیں کیا میں واقعی باجا جان کی نظروں میں
اسے بہو کی حیثیت دلا سکتا ہوں؟ کیا اپنے خاندان والوں کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ اسے
خشک فیملی کے باعث فرد کی طرح محترم اور عزیز جائیں۔

ایک لمبی جنگ لڑنے کے بعد شاید میرے ماں باپ میری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو
کر اس شادی کو تسلیم کر لیں، مومنہ کو خشک ہاؤس میں قدم رکھنے کی اجازت بھی مل جائے،
لیکن وہ اتنے وسیع القلب ہرگز نہیں ہو سکتے کہ ایک کم نسب و کم حیثیت سی لڑکی کو گھر کے
ساتھ ساتھ دل میں بھی جگہ دے دیں۔ مجھے چپ ہی رہنا تھا۔ میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرنا
چاہتا تھا جسے پورا کرنا میرے اختیار میں نہ ہو۔

۲ جون ۱۹۸۰ء

اس اذیت ناک رات کی تمام تر سفاکی میرے چہرے پہ قلم تھی۔ رت جگے اور
تذہب کے خون آشام سائے آنکھوں سے ہو رہا تھے، ٹپکیں جھپکنے میں بھی سینکڑوں
کانٹے چھ جاتے تھے۔ میری حالت دیکھ کے فیروز بے چین ہو گیا اس کے پُر غلوں
استفشار پہ میں نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ وہی اپنے ارادے کی پختگی اور مومنہ کے انکار کے
پس منظر میں موجود تمام تر اندیشے۔

”فیروز، وہ ایک بار میرا ساتھ دینے پہ تیار ہو جائے تو ہر مرحلہ خود بخود آسان
ہو جائے گا۔ میں ایک دم سے اسے لے جا کے باجا جان کے سامنے نہیں کھڑا کر سکتا، نہ ہی
وہ اسے اسی طرح قبول کر لیں گے۔ وہ کم از کم مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں اپنا نام اس
کے نام کے آگے لگا سکوں، مجھے اس کی ہر راہی کا اعتبار آجائے تو میں تمام دنیا کا سامنا
کروں گا۔ بس ایک بار وہ میری مان لے۔“

میں بے بسی سے نڈھال تھا، اس کا اچانک اٹھ کے جانا بھی محسوس نہیں کر سکا۔ چند گھنٹوں بعد جب وہ واپس آیا تو خوشی سے چہرہ گھٹنا تھا اور جگمگاتے بے تابی اس کی ہر حرکت سے عیاں تھی۔

”اٹھو خان خانان..... اٹھو جان جانان..... آؤ تمہیں بنا میں سنواریں..... جلدی کرو، کام زیادہ اور وقت کم ہے۔ پہلے تو یہ لٹکا ہوا چہرہ اصل حالت میں واپس لاؤ، پھر انجینئر خاں سے حجامت وغیرہ بنواؤ، کچھ شکل پر رونق لاؤ۔ میرے یار کی بارات نکلی ہے آج۔“ اس کی بے ربط گفتگو میری سمجھ سے باہر تھی۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بارات؟ کون سا ماریا؟“ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔
 ”میں گیا تھا مومنہ کے پاس، کچھ باتیں اس کی بھی کچھ تھیں، اس کے اپنے اندیشے اپنی فکریں تھیں بڑی خود دار اور ناموس والی لڑکی ہے۔ ایک بختون زادے کو اور کیا چاہیے۔ ایسی شریک حیات جو آن بان اور شان میں اصلی ہو۔“
 وہ بچانے اور تکی ویر مومنہ کے قصیدے پڑھتا کہ میں نے ٹوک دیا۔

”تمہاری بات کیا ہوئی اس سے، مجھے یہ بتاؤ۔“
 ”قصہ مختصر یہ کہ وہ تم سے شادی پر تیار ہے۔“ اس نے بالکل ہی حتمی بات کہہ دی،
 جب کہ میں اس کی تفصیل جاننے پر بے تاب۔

”اوہ ہو مگر یہ ہوا کیسے، تم نے کیا کہا اس سے؟“

”اے اٹھادو دیا ہے، جس سے اس کی ذات ناآشتی۔! سے وہ رشتہ دیا ہے جس کے سہارے وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما سکتی ہے۔ یار عورت بڑی عجیب چیز ہے۔ محبت کے بارے میں بڑی جرس ہے اس کے اندر، چاہتی ہے ہر شے، ہر حوالے سے جانی جائے اور پھر مومنہ جیسی عورت جس سے قدرت نے ہر رشتہ جھین لیا تھا۔ اس کے اندر تو یہ طلب اور بھڑکی ہوئی تھی۔ میں اس سے تیار یاں بن کر کے ملنے گیا تھا لیکن اسے بہن بنا کے آ رہا ہوں۔“

اور پھر وہ اپنی ذات اور نقص کے حوالے سے بے حد حساس سے بڑے بڑے خراب حالات اور ماساعد ماحول میں بھی اس نے خود کو سنبھال کے رکھا ہے۔ اپنی پاکیزگی، اپنے ایمان پر غرور کی حد تک ناز ہے اسے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی اسے یا اس کے کردار کو نشانہ بنائے۔ جب کہ تمہارے اپنی پسند کی شادی کر لینے کی صورت میں کم از کم

تمہارے گھر والوں سے تو اسے یہ طعنے سننے ہی پڑیں گے۔ اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ تمہارا نکاح ابھی اسی وقت ہے کہ میری مسجد میں ہوگا۔ صبح ہم سب سید و شریف روانہ ہوں گے اور میری حویلی سے مومنہ رخصت ہوگی۔ تب جب تم اپنے والد یا بھائی کے ساتھ اسے لینے آؤ گے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے اور اس مسئلے میں تم کوئی اعتراض نہیں کرو گے۔“
 ”لیکن تم نے یہ فیصلہ۔“

”صرف اور صرف اپنی بہن کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس کے کردار و مقام پہ کوئی حرف نہیں آئے گا اور اپنے یار کو اس کی تمام خوشیاں دلانے کے لیے مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ اچھا اب گفتیش کرنا بند کرو اور اٹھ کر دھنک کے کوئی کپڑے پہن لو، اگر جین تو.....“ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔

میں..... میری تو وہ حالت تھی کہ میں اس کا شکر یہ تک ادا نہیں کر سکا اور چھایا ہوا۔ بھلا الفاظ اس کی محبت اور خلوص کا حق ادا کر سکتے تھے۔ میں خوشی سے گنگ تھا جب کہ سر میں اٹھار کے لیے بے تاب، اسی لیے فوراً تم سے اے میری ڈائری، تم سے اپنی خوشی شیر کر کے بیٹھ گیا۔ جب کہ آتے جاتے مختلف انتظامات میں مصروف فیروز کی پکار مجھے بار بار ڈسٹرب کر رہی ہے۔

۳ جون ۱۹۸۰ء

اور بالاخر مومنہ علی، مومنہ زریاب، خٹک بن، ہی گئی۔ چاہے کسی بھی طرح ہوئی مگر یہ شادی ہو تو گئی۔ مومنہ کی خند کہ میرے گھر والے خود اسے رخصت کرانے آئیں اور میری مجبوری کہ باپا جان کی صورت بھی کا فرستان اپنے بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے نہیں آ سکتے تھے اور کا فرستان سے اسے بغیر کسی تعلق کے میں لے جائیں سکتا تھا۔ یہ شادی یونہی ہوئی تھی..... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں شہد کی دو جھیلوں کو بس پیا سا ہی تکتا رہوں۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کی محاسن سے میرے لب سیراب ہوں۔ یہ شادی یونہی کیوں ہوئی تھی؟ کیوں؟ میں نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خان ارباب خٹک کا سب سے لائق فائق اور لاڈلا بیٹا خان زریاب خٹک، سرحد کے مشہور خانوادے کا چشم و چراغ سینکڑوں میل پہ پھیلی اراضی اور کروڑوں کی جائیداد کا وارث، اپنی بارات میں چند پہاڑی لوگوں کی ٹولی کے کر مانگے کا شلوار سوٹ پہن کر پیدل، کا فرستان کی ہستی میں جگمگائی کے آخری کوٹنے سے پہنچ کر لکڑی اور پتھروں سے بنے اسے دو منزلہ مکان تک چل کے جانے گا۔

مقدس ہے جان لینے کی بے تابی سوار تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ ہی تحریک کا دو بھی اسے جکڑ رہا تھا، وہ اپنے مال باپ کے ہمراہ ان تمام احساسات کو خود پہ گزرتا دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایک سطر پڑھنے پہ مجبور تھی۔ ورنہ شاید دل تو اس کا ڈائری کے اختتامی صفحات میں اٹکا ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک دھڑکتا ہوا سانسنا پھیلا ہوا تھا پورے کمرے میں صرف باچا جان کی اکھڑی اور دشوار سانسوں کی آمد و رفت کا شور تھا یا پھر بی بی جان کی دبی دنی سکبوں کی مدھم آوازیں۔ ضبط کر رہے تھے ان کی بلوریں آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ سفید بڑے جلال چہرے پہ زردی کھنڈی تھی اور دانتوں سے سختی کے ساتھ چمچے لب سکبیاں روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ خان افراسیاب خٹک نے یکدم اٹھ کر کمرے میں ٹھلنا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب مزید خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ خان دراب خٹک نے بھی ڈاکٹر کی تازہ ترین رپورٹ کو دسویں بار پڑھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے بھائی کو دیکھنا شروع کر دیا کہ کب وہ اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ تیسری بار بی بی جان کے سامنے گزرتے ہوئے وہ اچانک پلٹنے اور والد محترم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”آپ کی وجہ سے باچا جان..... صرف اور صرف آپ کی وجہ سے زریاب کا یہ حال ہوا ہے۔ اور اس کے بے حال ہونے کی وجہ سے آج ہم سب کی حالت دگرگوں ہے۔ ہر چیز کے ذمہ دار آپ ہیں۔ آپ ہی ہیں اس کی ہر فضول حرکت اور بے کار مشاغل کو بڑھاوا دینے والے، اس کے ہر روایت شکن اقدام سے ختم پوٹنی کرنے والے اور اس کی ہر ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے کمزور پڑنے والے۔“

خان ارباب خٹک کے ناتواں اور جھریوں بھرے چہرے پہ موجود آنکھیں حیرت سے پوری طرح کھل گئیں۔ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے بلاشبہ پہلی بار کسی کی اتنی آدھی آواز نہ سنی تھی۔ پہلی بار کسی ان کے سامنے ان کے جرم گوار ہا تھا اور انکی اٹھانے والا کوئی اور نہیں ان کا بڑا بیٹا، ان کا بڑا بیٹا خان افراسیاب خٹک تھا۔

غم و غصے کی شدت سے ان کی رگیں ابھر آئیں اور سانس گویا چند لمحوں کے لیے ڈوب ہی گئی۔ بی بی جان تڑپ کے انھیں لیکن ان سے پہلے ہی دراب نے لپک کر آسمین کی پائپ سیٹ کر دی۔ وہ وہیں اپنے خان کے سر ہانے کھڑی صفحہ کے دانے

دروازے پہ موجود چند بزرگ خورتوں نے میرا استقبال کیا اور میرے گلے میں خشک میوہ جات سے پردہ ہوا ایک بار ڈال کر خیر مقدمی گیت گائے۔ گھر کے کچے احاطے میں کئی بچیاں تالیاں پیٹ پیٹ کے بے حال ہو رہی تھیں۔ نکاح مسجد میں ہو چکا تھا۔ مومنہ کے ماموں اور خالہ چونکہ مسجد تک نہیں آ سکتے تھے اس لیے ان کی خوشی کے لیے میں خود چل کے یہاں تک آیا تھا، تاکہ وہ اپنے رسوم و قواعد کے مطابق اسے رخصت کریں۔ لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ کیسی اس قدر فضول اور بے زار کن ہو گی۔ خصوصاً اس وقت تو میں جھلا گیا جب میرے ہی پاؤں کے موزے سے اتراؤ کے انہیں جلانے کے بعد مجھے دھونی دی گئی۔

میرے چہرے پہ ناگواری محسوس کر کے ایران چاچا نے بتایا۔
”بچہ یہ تمہاری نظر اتارتا ہے۔ جب دروخت کرنے والے ایک ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں کی زوچیں تڑپ جاتی ہیں۔ جنہیں دیا میں اپنی محبت نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے حسد اور نظر بد سے بچانے کے لیے یہ اماں تمہیں دھونی دے رہی ہے۔“
اور کوئی یقین نہیں کرے گا، کہ میں..... جی ہاں میں حاسدوں کے خوف سے دیک کے بیٹھ گیا اور چپ چاپ نظر اتراؤ نے لگا۔
کون کہتا ہے محبت دیر ہوئی ہے۔ جی نہیں محبت تو بزدل ہوتی ہے۔ ذرا سے خطرے کو محسوس کر کے ہم جاتی ہے۔

☆☆☆

خان زریاب خٹک۔

مومنہ علی۔

اور.....

فیروز وردگ۔

ایک سیٹی سادی کہانی کے آسان فہم سے کردار۔

پھر ابہام کہاں ہے؟ اچھا وہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

شاید تب جب باچا جان کو بابا کے اس جرات مندانہ اقدام کی خبر ملی ہوگی۔ یا تب جب بابا جان ماما کو لے کر یہاں آئے ہوں گے۔ لیکن تب اس وقت فیروز وردگ کا کیا کردار رہ جاتا ہوگا اس ساری کہانی میں، کیونکہ ان کا نام ابھی بابا جان کے حوالے سے اس قدر خوف و ہراس کے ساتھ لیا جا رہا ہے..... کیوں؟ آخر کیوں؟

گرانے لگیں۔ دراب نے باچا جان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑے بھائی کو ملاستی نظروں سے گھورا۔

”بڑے لالہ، پلیز اپنے آپ پر کنٹرول کیجئے۔ باچا جان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ آپ کی تندہ تیز باتیں سہہ سکیں۔“

”باپ بستر پہ ہے، لاغر ہے، مجبور ہے، بے بس ہے مگر۔۔۔“ بی بی جان نے بھی برستی آنکھوں سے بڑے فرزند کو دکھایا۔

”مت بھولو کہ جہاد ہار باپ ہے۔ اپنے بڑوں سے اس طرح پیش آنا تو ہم نے تمہیں نہیں سکھایا افراسیاب۔“

”یہ ہی تو رونا ہے آپ نے جو کچھ سکھانا تھا بس مجھے زرساگہ اور دراب کو سکھایا سارے حدود و قیود کا احترام، بزرگوں اور ان کی مرضی کو ہر حال میں مقدم جانا، خاندانی حرمت و ناموس کو بتایا ہر چیز پر اوقیت دینا۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔ زریاب کو کبھی کچھ سکھایا ہوتا۔ لیکن اسے یہاں رہنے کا موقع ہی کب ملا۔ وہ یہاں رہتا تو اسے اپنی روایات و خاندان سے انس بھی ہوتا۔ باچا جان کی طرف سے اسے کھلی چھوٹ مل گئی تھی، بخارہ بن گیا تھا وہ۔۔۔۔۔ مگر گھر گھومنے والا۔۔۔۔۔ اور بخاران ہی آخلاقا لا گھر میں۔“

”اللاہ کی طبیعت میں ہی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ یہ چاکیر اور قواعد و پابندیاں سب ان کی فطرت سے بہت دور کی چیزیں تھیں۔ اس میں باچا جان یا بی بی جان کی تربیت کو مورد الزام ٹھہرانا غلط ہے۔“ دراب نے کہا۔

”اولاد کو کام ڈالنا تو فرض ہے ماں باپ کا اور ایسی کی ایسی فطرت اور طبیعت کی جو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی زندگیاں واؤ پر لگا دے۔“ افراسیاب کسی طور اپنا غضب دبانے پر تیار نہ تھے۔

”نہ اس کی سوچ بے لگام ہوتی، نہ وہ گھر سے بے زار ہو کر بھٹکتا پھرتا، نہ فیروز جیسے گمراہ کر دینے والے باروں دوستوں کے چنگل میں پھنستا اور نہ وہ کافرستان کی پہاڑن اسے ملتی۔۔۔۔۔ اور اگر یہ سب ہوتا ہی تھا، ہو ہی چکا تھا تو کیا ضرورت تھی باچا جان کو اس طرح اس کے آگے بارمان لینے کی، کیوں بھاگ گئے تھے اس کی پسند کو اپنانے کے لیے۔

کیوں اس کی ناخلفی اور نافرمانی کو نظر انداز کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

ماں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں بے خبر رکھ کے ایک حقیر اور بے مایہ لڑکی سے

کناج کر لینا اتنا قابل معافی جرم نہیں تھا۔ انہیں چاہیے تھا اسے قید میں ڈلوادیتے۔ لڑکی کو مروا کے کلام ہی کے پہاڑوں میں پھنکوا دیتے۔ عشق کا چند روزہ بخار اُتر ہی جانا تھا ایک دن۔“

”بعض جادو سرچنے کے بولتے ہیں۔“ بی بی جان نے سرد آدھری۔

”اپنی ہی اولاد کو خود اذیت دینا اسان کام نہیں۔ اس لڑکی کو مروانا نامکن نہیں تھا لیکن تم نہیں جانتے اس وقت زریاب کا جنون کس درجے کا تھا، اسے کھودینے کے ڈر سے خانہ جی اس لڑکی کا بال بھی پکا نہ کر سکے مگر یقین کرو انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی۔ اخلاقی اختیار کرنے کی دھمکی بھی دی اور عاق کر دینے کا ڈراوا بھی لیکن سب بے سود۔ وہ پہلے ہی ہر چیز سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے چھوڑ دینے پہ تیار تھا۔ خانہ جی اس کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ تم ایک باپ ہو، باپ کی مجبوری جان سکتے ہو۔“ انہوں نے شوہر کی طرف سے صفائی پیش کی۔

”میں صرف ایک باپ ہی نہیں۔ ایک بھائی بھی ہوں۔“ افراسیاب جھکے جھکے انداز میں کرسی پہ گر گئے۔ ان کے انداز سے بے چارگی ظاہر تھی اور آواز میں شکست۔

”اس کی جوانی برباد ہونے کا غم کیا مجھے نہیں ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ پچھلے میں سال اس گھر کے کسی بھی فرد نے پرسکون گزارے ہیں۔ کون ہے جو رات کو انکڑوں پہ نہیں لوٹتا ہوگا، یہ سوچ کر کہ خانہ زریاب خشک جیسا نفیس اور حسین شہزادہ۔۔۔۔۔ دراب کی آنکھوں میں پھیلی نمی ان کے قیاس کی تائید کر رہی تھی۔

”میں صرف باپ ہی نہیں۔ ایک بھائی بھی ہوں، ایک بیٹا بھی ہوں۔ یہ بے بسی مجھے تریانی رہی کہ میں اتنا اثر و رسوخ رکھتے ہوئے بھی اپنے باپ کے سینے میں شندک نہیں پیدا کر سکتا۔ جب میں اور دراب ان کے آگے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی نگاہیں ہمارے پہلو میں کس کو تلاشی میں کیا میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ اور اب۔۔۔۔۔ جب ان کی برسوں کی امیدیں پوری ہونے والی ہیں تو یہ فیروز کا مسئلہ۔۔۔۔۔ دروگ خاندان اس کی تاک لگائے بیٹھا ہے۔“ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں منھیاں کھول اور ہنسنے لگا رہے تھے۔

”اسی لیے رہ رہ کے مجھے بس یہ خیال آتا ہے کہ کاش اس وقت ہی اس مصیبت کا سد باب ہو گیا ہوتا۔ اس نے کناج کر ہی لیا تھا تو کم از کم اس کی اس حرکت سے خاموشی سے ہتھیار نہیں ڈال دینے چاہیے تھے۔ اس ذلیل عورت کو کھلی چھوٹ دے دی ہم لوگوں نے

نکلے لگیں اس نے اپنا اندھا سیدھا وجود بمشکل کھڑا کیا اور دیوار کے ٹھنڈے لمس کا سہارا لے کر سیدھا بالکل سیدھا کھڑا ہو کر سر اٹھانے لگا۔

اپنے آپ سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں، سانس اکھڑ جاتی ہے

☆☆

اور یہ آخری چند صفحات
مقدس نے چوک کے خیم ڈائری اور پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔
”آج سے پہلے میں کس قدر اتنا جان بھری، کچھ بھی تو نہ جانتی تھی، کہاں ہیں میرے بابا۔
جان..... کیسی ہیں میری ماما..... کون ہیں وہ.....
اور آج ایک ایک نقش جیسے میرے دل پہ نقش ہے اس حسین چہرے کا..... وہ چہرہ جو
میری ماں کا ہے۔
اور آج جیسے میں دل کے اندر تک اتر چکی ہوں..... اس کے دل کے اندر..... جو
میرے باپ کا ہے۔

کتنا انوکھا تجربہ ہے یہ بھی ان احساسات کو لفظ بہ لفظ پڑھنا محسوس کرتا۔
ان تجربات کی گہرائی سے گزرتا۔ وہی امید و بیم کی کیفیات، وہی انتظار کی بے
تابیاں، وہی اظہار کی دشمنیں..... وہی کرب کے عالم..... ہر چیز میں نے خود محسوس کی
ہے۔ ہر چیز میں خود شامل ہوں۔
وہ میرے کسی جذبے، کسی احساس، کسی تجربے میں شامل نہیں۔ اس دکھ کا کچھ مداوا
تو ہوا ہے ناں۔

اور یہ آخری چند صفحات۔
نجانے یہ کیوں سی کہانی سنائیں۔ شاید انہیں میں وہ راز قید ہو، وہ عہد دفن ہو، شاید
یہی مجھے میرے ماں باپ کا سراغ دے جائیں۔“
اس نے ایک امید کے سہارے تھکی ہوئی آنکھوں کو پھر سے پڑھنے پر آمادہ کیا۔
اگرچہ اس ڈائری کے مطالعہ کے دوران وہ کچھ اس طرح گھوٹی تھی کہ یہ بات ذہن سے
نکل ہی گئی کہ وہ اصل میں کیا جانتا چاہتی ہے، لیکن اب آخری دو تین صفحات نے اس کی
بے چینی پھر سے بڑھا دی تھی۔ یہ ڈائری ہی وہ واحد ذریعہ تھی جس سے وہ اتنا کچھ جان پائی

زریاب کی زندگی سے کھیلنے کی۔“
”گزرے وقت کو کون سے کیا فائدہ لالہ۔ آپ بس اب کسی طرح کچھ ایسے
انتظامات کریں کہ زریاب لالہ کو فوراً پورپ، یا انٹینس بھیجا جاسکے۔“
”ہوں..... کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں میں بھی۔“

☆☆☆

وہ لے جاتا ہے سورج مجھ سے جینے کی سکت
رات بھر بن بن کے دن بھر ٹوٹتا رہتا ہوں میں
وقت کی آندھی سے کھل کھل جاتی ہے میری گرہ
خود کو کس کس کے ہر وقت بانٹتا رہتا ہوں میں
ہر دن پہلے سے کہیں بڑھ کے پڑا رکن اور ہر رات پہلے سے کہیں بڑھ کے طویل تر۔
ہر صبح کا سورج اپنے ہمراہ نیزے چھوٹی اذیتیں سیٹھ لاتا ہے اور ہر شام کی چھٹیوں
تاریکی کے جلو میں ڈھیروں ڈھیروں یادوں کے تارے ہوتے ہیں۔

یادیں۔
جو اور بھی غلط حال کر دیتی ہیں
یادیں.....
جو اور بھی تھکا کر دیتی ہیں۔
کاش ایسا ہو کہ کسی روز سورج نکلے، مگر اسے میرے سڑتے پلٹے وجود کی پرچھائیں
بھی نہ ملیں سارا دن میرا تماشا دیکھنے والا شرمندگی سے اپنی ہی جدت آمیز آغوش میں منہ
چھپا لے کاش ایسا ہو۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز شام ڈھلے مگر اس کی تاریکی کا ساتھ دینے کے لیے اسے میں
نہ ملوں۔ یادیں..... ان بوسیدہ دیواروں سے ٹکریں مارتی پھریں لیکن اس دل دو ماغ تنک
پہنچنے والے تمام رستے اندھے ہو چکے ہوں، جہاں ہر رات یہ یادیں دھوا دھوا بولتی ہیں۔ کاش.....
کاش..... آہ.....

لمبی سرد آہ کھینچنے ہی اس کی سانس پھر سے اکھڑ گئی، اس نے پورا منہ کھول کے اس
مختصر سی چادر دیوار میں موجود ٹکٹف سی فضا سے زندگی کھینچنے کی کوشش کی، لیکن جیسے سانس
کے تمام رستے تنگ پڑ چکے تھے۔ سینہ دھوکتی کی طرح چلنے لگا اور طلق سے عجیب آوازیں

میرادل کرتا میں زرساگہ باجی کے پاس بیٹھ کے انہیں وہ تمام واقعات سناؤں جو مجھے اپنے پچھلے سفر میں پیش آئے تھے اپنی آنکھوں سے انہیں دینا کی سیرکراؤں لیکن ان کے پاس اپنی کھلیوں اور کرنز کے جہیزوں اور رشتوں کے حاسدانہ تذکروں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور بڑے لالہ..... ان سے میں محبت کرتا ہوں لیکن احترام کے ساتھ..... وہی احترام جو مجھے باپا جان سے قریب نہیں ہونے دیتا وہی احترام میرے اور لالہ کے درمیان بھی حاصل ہے۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں اپنے اور اپنی اولاد کے درمیان ایسا کوئی رعب و دبدبہ نہیں رکھوں گا کہ کھل کے محبت کا اظہار بھی نہ کر پائیں گے ہم ایک دوسرے سے، پھر آخر دراب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ مجھ سے چھوٹا بھی ہے، بارود میں بڑھتا ہے۔ پھر کیوں نہیں ہمارے مزاج ملتے۔ کبھی کبھی تعلیم میں انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بارود سے آنے کے بعد وہ یہاں مرغوں اور بازوں کی لڑائیوں کے کھیل کھیلتا ہے، جنگی سوروں کا شکار کرتا ہے، باپا جان کی شوقیہ دشمن داریوں میں بوجھ چڑھ کے حصہ لیتا ہے اور پھر پھڑپھڑیاں ختم ہوتے ہی تعلیم میں مگن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھ سے ہم نہیں بھائیوں میں سے وہی اصل خازنہ ہے کہ باپا جان کے بقول اس کے تیر ہی اصل نسل خانوں والے ہیں۔ اگر ہر وقت بندوٹی اٹھائے رکھنا، سنگلاخ پہاڑوں پہ خاک اڑائے پھرنا اور پرہیزت جنگلوں میں واہیات قسم کے جانور شکار کرتے پھرنا ہی خان ہونے کی شان ہے تو میں باز آیا ایسی سرداری سے۔ مجھے تو شروع ہی سے رنگ، خوشبو اور فضا اثریٹ کرتی رہی۔ جہاں جہاں رنگ نظر آئے میں چرائے گیا۔ جہاں سے خوشبو آئی میں اس کے تعاقب میں بھاگا اور ایسے میں صرف یہ ڈائری ہی تو تھی جو میرے ہر تجربے میں شریک تھی۔

پھر مومنہ آئی..... اور میں جو سوچے بیٹھا تھا کہ خاندان کی کسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا چاہے زندگی بھر کنوارہ ہی کیوں نہ رہنا پڑے، کیونکہ کسی میٹرک پاس سے میری ذہنی مطابقت ہو کر نہیں ہو سکتی تھی اور لڑکی بھی وہ جو بنیاد سے آگے صرف چار سہ اور نو شہر تک گئی ہو۔ وہ میرے پڑ گئے وجود کا ساتھ کہاں تک دے پائے گی..... لیکن مومنہ..... اس نے میرے سارے تجربات غلط ثابت کر دیے۔ میں جان گیا کہ ذہنی مطابقت کے لیے تعلیمی سطح کا یکساں ہونا ضروری نہیں اور وہ لڑکی جو میٹرک تو کیا پانچ جماعتیں بھی نہ پڑھی ہوئی تھی..... جو اس بیٹھوی وادی کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں سے باہر کی دنیا

تھی اور یہی ڈائری وہ واحد ذریعہ ہے جو اس کو اپنے باپ کا سراغ بھی دے سکتی تھی۔ وہ یہ تو جان ہی چکی تھی کہ شادی کے بعد باپا جان کو کتنا وقت لگا باپا جان کو رضامند کرنے میں اور کیا کیا بھیائیں دے کر انہوں نے بی بی جان کو مجبور کیا تایا جان کی ناراضگی کا ذکر کبھی تھا اور کبھی بھی جان کی برہمی کا کبھی۔ ماما کے اندیشے بھی بیان کیے گئے تھے اور ان تمام واقعات کا کبھی سرسری سا ذکر تھا جو شادی کے بعد حویلی میں پہلی بار آنے پر پیش آئے تھے۔

باپا جان نے ناپسندیدہ بہو کو تسلیم کرنے کے لیے باپا جان کی آوارگی خرید لی تھی۔ ان کے سیر و سیاحت کی شوق بہ باندی لگا کر باور میں شریک ہونے کی شرط رکھی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اپنی پسند کو بزدلی تسلیم کروانے کے باوجود باپا جان انہیں گھر کے افراد کے دل میں جگہ دینے سے قاصر رہے تھے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ خوشگوار شب و روز کا تذکرہ یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اہلی خانہ کے کچھ کچھ پڑے اور ناراضگی کے باوجود دونوں مطمئن اور شاد تھے اگر چاہ ڈائری میں خاصی بے قاعدگی آگئی تھی، کہیں چار روز تو کہیں دو ہفتے کے وقفے سے کبھی کبھی تھی لیکن کہیں سے بھی دونوں کے مابین ہلکی چٹکی سی چٹکلاں اور ناچاقی کا ذکر نہیں ملتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اتنی رائیڈنگ کے بعد آخر وہ کیا بات تھی جس نے یکا یک دونوں کے راستے الگ کر دیے۔ اس نے ڈائری پر نظر جمائی۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء

مجھے یقین نہیں آتا کہ میں پورے ڈیڑھ سال بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مومنہ کے ساتھ نے میرے اندر ایسی تنہائیوں کو یکسر ختم کر ڈالا ہے اور اب مجھے اپنے احساسات و جذبات بیان کرنے کے لیے کاغذ کے بے جان ٹکڑوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے خود کو ہمیشہ اس خاندان میں فن محسوس کیا۔

اپنے تمام لوگوں سے محبت کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پر میں خود کو ان سے بہت فاصلے پر پاتا تھا۔ چلوئی بی بی جان، زرساگہ باجی وغیرہ سے ذہنی مطابقت نہ ہونے کی ایک وجہ تعلیم بھی ہو سکتی تھی، وہ گھر کی دیواروں میں قید رہنے والی خواتین تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کی ذہنی سطح بھی اس درجہ کی ہی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کے میں ہمیشہ ہی خاندانی جھگڑوں کی تفصیل اور رشتوں کے تانے بانے سن سن کے بور ہوتا تھا۔

کو بالکل بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ لڑکی میری سب سے قریبی دوستی بن گئی۔ میں اسے اپنی روح کے اندر محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے ذہن میں روشن دیکھنے لگا اور دل کے اندر دھڑکتا سننے لگا..... پھر..... پھر کیسے میں اسے کھودیتا۔ مجھے اسے اپنا ہی تھا چاہے اس کے لیے مجھے سب کچھ کھونا پڑتا یہ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن ٹھکر ہے کہ مجھے کچھ کھونا نہیں پڑا۔

اسے اس حویلی میں لانے کے لیے کچھ مشکلات تو پیش آئیں لیکن بہت جلد سب کچھ صحیح ہو گیا۔ اگر میں نے کچھ کھویا تو محض اپنی آزادی۔ باچا جان نے میری خواہش کے بدلے میری آزادی طلب کی تھی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں بہت بڑی قیمت چکا رہا ہوں۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے، کاش باچا جان آپ نے کچھ اور ہانک لیا ہوتا۔ یہ صحرا نوردی تو یوں بھی ختم ہونا ہی تھی۔ بیٹیوں بعد جب بھی لھر لوٹا تھا تو باچا جان کے سینے سے لگ کے ٹھنڈک سی آتر جاتی تھی وجود میں، بی بی جان کے ماتا سے جھیلے ہوئے پرسکون کر دیتے تھے لیکن کچھ ایسا نہ تھا جو مجھے رکے نہ مجبور کرتا۔ چند ہی دنوں بعد میں پھر سے نئے سفر پہ جانے کے لیے کمر کس لیتا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ پاؤں میں بیڑیاں کیسے ڈلتی ہیں۔

میرا سب کچھ تو یہاں ہے اس حویلی میں پھر سمندر پار کیا کھونے جاؤں گا۔ شاید وہی تھی جس کی تلاش نے مجھے دنیا کھنگالنے پہ اکسایا اور ہاں اک اور تھخہ، مقدس اس کے آنے کے بعد تو اب کاروبار میں بھی دل نہیں لگتا، پہلے ہی خاصی مشکل سے دل و دماغ دونوں کو اس جانب راغب کیا تھا لیکن اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کی گرفت سے اپنی انگلی چھڑا کرے گھر سے نکلتا کس قدر دھواں لگتا ہے۔ پھر بھی..... نکلتا تو پڑے گا۔ سیاست میں بری طرح مشغول ہوجانے کے باعث لالہ کار جان کا رو بار کی طرف کم ہی ہو گیا تھا اور میرے دلچسپی لینے کے بعد تو ان کا مکمل دھڑ بٹس برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ باچا جان کا بلڈ پریشر بھی بہت ہائی رہنے لگا ہے، جاپان جانا بھی ضروری ہے ورنہ نایک بڑی ذیل ہونے سے رہ جائے گی۔ مومنہ کو شادی کے بعد پہلی بار تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں میری سوچ کے برعکس وہ خاصی پر ہمت نظر آ رہی ہے اور..... مسلسل مجھے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلا رہی ہے کل ہی میری فلائیٹ ہے اسلام آباد کی وہاں سے میں تقریباً بیس روز کے لیے جاپان روانہ ہو جاؤں گا۔“

ڈائری ختم ہو چکی تھی اور مقدس بری طرح الجھ گئی۔ ڈائری اٹھانے سے قبل اس نے اچھی طرح یہ تسلی کر لی تھی کہ یہ وہاں موجود ڈائریوں میں سے آخری لکھی گئی ڈائری تھی۔

”تو کیا ان کے جاپان جانے کے بعد کچھ ہوا تھا۔ کیا واقعی وہ سب ہوا تھا جو بی بی جان اور چچی جان کہتی ہیں کہ ممانے بابا کی عدم موجودگی میں کسی اور سے..... نہیں نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈائری پڑھنے سے قبل میں نے بھی یہ فرض کر رکھا تھا کہ واقعی میری ماما غیر ملکی اور غیر مسلم ہونے کی وجہ سے آزادوش رکشتی ہوں گی۔ حویلی کی رسموں کو انہوں نے قبول نہیں کیا ہوگا اور اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ چن لیا ہوگا اور اسی بات پہ دل برداشتہ ہو کر بابا جان یہ ملک چھوڑ کے چلے گئے ہوں گے۔ لیکن..... یہ ڈائری تو کوئی اور کہانی سناتی ہے۔

میری ممانہ تو غیر مسلم ہیں اور نہ ہی غیر ملکی..... نہ یہودی نہ عیسائی، نہ ہی جرمن نہ فرینچ ان کا ”مومنہ“ ہونا ہی تو بابا جان کو چونکا گیا تھا اور انہوں نے ہر ہر صفحے پر ان کی پاکیزگی کا عقیدت بھرے انداز میں ذکر کیا ہے۔ اب تو میں مر کے بھی یہ تصور نہیں کر سکتی کہ وہ کبھی بابا کو دھوکا بھی دے سکتی ہیں..... پھر..... پھر کیا وجہ تھی..... کیا ہوا تھا ان کی غیر موجودگی میں..... کیوں نہیں وہ واپس لوٹے؟

یہ وہ سوال تھے جواب بھی باقی تھے اور ایک سوال یہ بھی۔

”کیا میری ممانہ نے بھی انہیں واپس لوٹنے پہ مجبور نہیں کیا؟“ اسے ان آخری صفحات سے ڈیڑھ ماہ پہلے لکھی وہ تحریر یاد آنے لگی جو اس کے بابا جان نے اس کی پیدائش کے صرف چھ گھنٹے بعد لکھی تھی۔ اس نے ایک بار پھر صفحے پلٹے۔

۵ ستمبر ۱۹۸۱ء

میں اتنا مطمئن تھا مومنہ کے ساتھ کہ مجھے کوئی کمی کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی اور اب ایک ننھی سی پری نے آئے کے یہ احساس دلایا ہے کہ زندگی تو ابھی ادا ہو رہی تھی۔ ابھی اک رنگ باقی تھا..... اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ رنگ اتنا شوخ ہوگا۔ زندگی سے اتنا بھرپور..... جب اس نے پہلی بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھلا کر مجھے دیکھا..... پہلی بار میرے ہاتھوں نے اس کا مکمل ساتھ چہرہ چھوا، پہلی بار جب وہ سننے سے گلابی ہونٹ بسور کر روئی..... اور پہلی بار جب میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ میری گود میں آتے ہی وہ چپ کر گئی، جیسے روٹی ہی صرف میری گود میں آنے کے لیے تھی۔

”دیکھو مومن، دیکھو اس کا چہرہ..... بالکل تمہارے جیسے ہونٹ، وہی ناک، وہی رخسار، وہی پیشانی، وہی آنکھیں۔“

”نہیں، اس کی آنکھوں کا رنگ میرا نہیں ہے۔“

اس کے کہنے پہ میں نے ذرا سا لگدلا کر اسے دوبارہ آنکھیں کھولنے پہ مجبور کیا۔
”ارے ہاں واقعی، اس کی نیلی کانچی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا۔ وہ شاید اس طرح کسے جانتے پہ نہ امان مانی تھی۔ پھر سے صفیاں بھیج کر رونے لگی۔

”دیکھو، مومن! تمہاری طرح اس کے بھی رونے پر آنسوئیں نکلتے، صرف آنکھوں کا رنگ یہ بتاتا ہے کہ وہ رورہی ہے۔ تم بھی جب روتی ہو تو شہد کے قطرؤں کے گرد جیسے کوئی زوح افزا گرا جاتا ہے۔“ میری مثال پہ وہ ہلکھلا کے ہنسی۔

”اور یہ جب روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔“ اس کی گیلی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا تھا۔

مقدس نے اپنی پلکوں کو انگلی کی پور سے چھوا، وہ غم تھیں۔

”بابا جان دیکھیے آج بھی میرے آنسو آنکھوں میں ہی تڑپتے پھرتے ہیں۔“

☆☆☆

وہ دیوار سے سر ٹیکے اڑوں بیٹھا تھا جب ہڑبوا کے رہ گیا۔ اس نے چوک کے چاروں طرف دیکھا اور پھر سے رات کے سنانے میں اس آواز کو کھوجنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ بے چین ہو کے ہنسنے لگا۔

”کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ لیکن خواب دیکھنے کے لیے سونا بھی تو پڑتا ہے۔ میں کب سویا ہوں جو خواب دیکھا ہو..... پھر وہ آواز.....“

یادوں کی جڑیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں کہیں

سے

دل اگر سوکھ بھی جائے تو بخر نہیں ہوتا

”یہ کس راز سے اس کی یاد پھوٹ پڑی۔ میں نے تو دل کب کا پتھر کر لیا تھا۔“ وہ سینے مسئلے لگا جہاں دو نیلی کانچی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

”اور جب یہ روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔“ کسی نے سر کوئی کی اور تاریکی میں دوروئی بسوئی آنکھیں ہزاروں شکوے لیے

اُبھر آئیں۔ نیلم کے شفاف ٹکڑے آنسوؤں سے نم ہو کے چمک رہے تھے۔ پلکوں پہ ٹھہرے آنسو ہیروں کی طرح جگر جگر کر رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اچانک ان کے عقب سے دو اور آنکھوں نے جھانکا اور.....

”تمہاری آنکھوں کا رنگ بتاتا ہے کہ تم رورہی تھیں۔“ کسی نے ان بھوری آنکھوں میں پھیلے لال ڈورے دیکھ کے کہا۔ وہ ڈر گیا، خوفزدہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھ چہرے پہ چھپا کے چلانے لگا۔

”ہی لیے..... اسی لیے مجھے بُری لگتی ہیں یہ یادیں وہ سب بھی یاد دلادیتی ہیں، جنہیں بھلانے میں اتنے سال لگے ہیں۔“

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر
یاد کچھ بھول کے نہیں آتی

☆☆☆

”کہاں جا رہے ہیں آپ اتنی صبح“ خان دراب ٹٹک کو صبح صبح جانے کی تیاریوں میں مصروف دیکھ کے ان کی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

خاہر ہے ان کا اتنا سویرے جاگنا اور پھر اتنے اہتمام کے ساتھ باہر نکلنا، خلاف معمول جو تھا۔ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول رہے تو زبیدہ حاتم جھنجھلا گئیں۔ جیسے ہی وہ گن لوڈ کر کے پلٹے تو بیگم کو راستے میں پھر موجود پایا۔

”اب کیا ہے؟“ وہ اپنے مخصوص اکھڑ لیچے میں بولے۔

”شکار پہ آپ نہ تو اکیلے جاتے ہیں نہ ہی اتنی رازداری کے ساتھ پھر.....؟“

”بڑے لالہ کے پاس جارہا ہوں، اسلام آباد۔ انہوں نے کسی کام سے بھیجنا ہے مجھے۔“ انہیں آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے، یایوں کہیں کہ آپ ان کا کیا کام کر سکتے ہیں

بھلا اور پھر نہ رانیور نگارڈ..... یوں فجر سے بھی پہلے روانگی کا کیا مطلب ہے۔“ ان کی کسی طور تسلی نہ ہوتے دیکھ کے دراب زچ ہو گئے۔

”گارڈ کے ساتھ نکلا تو لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ اکیلے زیادہ رازداری کے ساتھ پہنچوں گا۔ بڑے لالہ کی خاص ہدایات ہیں کہ ملازمتن تک کو علم نہ ہو، میرے گھر سے نکلتے کا خود وہ بھی سارا دان آفس میں مصروف رہیں گے تاکہ سب کو یہ تاثر ملے کہ ہم دونوں بھائی سارا دان اپنے اپنے کام میں مصروف رہے ہیں اور زریاب لالہ کو.....“

”کہاں ہیں زریاب لالہ؟ کب آئے وہ؟“ زبیدہ بے تابلی سے اور آگے بڑھیں۔

”آہستہ زبیدہ آہستہ“ وہ ڈپٹ کے بولے۔

”ابھی نہیں آئے وہ، کل آتا ہے انہیں۔ لیکن بڑے لالہ نے اپنے ذرائع استعمال کر کے انہیں آج ہی لانے کا انتظام کر لیا ہے۔ کل دشمن گھاٹ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ بلکہ وہ تو کئی روز سے جو کئے ہیں اس لیے آج بھی نہیں لانے کے لیے اتنی رازداری اور احتیاط برتی جا رہی ہے۔“

”ہائے اللہ“ وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئیں۔

”اب کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں ایک بار لالہ خیریت کے ساتھ حولی پہنچ جائیں۔ پھر کس کی جرات ہے جو انہیں نقصان پہنچا سکے۔ آگے کے لیے بھی بڑے لالہ نے کافی کچھ سوچ رکھا ہے وہ انہیں دشمنوں کی پہنچ سے دور بہت دور پہنچا دیں گے۔ یہاں تو وہ صرف انہیں باچا جان کی تسلی کے لیے لارہ ہیں۔“

”اور آپ..... آپ اکیلے اتنے خطرناک کام.....“

”کوئی خطرناک کام نہیں، یہ فرض ہے میرا۔ صرف احتیاط سے کام لے رہے ہیں ہم لوگ۔ ورنہ ایسی بات نہیں کہ خشک خاندان اب چوڑیاں پہن کے بیٹھ جائے۔ میرا بھائی آ رہا ہے اور میں اسے حفاظت گھر لانے کے بجائے اپنے بچاؤ کے طریقے سوچنے بیٹھ جاؤں۔ نف ہے تم عورتوں کی بزدلی پر اور خرد دار..... وہ پھر پٹلے۔“ خبردار ابھی گھر کے کسی فرد کو یہ علم نہیں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

”کیا کہا؟ پھر سے کہنا.....“ شاور چوک کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری ماما! جیسا کہ تم لوگوں کی قیاس آرائیاں ہیں، انگلش یا جرمن نہیں، کالا ش کی رہنے والی ہیں۔ وہ اس خاندان کا حصہ نہیں لیکن اسی وطن کے ایک خوب صورت پہاڑی خٹے کی رہنے والی ہیں اور وہ مسلمان بھی ہیں، پیدا انہی مسلمان..... مومنہ علی..... مومنہ زریاب خٹک۔“

اس نے دوبارہ زیادہ تفصیل سے بتایا۔ شاور کھوئی کھوئی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ مقدس کے لیے اس کا رد عمل حیرت انگیز تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ اس سے پوچھ رہی

تھی کہ ڈائری سے اس کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا جب وہ ہنس ہنس کے بتانے لگی۔

”بے حد اضافہ ہوا میری معلومات میں دیر اور چترال میں چھٹی کا شکار کرنا اور جمیلوں میں نہانا منع ہے۔ سوات کا رقبہ ۸۸۷۸ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ چترال سے ایوان کے رستے کا لام میں داخل ہوا جاتا ہے، وادی، بیورویت پر داخلے کیس پندرہ روپے ہے اور.....“

”ہیں..... ہیں..... یہ کیا اول فول بک رہی ہو۔“ وہ مشتہ نظر دوں سے اسے گھورنے لگی۔

”اور سنوٹاں..... وہاں کی اپنی زبان میں بیورویت کو مرمیت، برداور بری لاکبتے ہیں اور وہ جوان کا روائتی لباس ہوتا ہے ناں عورتوں کا کرتے کو۔“ پوش“ کمر کی پٹی کو“ مشوش“ اور لٹو کی“ کوسی“ کہتے ہیں اور.....“

”اسٹاپ اس مقدس تم نہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ۔ لیکن یہ کافرستان کا سفر نامہ تو مت سناؤ۔“ وہ باقاعدہ ناراض ہو گئی۔

”جو پڑھا ہے وہی سناری ہوں، ڈیز، میری ماما بابا جان کو انہی پہاڑوں میں ملی تھیں۔“ مقدس نے مختصر اتمام کہانی اسے سنا ڈالی۔

”مومنہ علی..... مومنہ زریاب..... مومنہ.....“ شاور بے یقینی سے بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر سر جھٹک کے کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مقدس حیرت سے اس کا اضطراب نوٹ کر رہی تھی۔ شاور کے چہرے پہ فیصلہ کن تاثرات پیدا ہوئے اور وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”سنو مقدس! میں پورے دثوق سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ میں تمہاری ماما کو جانتی ہوں۔“

”کیا.....؟“ وہ فرط حیرت سے اچھلنے کو تھی کہ شاور نے اس کے ہاتھ تھام کے پھر سے بٹھایا۔

”آرام سے بیٹھ کے سنو۔ میں نے ایک بار تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہمارے ہا پٹیل میں ایک ملازمہ..... میرا مطلب ہے ایک عورت ہے جس کی شکل و صورت تم سے حد درجہ مشابہ ہے۔ تمہاری آنکھوں کی ساخت، چہرے کی بناوٹ، بالوں کی رنگت، ایک ایک نقش حتیٰ کہ آواز اور سکرانٹ بھی بالکل ایک جیسی ہے۔ میری اس بات کو اس وقت تم نے مذاق

میں اڑا دیا تھا خود میں بھی اسے زیادہ سیر کی نہیں رہی تھی اس لیے بھول بھال گئی۔ اب تم نے جو بات بتائی ہے تو رہ کے وہی چہرہ میری نگاہوں میں آ رہا ہے وہی شہد رگت آنکھیں، سروقد، وہی رخسار اور ٹھوڑی پہ گودے تل اور نام، اس کا نام بھی مومنہ ہی ہے۔ ہم سب انہیں اماں مومنہ کہتے ہیں۔“

”کیا واقعی؟ پھر تو وہ..... کیا پتہ وہی.....“ اس کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے نکل رہے تھے۔

”ہاں شاید وہی..... اور شاید وہ نہ ہوں۔ تم ہر بات کے لیے خود کو تیار رکھو۔“ شناور نے اس کے چپکپکاتے وجود کو ہلایا۔

”میں اسی لیے یہ بات تمہیں بتانے میں ہچکچا رہی تھی۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ وہ کیلاش کی ہیں یا نہیں لیکن پٹھان ہیں یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ رواں اور شستہ اردو بولنے کے باوجود کہیں کہیں پشتو لب و لہجہ جھلک مار جاتا ہے اور پھر ان کی شکل و صورت، سب انہیں پٹھان ہی ظاہر کرتے ہیں۔ خصوصاً چہرے پہ گودے تل جو عموماً سرحد کی پہاڑی دوغیزاؤں کی نشانی ہیں۔ اسی لیے تمہارے ذکر کرتے ہی میرے تصور میں فوراً ان کا ہی چہرہ آیا۔ لیکن پتہ نہیں میں نے تمہیں بتا کے صحیح کیا یا غلط۔ میرا مطلب ہے ابھی یہ بات کنفرم تو نہیں ہے ناں یہ نام ایک ہی شخصیت کا تو نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں شناور تو میں۔ تم ان کا ذکر کرتی ہو تو میرا دل تمہارے اک اک لفظ پہ ایمان لانے کو چاہتا ہے۔ یہ دل کہتا ہے شناور وہی ماما ہیں وہی میری ماما ہیں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”مگر وہ نشان..... میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ان کے چہرے پہ جملے کے نشان ہیں۔ ایک طرف کا زرخسار اور آٹھ کا ٹنچلا حصہ پورا جلا ہوا ہے۔“

”جو بھی ہو..... میں جلد از جلد ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ لاہور چلنے کی تیاری کرو۔“

”ابھی..... اسی وقت..... مگر کیسے؟“ شناور بولی۔

”ابھی کل ہی دراب ماموں نے پوچھا تھا کہ وہ کب ہماری واپسی کی تکلیف بنوائیں۔ تو میں نے انہیں اگلے ہفتے بھی کسی دن کی تکلیف بک کروانے کے لیے کہا تھا۔ ابھی تقریباً بارہ چھٹیاں باقی ہیں۔“

”لیکن میں ایک ہفتہ نہیں رک سکتی۔ مجھے آج نہیں تو کل ضرور لاہور جانا ہے۔“

”اتنی جلدی تکلیف کیسے ملیں گی تمہیں؟“

”بائی روڈ چلے جائیں گے۔“ وہ مصحی۔

”بائی روڈ؟ پورے آٹھ گھنٹہ کا سفر۔ ناہا بانا۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”پلیز شناور..... پلیز..... تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ منتوں پر اُتر آئی۔

”میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں، مقدس لیکن تم خود سوچو محض میرے ہائی

بھر لینے سے تم لاہور تو نہیں پہنچ جاؤ گی۔ بی بی جان کہیں بھی بائی روڈ اکیلے جانے کی اجازت نہیں دیں گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم اپنے ہنگامی فیصلے کا پرزہ کیا دیں گے۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ کم از کم تم ایک کوشش تو کر سکتی ہو۔ ویسے بھی بی بی جان تمہاری ہر بات مان لیتی ہیں۔ تم ان سے بات کر کے تو دیکھو۔ کوئی بھی بہانہ بنا لو پلیز۔“

”اچھا بابا!“ اس کے مسلسل اصرار پہ وہ دھارماں کے بی بی جان کے پاس چلی آئی۔

”بی بی جان اور کیا وجہ ہوتی ہے دراصل میں نے اور میری دوسری فریڈ نے جس

ایگری میشن میرا مطلب ہے تصوری مقابلے میں حصہ لینا تھا اس کی ڈیٹ یعنی تاریخ مقرر ہو گئی ہے اور ابھی ابھی شائستہ کا فون آیا تھا مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے تاکہ اپنا نام لکھوا سکوں

ورنہ پھر میں اس مقابلے میں شامل ہونے سے رہ جاؤں گی۔ آپ پلیز ہمیں ڈرائیور کے ساتھ سمجھا دیجئے۔ میرا مطلب ہے مقدس بھی میرے ساتھ ہی چلی جائے اس کی بھی چھٹیاں

باقی ہیں لیکن مجھ سے اکیلے سفر نہیں کئے گا۔“

وہ جانتی تھی اس کا بہانا ایک دم بوکس اور فضول ہے، پھر بھی وہ بڑے دھڑلے سے بول گئی کہ مقابلے بی بی جان تمہیں جنہیں اس کے کالج کا پتا معلوم تھا نہ تعلیم کی خبر۔

انہیں کیا علم کہ ایسے مقابلے یوں ہی منعقد نہیں ہوتے اور نہ ہی اسکول میں ہونے والے ٹیبلو پروگراموں کی طرح ان میں لائن میں لگ کے نام لکھوانا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ

بے یقین نہیں تھی کہ بی بی جان بھلے اس کی بات کا اعتبار کر لیں لیکن ضروری نہیں کہ اکیلے جانے کی اجازت بھی دے دیں۔ اور اس وقت وہ حیران رہ گئی جب بی بی جان نے بغیر کسی سوال

کے کہہ دیا۔

”تم تیاری کرو۔ اگر ہو سکے تو نیچے تک ڈرائیور کے ساتھ نکل جاؤ شام تک پہنچ جاؤ

گی ورنہ تیاری میں دیر ہونے کی صورت میں کل صبح سفر کرنا۔ میں نہیں چاہتی تم دوپہر کو نکلو اور

رات گئے ہائل پہنچو۔“

”جھیک یو بی بی جان! ابھی نو بجتے میں پورا سو اگھنہ ہے۔ ہم تقریباً تیار ہی ہیں۔ آپ ڈرائیور کو کہلو دیجئے،“ وہ بھاگتی ہوئی مقدس کو خبر سنانے کمرے سے نکلے اور بی بی جان نے سینے میں کب سے رکھا سانس خارج کیا۔

”اچھا وہاں مقدس کے یہاں سے جانے کا سبب بن گیا۔ ورنہ ذریاب کے یہاں آتے ہی پھر سے..... اچھا ہی ہوا جو آتے ہی اسے یہ صورت دیکھنے کو نہ ملے گی ورنہ.....“

☆☆☆

”لالہ.....“ دراب نے بے تاب سی آگے بڑھ کے اگلے سے لگا لیا۔

”دراب تم؟“ وہ حیران تھا۔ اس قید تہائی میں کسی اپنے کی موجودگی؟

اذیت و کرب کے تھمرے سے وجود کو کسی کی مہربانیاں ہانہوں کا سہارا۔

اس نے حیرت سے خود کو اس کی ہانہوں کی گرم جوش پناہ میں محسوس کیا۔

”تم یہاں کیسے؟“

”آپ کو لینے آیا ہوں لالہ.....“

”مجھے لینے؟ کیا اتنا وقت بیت گیا؟“ وہ حیران تھا کہاں تو سرخ شیش کے بھی ایک رات نہ گزرتی تھی۔ کانوں سے چل چل کے ایک ایک پہر تپتا تھا اور اب یہ کہہ رہا ہے..... کہیں سال گزر گئے۔

”چلیں..... لالہ، گھر چلیں۔“ اس نے بھائی کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنا چاہا۔

”گھر؟ چلو۔“ وہ یوں بولا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ ہو۔

وہ بن ہو کے صحرا، دیوانے کو کیا مطلب

زنجیر کھلی ہو تو پھر خاک اڑانا ہے

اور خان ذریاب خٹک برسوں بعد گندمی بوسیدہ دیواروں، پیر زخمی کرتی بیڑیوں اور سنگلاخ پتھروں والی زمین کی سنگت چھوڑ کے آزاد فضا میں آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

”سینٹرل جیل پشاور۔“ کی تمام تر اذیتیں، تنہائیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے کی آزاد دنیا میں اس کے لیے اور بھی کچھ تھی..... کچھ اور انتحان..... کچھ اور اذیتیں.....

☆☆☆

عراس نگلیاں پہاں پار
ہالے نہ دس او کالیا
عراس نگلیاں پہاں پار
”یہاں بھی ڈھنگ کا کوئی گانا نہیں لگ رہا۔“

وہ پوری طرح سے اسد امانت علی خان کی ہر سوز آواز میں کھوئی ہوئی تھی جب شنادر نے الف ایف ایم ون ہنڈرڈ بھی آف کر دیا۔

”کسی ایک جگہ تو تک جاؤ۔“ مقدس کو اس طرح اس کی مداخلت پہ اچھی خاصی کوفت ہوئی۔

”میرا بالکل دل نہیں لگ رہا ان اُچاز سنسان سڑکوں پر تم بھی منہ لیپنے بیٹھی ہو۔ پینک بک بھی اس قدر رافترقی میں کی کہ ٹیکسٹ بھی لانا بھول گیا۔“ آف کس طرح کئے گئے..... یہ سفر، ابھی پورے ساڑھے چار گھنٹے باقی ہیں۔“ اس نے باقاعدہ واو بلا چا دیا۔

”تو کوئی رسالہ ہی پڑھ کر لو۔“ اس نے سائیڈ پر رکھے بیگ میں سے اکٹھے دو تین ڈائجسٹ نکال کے اس پر پھینکے۔

”یا پھر کچھ دیروسی نے کی کوشش کرو میرا دماغ مت چاٹو۔“ وہ اس وقت واقعی بے حد اُبھی ہوئی تھی، اسی لیے اس لیے اس لیے اس سے بات کر گئی، ورنہ شنادر کی طبیعت کا بے صبرا پن اس کے لیے نیچے چیز نہیں تھی۔ وہ بھی مقدس کی ذہنی کیفیت بھانپ کر چپ کر گئی لیکن نچلا بیٹھنا اس کی فطرت میں بھی کہاں تھا۔ چند منٹ منہ پھلا کے بیٹھنے کے بعد وہ ڈرائیور سے اچھٹے لگی۔

”یہ کیا ہے ماما! اس قدر کہو اس کیسٹ رکھے ہوئے ہیں تم نے، نام بھی اتنے ہولناک ہیں۔“ پینتو پر زہ کشم۔“ اور یہ کیا ہے ”شریک دا بنگرو۔“ ماما کا ڈکھیا تصویر بنی ہے اس کے گور پہ نام ہے۔“ خوش ہے۔“

”وہ دو بیٹھے۔ سرہ لو پند۔“

”وائفد کیا خال خال نام کا نا ہے اس میں۔“ اس نے سر ڈھٹتے ہوئے کیسٹ طلب کیا۔

”رہنے دو ماما! ہمیں نہیں یہ ظلم سہنا۔ اگر پشتو گانا سننا ہی ہیں تو بندہ رحیم شاہ یا پھر سردار نگر کو سننے کیوں مقدس؟۔“ اسے آنکھیں موندے دیکھ کر وہ یائوس سی ہوئی۔ ”اب کس سے سر پھوڑوں۔“ ایک آدھ سینکڑ ہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر آگے کی

طرف بھی۔

”اس سے تو اچھا ہے ایف ایم ون ہنڈ ریڈی نکالوں۔ غریبیں اور کافیاں ہی کسی۔“
گاڑی میں بھرے وہی پڑ روئے دم دم ہمسی ابھرے لگی۔

کدے نہ سکھ سنبھلا کھلیا

کدے نہ

ہائے کدے نہ

”خانہ خراب“ ایک جھکے سے گاڑی کے رُکنے پر اور نگریب ماما جھنجھلیا ہوا سا باہر

نکلا۔

”کیا ہوا؟“ وہ دونوں بھی متشکر ہو گئیں۔

”نازیو پچھر ہو گیا ہے بی بی!“ وہ چپک کرنے کے بعد پیچھے کی طرف مڑا۔

”چلو، کوئی بات نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ لگیں گے نازیو پہنچ ہونے

میں۔“ ان دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی۔

”اوئے خانہ خراب کا پچھر کسی چڑی کی اولاد پھر دغا دے گیا۔“

”اب کیا ہوا؟“ وہ دونوں بیک وقت ششے پیچھے کر کے باہر سر نکالتے ہوئے

چلائیں۔

”وہ غیبیٹ رمضان فی نہیں ہے، اس کو میں بولا بھی تھا گاڑی چپک کرنے کے واسطے،

یہ چپک کیا ہے اس خانہ خراب نے؟ پچھالتو (قاتلو) نازیو مائری نہیں رہی۔“

”تمہاری تو پرانی عادت ہے ماما۔ اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنے کی، کار تمہیں

ڈرائیو کرنی تھی، تمہیں خود سب انتظام کرنا چاہیے تھا۔ وہ چڑی ہے تو تمہارا سوار کا نانا کب

ہوا ہے؟“ شاد کے ڈپٹے پہ وہ چپ چاپ سر جھکا کر کھڑا رہا۔

”ظالم ظالم گانوں والے یہ الم ظلم کیسٹ بھرے یاد تھے، ایک اسپیریٹ نازیو نہیں رکھ سکتے

تھے۔“

”اب بس بھی کرو۔ یوں سر راہ چٹانے سے کچھ ہو جائے گا کیا؟“

مقدس نے ناگواری سے اسے دیکھا جو کمر پہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ جما کے بازو

نچاتے ہوئے اور نگریب کی خبر لے رہی تھی۔ آس پاس سے گزرنی گاڑیاں دیکھ کر دے کے

لیے آہستہ ہو جاتی تھیں ان کے قریب سے گزرتے ہوئے۔ مقدس کو بھی فکر تو ضرور تھی

لیکن اس طرح سڑک پہ تماشا بن جانے کا خوف زیادہ تھا۔ وہ پھر سے آوازیں دے کے
اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے بلانے لگی۔ ایک سلور گرے کرولا کی اسپڈ بھی سلو ہو گئی ان
کے پاس آتے ہی، مگر دوسرے لوگوں کی طرح گردن باہر نکال کے محض صورت حال کا
جائزہ لے کر گاڑی آگے بڑھالے جانے کے بجائے اس شخص نے ان سے ذرا آگے

سائیڈ پہ کار پارک کی اور خود ان کی طرف بڑھ آیا۔

”اینی برا بھلا؟“ بے حد شائستہ انداز میں اس نے شاد سے پوچھا۔ جو غصے سے

تمتھایا چہرہ لیے سلسل ڈرائیو کو گھور رہی تھی۔ غصے کی زیادتی نے اسے ڈھنگ سے اس

انجینی کی بات کا جواب بھی نہیں دینے دیا۔ وہ محض بڑبڑا کر رہ گئی۔

”وہ نازیو پچھر ہو گیا ہے صیب اور پچھالتو نازیو بھی نہیں۔“ اور نگریب منسنا یا۔

”اوہ آپ پریشان مت ہوں مس۔ اپنی سیٹ پہ آرام سے بیٹھیے جا کر، میں نازیو

دے دیتا ہوں آپ کے ڈرائیو کو۔“ وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے پیچھے باجھیں پھیلاتا

ہوا اور نگریب بھی لپکا۔

”ماما ایک منٹ“ مقدس نے پرس میں سے کچھ روپے نکالے۔ ”شاد یہ ماما کو پکڑا

دو۔ نازیو کی قیمت ادا کر کے پھر لیں۔“

”ایک سیکنڈ می زسی! یہ آپ نے بھجوائے ہیں؟“ وہ نوٹ لہراتا پھر شاد سے سر پہ

موجود تھا۔ ”میں نازیو کی خرید و فروخت کا کام بالکل بھی نہیں کرتا۔ بائی پروفیشن، میں

ایک ڈاکٹر ہوں۔ اگر آپ کو نازیو خریدنا ہی ہے تو میں آپ کے ڈرائیو کو چند میل آگے

سروس اسٹیشن پہ ڈراپ کر دیتا ہوں۔ لیکن..... یہ سوچئے کہ آپ کا یوں تھا اس کے انتظار

میں کھڑے ہو نا مناسب ہوگا؟ یہی بہتر ہے کہ آپ یہ نازیو لے لیں پلیز۔“

”دیکھیے، ہم لوگ اس وقت آپ کی مدد لینے پہ مجبور ہیں، لیکن پچھر بھی..... بغیر قیمت

ادا کیے یہ نازیو لینا بھی ہمیں گوارا نہیں۔“ مقدس باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کے وہ یوں چونکا

جیسے گاڑی میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

”اس طرح آپ کا یہ عمل مدد نہیں احسان کہلانے گا اور کسی کا احسان لینا ہماری

روایات کا حصہ نہیں۔“

اس کے مضبوط لہجے اور پُر اعتماد انداز سے محفوظ ہو کے وہ مسکرایا۔

”اور خواتین کی مدد کرنے کا معاذ و صول کرنا ہماری روایات کا حصہ نہیں۔ بہر حال

آپ کے اصول بھی مقدم ہیں ہمیں۔ آپ یوں کیجئے میرا کارڈ رکھ لیں اور جب آپ کا مسئلہ ہو جائے میرا تار مجھے واپس لوٹا دیجئے گا۔ شکر ہے کے ساتھ۔“ وہ اس کی میلی آنکھوں کی انجھن محسوس کر کے مسکرایا۔

”نہیں خیر، شکر یہ تو ہمیں ابھی بھی آپ کا ادا کرنا چاہیے۔“ شاد کو آداب یاد آ گئے۔

”اوئے خانہ خراب۔“ اورنگزیب نے پھر دہائی دی۔ ”یہ تو دو تار بچکر پڑے ہیں۔“ ”اوہ نو!“ ان تینوں کے منہ سے افسوس بھرے انداز میں ادا ہوا۔ مقدس تو مایوس سی ہو کر دوبارہ سے گاڑی میں بیٹھ گئی، جب کہ شاد و ذرا آگے ہو کر گزری گاڑیوں کو اُمید بھرے انداز میں دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مزید ایک تار دینے کے لیے رک جائے۔

”بی بی!“ اورنگزیب تیزی سے اس کی طرف آیا۔ ”مجھے تو تم اپنی شکل ہی نہ دکھاؤ ماما!“ اس کے دھاڑنے پر وہ سم کر مقدس کی طرف بڑھا۔

”بی بی تم ہی سُن لو امارا بات۔“ ”ہاں بولو۔“ موڈ تو اس کا بھی خاصا خراب تھا لیکن سننے لگی کہ اب کیا مڑوہ سنانا ہے، ماما اورنگزیب خان۔ شاد بھی سن گن لینے پاس کھڑی ہو گئی۔ ”وہ ڈاکٹر صیب (ڈاکٹر صاحب) کہتا ہے کہ ام تینوں اس کی گاڑی میں بیٹھیں۔ وہ آگے کوئی ہوٹل مائل ہے وہاں تک چھوڑ دے گا۔ بی بی لوگ آرام سے بیٹھ کے اور (ادھر) چائے پائے پیے گا اور ام تار لے کے واپس یہاں آئے گا، تار لگائے گا پھر تم کو اور لینے آئے گا۔“ اس نے پانچ لکائی منصوبہ تفصیل سے دہرایا۔

”چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔“ شاد نے سکون بھری سانس لی۔ ”لیکن ہم کیسے کسی اجنبی کے ساتھ چل پڑیں۔“ مقدس کو اعتراض تھا۔ ”بی بی کوئی پندرہ منٹ لگیں گے، بس ہوٹل تک جانے میں اور پھر ام ہے ناں تمہارے ساتھ۔“ اس نے تسلی دی۔

”میرا خیال ہے مقدس سبکی، بہتر ہے۔ یہاں اکیلے موٹر وے پہ کھڑا ہونا بھی تو نامکن سی بات ہے۔“ اس کے کہنے پر وہ مزید بس وچیں کرنے کے بجائے اپنا شولڈر بیگ

اٹھائے چادر درست کرتی باہر نکل آئی۔

”بی بی تم لوگ بھکر (فکر) مت کرو۔ ڈاکٹر صیب شریف آدمی ہے اور پختو (پشتو) بھی بولتا ہے۔“

وہ پختو بولتا ہے یا نہیں یہ تو ہاں نہیں چل سکا۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ان دونوں کو کہ ڈاکٹر صیب واقعی شریف بندہ ہے۔ بارہ منٹ کی ڈرائیو میں اس نے بالکل بھی دونوں لڑکیوں کو مخاطب نہ کیا، البتہ کافی شاپ میں اس کی دی گئی کافی اور اسٹیکس کی پیش کش شکر ہے کے ساتھ واپس لوٹا دینے پر وہ چپ نہ رہ سکا۔

”یہ تو آپ میری مہمان نوازی کو گھٹیں پہنچا رہی ہیں محترمہ!“ ”لیجئے خواجواہ ہی۔ ہم بھلا آپ کے مہمان کیسے ہو گئے۔“ شاد و بحث پر اتر آئی۔ ”کوئی آپ کے گھر تھوڑا ہی بیٹھے ہیں۔“

”ضروری نہیں کہ گھر آنے والا ہی مہمان ہو۔ آپ میری گاڑی میں بیٹھ کر یہاں تک آئی ہیں۔ میری نظر میں اس وقت آپ میری معزز مہمان ہیں اور آپ کی تواضع کرنا میرا فرض ہے، اس کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

”معاف کیجئے گا، آپ کی مدد اور تعاون کے لیے ہم واقعی شکر گزار ہیں، لیکن یہ ہماری مجبوری تھی ورنہ جس خاندان سے ہمارا تعلق ہے وہاں لڑکیاں اجنبیوں سے تواضع نہیں کروائی پھرتیں۔“ اب کی بار مقدس اپنے مخصوص سنجیدہ اور دو ٹوک انداز میں بولی تو وہ مطمئن ہو کر یوں مسکرایا جیسے اب تک کی بڑا مقصد بحث شخص اسے بولنے پر اُکسانے کی ایک کوشش ہو۔

”بجائے ماما آپ نے۔“ اجنبیوں سے گر بڑا اچھی بچیوں کا شیوہ ہے لیکن.....“ وہ لطف لینے لگا مقدس کی برہنہ کا۔ ”اگر وہ واقعی اچھی ہو تو.....“

مقدس سر ابل گئی اس کے فقرے پر، اس نے پہلی بار نظر اٹھا کے سامنے بیٹھے خوش قامت و خوش لباس شخص کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار پڑھ کے وہ مسکرایا۔

”آپ کے بیگ میں میرا کارڈ موجود ہے۔ اس لحاظ سے تو آپ کو مجھے اچھی نہیں کہنا چاہیے۔“ مقدس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ اپنے بیگ کی طرف سرک گیا۔ اسے یاد آیا بے دھیانی میں اس نے یہ کارڈ بغیر دیکھے ہی بیگ کے اندر ڈال لیا تھا۔ وہ بھی شاید اس کی بے اعتنائی جان چکا تھا اس لیے اپنا باقاعدہ تعارف کروانے لگا۔

”مجھے ڈاکٹر خوشنود کہتے ہیں۔ ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں اعزازی طور پر تعینات ہوں۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں اپنا ایک ذاتی کلینک بنانے کا ارادہ ہے۔ آج کل اسی کے سلسلے میں کچھ مصروفیات ہیں۔ لاہور میں ایک ذاتی نوعیت کے کام سے جا رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی شاید لاہور ہی جا رہی ہیں۔“ ان کا تعارف لینے کے بجائے اس نے سرسری سا ایک سوال کیا اور اثبات میں جواب ملتے پر خاموشی سے کافی چنے لگا۔ اگرچہ اس نے دوبارہ ان سے اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس طرح اگر کڑ بیٹھے رہتا مگر ازم شاد سے گوارا نہیں ہوا اور اس نے بھی اپنا تھکا ہوا مقدس نے ایک نظر سامنے بیٹھے اس نہیں طبع شخص کو دیکھا جو اس وقت گرد دھیں سے لاپرواہ نظر آتا ہوا کافی اور اخبار سے شغل فرما رہا تھا اور جس نے تنکھا بھی ایک بار اپنے سامنے بیٹھی لڑکیوں کا نام پوچھ نہیں جانتا چاہا تھا۔ اس کے ہاتھ خود بخود اپنے سامنے رکھے بھاپ اڑا لے تھک کی طرف اٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اورنگزیب سامنے سے آنا نظر آیا۔

”گاڑی آگیا ہے بی بی! وہ جن بس والوں نے ام کو لفٹ دیا تھا انہوں نے ٹائر بدلنے میں بھی مدد کر دی تھی اس لیے ام جلدی واپس آ گیا۔“

”شکر ہے اللہ کا۔“ دونوں جلدی اپنے بیک اور پرس سنبھالنے لگیں۔

”آج زندگی میں پہلی بار میں نے اورنگزیب ماما کی صورت دیکھنے کے بعد شکر کا کلمہ پڑھا ہے۔“ شادور اس کے کان میں گھس کر بولی تو باوجود اس قدر تناؤ کے بھی وہ مسکرا دی۔ خوشنود نے دلچسپی سے سرمئی گرم شال کے ہالے میں لپٹے اس صبحی چہرے سے پوچھتی مسکراہٹ کی کرن دیکھی۔

”چنے اُس کے؟“ (چائے پیو گے) اس کی آفر پہ اورنگزیب تو پچھیل کے بیٹھ جانا چاہتا تھا، لیکن شادور کی کھوپڑیوں سے گھبراہٹ کی نفی میں سر ہلاتا ہوا بیک اٹھانے لگا۔ خوشنود ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں اسے ہاتھ میں ڈیپوزر اسٹیل کپ پکڑے اس طرف آتے دیکھا۔ اس نے زبردستی اورنگزیب کو چائے پکڑائی۔ شادور کے دوبارہ شکر یہ ادا کرنے پہ بھی مقدس چاہنے کے باوجود اسے تھیک یونٹ نہ کہہ سکی۔

☆☆☆

”کون؟ وہ پٹھانی؟“ ان کے پوچھنے پہ ہاشل وارڈن نے سوال کیا۔

”جی میڈم وہی، کیا آپ بتا سکتی ہیں اس وقت وہ کہاں ملیں گی؟“
 ”تم لوگوں کو اس سے کیا کام ہے؟“ انہوں نے الٹا نقشہ شروع کر دی۔
 ”کتنی بار تم لڑکیوں کو تادیب کی ہے کہ شادور کے ساتھ اس قسم کی عداوتیں وغیرہ مت کیا کرو۔ یقیناً تم نے اسے کچھ رقم ادھار دی ہوگی اور اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں لگ رہی۔“
 ”نو میڈم ایسی بات نہیں۔ ان سے کچھ اور کام تھا مجھے۔“ شادور ان کی مسلسل جھٹ پہ زچ ہو گئی۔

”آپ جائیز انہیں بلوادیں یا مجھے بتادیں وہ اس وقت کہاں ہوں گی۔“
 ”وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے غیر حاضر ہے۔ برسوں اطلاع ملی تھی کہ کچھ بیمار وغیرہ ہے، شاید کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ مجھے کچھ صحیح علم نہیں ہے۔“ وہ گول مول جواب دے کے ٹیلی فون کی کڑی نمبر پیش کرنے لگیں۔

”کون سے ہاسپٹل میں؟ کیا ہوا ہے انہیں؟“ مقدس جواب تک خاموشی سے کھڑی دونوں کے چہرے باری باری تک رہی تھی، بے صبری سے کہہ اٹھی۔ وارڈن نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ماؤ تھ پیس پہ ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”میں نے کہا تھا، مجھے علم نہیں۔ تمام ملازمین کی مزاج پرسی اور عیادت میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔۔۔۔۔ ہاں عرفان۔۔۔۔۔ کسی ہیں آپ، ایک کام کہا تھا آپ سے۔۔۔۔۔ وہ رخ موڑ کے مکمل طور پر فون پر متوجہ ہو گئیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ کسی اور سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں۔ شادور نے شانے اُنچکا کے خود پہ ضبط کرتی مقدس کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ وارڈن کی آواز پہ وہ چونک کر مڑیں۔“ اماں برکتے۔۔۔۔۔ یہاں آنا۔۔۔۔۔ ذرا ان لڑکیوں کے ساتھ باہر جا کر بات کر لو اور ہاں شادور یہ اماں اس پٹھانی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اس سے پوچھ لو جو بھی پوچھنا ہے۔“ بڑی جلت میں انہوں نے ریسیور کان سے لگائے ہوئے معاملہ بھگتایا۔

”کی گل اکرے لے۔“ اماں برکتے شادور کو جانتی تھیں اس لیے براہ راست اس سے سوال کیا۔ وہ تینوں اس وقت خنک اور قدرے تاریک کوریڈور سے گزر کر بیرونی دروازے کے ساتھ بنے احاطے میں کھڑی تھیں۔ چمک دار دھوپ نے ایک دم سے سامنے آ کر آنکھوں کو چنوا دیا تھا۔

”اماں وہ جو بچن میں ایک خوبصورت سی گوری چٹی اماں ہوتی ہیں، اماں مومنہ، وہ کہاں ملیں گی اس وقت؟“

”کیوں؟ تمہیں کیا کام ہے؟“ اُف پھر وہی سوال۔

”کام ہے تو پوچھ رہے ہیں ناں“

”اوہ تاں پیارا ہے..... (وہ تو پیار ہے)

”کیا ہوا ہے انہیں؟“ مقدس کو اس آن دیکھی عورت کی بیماری بے چین کر رہی تھی۔

”ابہ.....“ (یہ؟) اماں برکتے نے آنکھوں پہ ہاتھ کا چھپا بنا کر اسے بغور

دیکھا۔ اس کی خنت مزاج آنکھوں میں تعجب کے رنگ واضح نظر آنے لگے۔ شاور نے

اسے پھر اپنی جانب متوجہ کیا۔

”کیا کسی ہاسپٹل میں ہے؟“

”میں نہیں پتہ۔“ وہ یکایک واپس مڑنے لگی۔

”ایک منٹ اماں..... رکیں تو سہی.....“ وہ کہ گئی لیکن شاور کے مقابل کھڑے

ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں بار بار مقدس کے پریشان اور الجھے ہوئے وجود پر ہلکت

جاتی تھیں۔

”آپ دونوں ایک ہی کوارٹر میں رہتی ہیں۔ کئی سالوں سے ایک ساتھ ہیں۔ یہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے بارے میں بالکل بھی کوئی خبر نہ رکھتی ہوں، کہ وہ کہاں

ہیں، کس حال میں ہیں۔“ شاور کے جرح کے انداز پر اماں برکتے میو گئیں۔

”اپنا کام کر کر لے۔ تیرا کی مطلب پٹھانی سے وہ کدر ہے کدر نہیں، تجھے کیا؟“

”اماں ناراض مت ہو۔ دراصل دو سال سے انہیں دیکھتی آرہی ہوں۔ ہم ہاسپٹل

میں رہنے والی تیرکوں کے لیے تو آپ اور دیگر لوگ ہی گھر کے افراد جیسے ہوتے ہیں

ناں۔“ وہ چالچی پائر آئی۔

”بس ان کی بیماری کا شاور پریشانی سی ہوئی۔ آپ سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ

شاید انہیں کسی مددی ضرورت ہو۔ آخر انساں ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اگر آپ بتا دیں

کہ وہ کس ہاسپٹل میں ہیں تو میں انہیں دیکھ بھی آؤں گی اور علاج معالجہ وغیرہ کے سلسلے

میں کچھ مذہبی کردوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔“ اس کے چہرے پہ پھلکی کمال معصومیت

اور لہجے کی انتہا رہے کی منھاس شاید اماں برکتے کو موم روکتی، لیکن سامنے کھڑی مقدس کا

مشکّر چہرہ اور مضطرب انداز میں چٹختی انگلیاں باور کر رہی تھیں کہ بات اتنی سی نہیں۔

”میں یوں بچی نہیں پتا، اوہ کیسے نوں وسدی وی نہیں سی اپنی کوئی گل۔ پر میرا خیال

اے اوہ بن واپس آن نہیں ہے گی۔ ہورے اپنے پنڈ چلی گی ہوئے۔“ (مجھے واقعی نہیں

پتا، وہ کسی کو بتاتی بھی نہیں تھی، اپنی کوئی بات۔ لیکن میرا خیال ہے وہ اب واپس نہیں آنے

والی۔ شاید اپنے گاؤں چلی گئی ہو) وہ تیر تیر قدموں سے واپس اندر کی طرف چلی گئی۔

”کیا کد رہی تھیں؟“ اسے ایک لفظ نہ ملے پڑا۔

”شاید وہ واقعی نہیں جانتیں۔“

”نہیں شانو، انہیں سب پتا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش

کر رہی ہیں۔“ لگ تو شانو کو بھی رہا تھا لیکن اس نے اس کی تائید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”اگر پتا ہوتا تو بھلا وہ ہم سے کیوں چھپاتیں۔“ وہ ہر صورت اس کا دھیان بنانا

چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سوئی بار بار اماں برکتے کی کھوجتی نظروں پہ الجھی ہوئی تھی۔

”پھر وہ مجھے یوں کیوں دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کے

تاثرات بدل سے گئے تھے، شانو تم کہہ رہی تھیں ناں کہ میرے اور ان کے چہرے میں

بے حد مشابہت ہے تو کیا اس لیے؟“

”ہو سکتا ہے..... لیکن اس مشابہت کو بہت کم لوگ محسوس کر سکتے ہیں، خصوصاً وہ جو

تمہیں یا ان خاتون کو بہت قریب سے جانتے ہوں۔ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو

اس چہرے کے میں نقش مجھے چونکا گئے تھے کیونکہ برسوں سے ان نقوش سے میری واقفیت

رہی ہے۔ اسی طرح چونکہ اماں برکتے، اماں مومنہ کے ساتھ گزشتہ کئی سالوں سے رہتی چلی

آ رہی ہیں اس لیے تمہاری صورت دیکھ کے انہیں پہچننا تو ہوا ہی ہوگا۔ ورنہ سرسری سا

دیکھنے پہ یہ مشابہت یوں محسوس نہیں ہوتی کہ ایک تو عمر کا فرق، دوسرے ان کے چہرے کا

ایک تہائی حصہ خاصا جلا ہوا ہے۔“

”اور..... اور..... یہ چہرہ کس نے جلا یا ہوگا؟“ اس نے جیسے ہواؤں سے سرگوشی کی

تھی۔

”پلیز مقدس..... ان سوالوں میں خود کو مت الجھاؤ۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی

ہوں کہ ہم یہاں ایک امید لے کے آئے ہیں۔ اچھے ہوئے دھاگے کا ایک سراڈھونڈنے

لیکن جب تک کوئی بات واضح نہ ہو جائے تم یہ فرض کر کے مت بیٹھ جاؤ کہ وہی تمہاری ماما

ہیں۔“ اسے تابعداری سے سر ہلاتے دیکھ کر اسے ذرا تسلی ہوئی۔
 ”اور ہاں اکیلے مت جانا بائبل، مجھے لائبریری میں بس دس منٹ کا کام ہے۔ میں فارغ ہو کے آتی ہوں تو اکٹھے ہی نکلتے ہیں۔ تمہیں وہاں چھوڑ کے میں زارا کی طرف جاؤں گی۔ اس کے ساتھ ایگزیشن کے کچھ معاملے نمٹانے ہیں۔“

اسے ڈیوڈیم کی سنسن سیز ہوں پہ کم صبر بٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خشک چوں کے کرانے کی آوازیں اس کے خالی دماغ میں گونجیں پھر ایک بھاری مردانہ آواز اسے غائب الدماغی کی کیفیت سے مکمل طور پر نکال لائی۔
 ”السلام علیکم“ اس نے گرد آلود سیز جوں پہ انگلی سے لائنیں کھینچنے کا شغل ترک کر کے سامنے نظر اٹھائی۔ چند لمحے اسے انجان نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ جیسے ہوش میں آگئی۔

”آپ.....؟..... یہاں؟“

”جی..... میں ڈاکٹر خوشنود..... اور یہاں۔“ اس کی آنکھوں میں ششائی کی ہلکی سی رتق پاکے وہ ریلیکس سا ہو کر وہیں ذرا فاصلے پہ بیٹھ گیا۔ ”بڑی کمزور یادداشت ہے آپ کی۔ محض چوبیس گھنٹے پہلے ہونے والی ملاقات بھی آپ کے ذہن سے محو ہوگئی۔“

”جی نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ اب اسے کیا بتاتی کہ ذہن اس وقت کن طوفانوں کی زد میں ہے۔ وہ تو ابھی خود کو پہچاننے کے مراحل سے گزر رہا ہے، کسی دوسرے کا حوالہ کیا یاد رکھے۔ ”دراصل میں آپ کو یہاں دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں ناں پھر یہاں۔“

”میں ایک ذاتی کام سے آیا تھا۔ آپ یہاں پڑھتی ہیں۔“ اس کے سوال کا جواب چپچپے سے آتی شاور نے دیا۔

”جی نہیں، یہ بھی یہاں ایک ذاتی کام سے آئی ہیں۔ نجانے اس ملک کے ڈاکٹروں کو ہم فنکاروں سے کیا کام پڑ گئے ہیں۔“

”السلام علیکم“

”شکر ہے سلام کا جواب تو ملا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ سلام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ میں سلام کا جواب دینے کی بھی روایت نہیں۔“ مقدس اس کا طنز محسوس کیے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”تو آپ بھی ڈاکٹر ہیں، یقین نہیں آتا“ اس نے لائٹ براؤن کڑھائی والی آف وائٹ چادر میں سیلتے سے لپٹی اس مختصر الجودہ لڑکی کو بے یقینی سے دیکھا جو چہرے پہ بے چھائی سنجیدگی اور پُر وقار طریقے سے اوڑھے چادر کے باوجود بھی کم عمری میں ایگری نظر آتی تھی۔

”تقریباً“ اس بار بھی اس کی طرف سے جواب شاور نے ہی دیا۔
 ”یہ زیر قیصر ڈاکٹر ہیں۔ ایم بی بی ایس کے فائل ایئر میں ہے، کنگ ایڈورڈ کالج میں۔“ اس نے مقدس کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے تعارف کا سلسلہ مزید آگے بڑھایا، ”اور میں شاور گل، مقدس کی فرسٹ کزن اور اکلونی فرینڈ، یہاں مئی ایجنیز ڈیپارٹمنٹ میں ہوں۔“

”بے حد خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“ اس نے ہنستے ہوئے تعارف سے اگلی رسم بھی نبھادی۔
 ”آپ لاہور میں کب تک ہیں؟“

”کچھ ہیج اندازہ نہیں کب تک رکتنا پڑے، لیکن اس ایک ہفتے تک تو واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”تو پھر یہ میری طرف سے باقاعدہ انوٹیشن ہے آرٹ گیلری میں، ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایگزیشن ہے پرسوں۔ ضرور آئیے گا۔“

”جی ضرور“ اس نے فوراً ہائی بھر لی۔ بعد میں سارے راستے ہی مقدس اس سے بحث کرتی رہی۔
 ”کیا ضرورت تھی اتنے تفصیلی بیان کی فائل ایئر کی اسٹوڈنٹ کنگ ایڈورڈ کالج۔ مئی ایجنیز ڈیپارٹمنٹ اور تو افسوس میں انوائٹ بھی کیا۔ یہ نہ نہیں کب عقل آئے گی ہر کسی سے ملاؤ فرینک ہو جاتی ہو۔ نجانے کون ہے، کیسا ہے۔ کیا سمجھ رہا ہوگا ہمیں۔“

”اوہ تم کیوں اس قدر پٹنی ہو جاتی ہو اس معاملے میں۔ آخر کسی سے ذرا سا تعارف حاصل کرنے میں کوئی ذاتیات کی حدود میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اس نے ہمارے مدد کی تھی اس بات سے تو انکار نہیں ہے ناں تمہیں، پھر کیا ہوا اگر میں نے اخلاقا اسے انوائٹ کر لیا آخر پرسوں کی ایگزیشن میں شامل سارے لوگ ہمارے واقف کار ہی تو نہیں ہوں گے۔ انجینئروں کا وہاں آنا منع تو نہیں ہے اور پھر..... دو ملاقاتوں کے بعد کوئی

ایتنی نہیں رہتا۔“ شاد کو اس کی انتہا اور بے کی احتیاط پسندی سے چڑھتی۔

”اور پھر وہ کون ہے، کیا ہے اس کا اندازہ تو تمہیں بھی ہو ہی گیا ہوگا۔ اس قدر پوائنٹ، پکچر ڈاؤر ویل میئرڈ شخص کم از کم میں سے تو پہلی بار دیکھا ہے۔ خاتین کا احترام کرنا جانتا ہے۔ تم نے محسوس کیا اس نے ایک بار بھی ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ نام نہیں لیا۔ یہ نہیں جانتا جا یا اس سے ظاہر ہوتا کہ وہ.....“

”پلیز شانو، پلیز اسٹاپ اٹ۔“ اس نے تنگ آ کے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ نہ جانے کیوں وہ اس شخص کی تعریف میں ایک لفظ مزید نہ سننا چاہتی تھی، لیکن بھلا سکی کے چاہنے سے بھی کچھ ہوا ہے۔ ایگزٹیشن والے روز شادور اسے کھینچ کھینچ کر کے اپنے ساتھ لے ہی گئی۔ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس نے مقدس کو زبردستی تیار کیا تھا۔

”یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر دگی۔ اب چھیاں ختم ہونے سے پہلے آ ہی گئے ہیں، محض تمہاری ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کے تو کسی نہ کسی طرح وقت گزارنا ہی ہے۔ وہ تو شکر ہے زارا اور احمد نے ایگزٹیشن کا پروگرام بنایا ہوا تھا ورنہ میں نے تو تمہاری جان نہیں چھوڑی تھی اگر مجھے بوریت کا شکار ہونا پڑتا۔“

”کوئی احسان نہیں کیا تم نے میرے ساتھ آ کے۔ جس مقصد کے تحت میں یہاں آئی تھی، وہ تو اب تک ادھورا ہے۔ تم سب کچھ بھلائے اپنے دوست کے کاموں میں مصروف ہو۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں بھولی نہیں جان، لیکن اس طرح بار بار وہاں جانے کا کیا فائدہ؟ خیر تمہاری تسلی کے لیے کل پھر چلیں گے پتا کرنے۔“ اس نے کسی طرح بہلا پھسلا کے اسے جانے پہ تیار کر ہی لیا۔ وہ جانتی تھی کہ مقدس اس وقت کس ذاتی کیفیت سے دو چار ہے۔ ادھوری معلومات اسے نکلے دے رہی ہیں اور جب تک وہ کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ جاتی یونہی امید و ہم کا شکار رہے گی۔ اب تو خود شادور بھی بے چینی سے اماں مومنہ کی منتظر تھی تاکہ آریا پارکونی تو صل نکلے۔ وہ مقدس کی ماما ہیں یا نہیں، یہ معر تو کھلے۔

”السلام علیکم“ اس بار شادور نے خوشنود کو دیکھ کر پک کے سلام کرنے میں پہل کی۔
 ”علیکم السلام۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شادور کے سلام کا جواب دینے کے بعد مقدس کی طرف دیکھا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“ اب آتی بد اخلاق تو وہ بھی نہ تھی کہ جواب ہی نہ دیتی۔ لیکن مزید

گفتگو سے بچنے کی خطر دانستہ زرخ موڈ کے پیٹنگنڈ دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر خوشنود کو مکمل طور پر مقدس کی طرف متوجہ دیکھ کے شادور جھکی اور کچھ سوچ کے غیر محسوس انداز میں دونوں کے درمیان سے نکل گئی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسانے بڑی دلچسپی سے اس کی بے اعتنائی کے مظاہرہ دیکھنے لگا۔ اس وقت آرٹ گیلری میں موجود ایک سے ایک ماڈرن ازم کی شکار لڑکیوں کے درمیان اس کا سادہ مگر پر وقار و جوداغیرایت کے احساس سے دو چار کر رہا تھا۔ سر کو مکمل طور پر ہر وقت ڈھانپے رہنے والا آنچل، سر کو قدرے اونچا کر کے پیٹنگنڈ دیکھنے کی کوشش میں ذرا سا ڈھلک گیا تھا۔ سہرے بالوں کے درمیان سے نکلتی سیدھی اور شفاف مانگ میں کہیں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ پیشانی کا نور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے نام کے رنگ اس کی شخصیت میں کتنے گہرے ہیں۔ مصنوعی رنگوں سے قطعی بے نیاز لب و زخراغ تقریباً جلد پہ باقوت کی مانند رک رہے تھے۔

”اور آنکھوں میں ترشے ہوئے نیلم اس چہرے کو کس قدر بیش قیمت بنا رہے ہیں۔“ خوشنود نے سوچا۔

”پھر کیا ہے..... کون سا تاثر ہے جو اس اصول تکلیف کو محروم ظاہر کر رہا ہے..... اداسی کی اس کہہ کا سبب کیا ہے جو اس نکھر ہوئی شخصیت کو دھندلائے دے رہی ہے..... وہ کون سی الجھن ہے جس کے الجھاؤ نے اسے گرد و پیش سے اس قدر بیگانہ کر دیا ہے۔“ وہ اس کی کھوئی کھوئی سی کیفیت کا راز کھو بیٹے میں خود بھی کہیں کھوسا گیا۔

کچھ دیر کی خاموشی محسوس کر کے مقدس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا۔ شادور غائب تھی لیکن ڈاکٹر خوشنود ہنوز اس کے عقب میں دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے یک دم زکے پڑے بھی ٹھنک کر کھڑے ہو گیا۔ ان آنکھوں میں سراستگی سی محسوس کر کے وہ کہنے لگا۔
 ”آپ کی کزن غالباً آپ کے کلاس فیلوز کے ہمراہ ہیں۔“

مقدس کو اس لڑکی پہ بے انتہا غصہ آ یا جو ضد کر کے اسے ساتھ لائی تھی اور اب ایتنی لوگوں میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ تنہا ہونے کے بے بسی اس کے ہر نقش سے عیاں ہونے لگی، جسے محسوس کر کے وہ پھر کہہ اٹھا۔

”آپ اپنی دوست پہ اتنا ڈپینڈ کیوں کرتی ہیں؟“
 ”ڈپینڈ؟ جی نہیں میں صرف اس کی عادی ہوں اور کوئی بات نہیں، ہمارا ساتھ کئی برسوں پرانا ہے اور پھر میری کسی سے کوئی خاص دوستی بھی نہیں، اس لیے اس کا میرے پاس

نہ ہونا مجھے کچھ ڈسٹرب کر جاتا ہے۔“ وہ اس کے سوال کا جواب دینے کی پابند تو نہ تھی لیکن اس کے ڈپنڈ کرنے والے الزام نے اسے جزبہ کر دیا تھا۔
 ”اور یہ ڈسٹربس تو آپ پہ مکمل طور پر چھائی ہوئی ہے۔“ وہ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی جھنجھلاہٹ دیکھ کے خاموش ہی رہا۔

☆☆☆

اسے خان افریساب خٹک کے گھر آئے دروازہ گزر چکے تھے۔ اس کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ دراب کو اسے اس طرح پاچا جان کے سامنے لے جاتے ہوئے خوف محسوس ہوا اسی لیے بڑے لالہ کی ہدایت کو کینسر نظر انداز کرتے ہوئے سیدھا زریاب کو یہاں لے آیا تھا۔ خود افریساب، بھائی کا شکوہ وجود دیکھ کے ڈھے گئے۔ ان گزرے دو دشمنوں میں انہوں نے بھائی کی ایک جھلک تک دیکھنے سے اجتناب کیا تھا۔ شروع شروع میں جب بھی کوئی زریاب سے ملنے کی کوشش کرتا اس کی دیوانگی بڑھ جاتی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ افریساب کی ہر اس کوشش کو بھی اس نے سختی سے رد کر دیا، جو انہوں نے اسے بچانے کے لیے کرنا چاہی، وہ اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کی سزا کم سے کم کروانا چاہتے تھے۔ لیکن زریاب نے دونوں الفاظ میں کہہ دیا۔

”میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا، لیکن لالہ مجھے اس کے لیے مجبور مت کرو۔ اس وقت جس چیز کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ موت ہے اور جس چیز سے میں ہر ممکن طرح بچنا چاہتا ہوں وہ زندگی ہے۔ مجھے ان بوسیدہ دیواروں کے اندر گھلنے پڑنے دو۔ یہاں قید میرے وجود کے زندہ ہونے کی خبر تو کسی کو نہ ہوگی۔ خدا کے واسطے لالہ مجھے اشتہار مت بناؤ۔ مجھے روشنی میں لاؤ۔۔۔۔۔ اندھیرے میں پڑا رہنے دو اور دعا کرو کہ یہ دیواریں میرا بھرم رکھ لیں۔ مجھے زندگی کی طرف کھینچ کے لانے کی کوشش مت کرو۔۔۔۔۔ میری موت کی دعا کرو۔ باعث موت کی۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ اگر مجھے دوبارہ باہر لانے کی کوشش کی تو۔۔۔۔۔ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔ مجھے حرام موت کی طرف بڑھنے پہ مجبور مت کرو لالہ۔“ اس کے جنون اور دیوانگی سے گھبرا کر خان افریساب نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا، لیکن وہ اس کی موت کی دعا نہ مانگ سکے۔ بس بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔۔۔۔۔

وقت جو تلخ سے تلخ زہر کو بھی بے اثر کر دیتا ہے۔ وقت جو بھیانک سے بھیانک تر نکس پی بھی گرد کی تہ جمادیتا ہے۔

وقت جو گھر سے گھر لے کھاؤ کو بھی بھرتا نہیں تو کھر ٹوٹو ضرور لے آتا ہے۔
 وقت شاید زریاب کے زخموں کو بھی کھر ٹنڈ آچکے تھے۔ ان سے خون تو اب بھی رستا تھا، لیکن اس طرح بہتا نہیں تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں دیوانگی اب بھی ٹکریں مارتی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ شدتیں ناپید تھیں جو اسے دیواروں سے سرکراتے پہ بھجور کرتی تھیں۔ اس کے لب سسکیاں دبا دبا کے صمرا ہو چکے تھے۔ آہیں بھر بھر کے اس کی سانس کے رستے زخمی ہو چکے تھے۔ لیکن جیشیں گونگی ہو گئی تھیں، دھنساں لنگ رہ گئی تھیں اور۔۔۔۔۔ موت کی خواہش خود ہی مر چکی تھی۔

افریساب نے قسمت سے ہارے اپنے ماں جائے کو ہاتھوں میں بھیج لی۔ اپنے خون کی حرارت نے زریاب میں زندگی کے کچھ آثار پیدا کیے۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو سب سے پہلے اسے یہ خیال آیا۔

”مجھے یہاں کیوں لائے ہو دراب؟ وہ پاچا جان۔۔۔۔۔ بی بی جان؟“ اسے اندیشہ سا گزرا۔ کہیں۔۔۔۔۔ ”آہ۔۔۔۔۔ اپنی ذات کے ساتھ الجھتے ہی اتنے برس گزار دیے، ان ہستیاں کو کوئی خیال تک نہ آیا جو اس ذات سے وابستہ ہیں۔“ اسے ندامت نے آن گھیرا۔

”پاچا جان اور بی بی جان۔ کیا وہ تمہیں اس حال میں دیکھ پائیں گے زریاب، بیس سالوں کا صبر ایک ہی پل میں کھودیتے وہ تمہارا یہ حال دیکھ کر، کتنے بدل گئے ہوتم۔“
 اس نے اپنے سامنے بیٹھے افریساب لالہ کو نظر بھر کے دیکھا جن کا بھی وہ پاچا جان کے بعد سب سے زیادہ احترام کیا کرتا تھا اور ان سے ڈرتا تو وہ شاید پاچا جان سے بڑھ کے تھا۔ آج بھی ان کی شخصیت کے رعب کا وہی عالم تھا۔ بلکہ ہلکے بھورے بالوں میں جگمگاتے جامد کی تاروں نے اور بھی دبدبہ قائم کر دیا تھا۔ سنجیدہ تاثر دیتی آنکھیں، کناروں پہ پھیلے لکیروں کے ساتھ اور بھی سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔

زریاب نے نظر اٹھا کے ذرا فاصلے پہ کھڑے دراب کو دیکھا۔ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں بھر چکا تھا۔ نوکدار مونچھیں تو اس کی پہلے سے تھیں اب دائمی کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ البتہ سر کے بال خاصے چمڑے تھے، جن کی وجہ سے اٹھا اور کھلا لگا لگا رہا تھا۔

وہ کسی کے لیے کتنی ضروری بن گئی ہے۔“ اس نے خدا سے دعا کی، کوئی معجزہ ہی ہوتا جو اسے مقدس کے آگے اظہار کی طاقت دے پاتا، ورنہ اس کی حدود درجے نیازی اور لاطین سارویہ خوشنودی ہتھیں پست کر دیتا تھا۔

پردہ ہی نہیں اسے کسی کی اپنے سے وہ کتنی اجنبی ہے وہ غنچہ دہن سکوت زادی کھلنے پہ بھی کم ہی بولتی ہے

☆☆☆

”تمہیں کیا میری بات کا بالکل بھی اعتبار نہیں رہا جو خود چلی آئی ہو۔“ شادو اسے اپنے انتظار میں ٹھٹکا دیکھ کے مل ہی تو گئی۔
”پھر کیا کروں میں؟“ وہ نے کسی سے بولی۔
”تین دن سے تم یہی کہہ رہی ہو کچھ پتا نہیں چلا، کوئی خبر نہیں ملی۔ آخر کب تک میں“

”وہ اماں برکتے تو اب میری صورت دیکھ کے بھڑک جاتی ہے۔ ویسے جس انداز میں وہ جھنجھلاتی ہے میرے سوال پر۔ اس سے مجھے تمہارا شب کچھ یقین میں بدل نظر آتا ہے کہ واقعی وہ جانتے ہو مجھے انجان بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ صبح بھی مجھے دیکھتے ہی رخ بدل کے دوسری جانب چل پڑی۔ صاف لگ رہا تھا مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ کسی کام سے ہاسل سے باہر چلی گئی ہے۔“

”اوہ، تو تمہیں پیچھا کرنا چاہیے تھا نا اس کا۔ کیا پتہ وہ انہی سے مل گئی ہو۔“
”چھپا کرنا چاہیے تھا، پائل ہوئی ہو کیا، اب میں مایوں کا پیچھا کرتی پھر دو۔“ وہ گز کے بولی۔

”تم سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں خود آئی ہوں آج۔ کاش کچھ دیر پہلے آ جاتی تو..... مجھے یقین ہے وہ اماں ہم سے کچھ چھپا رہی ہے۔ لیکن میں بھی اس سے ضرور اگلا کر رہوں گی۔ اس ایک بار مجھے پتا چل جائے کہ کیا واقعی وہ..... میری ماما ہیں یا نہیں۔“
”اچھا یہ بتاؤ کچھ کھاؤ پیو گی یا یہی باتیں کرنے آئی ہو؟“ شادو نے اس کا دھیان

بٹانا چاہا۔

”میرے پاس فی الحال اس موضوع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جج پوچھو تو میں اس بار لاہور بھی صرف اس لیے آئی تھی شادو نے جس وقتی کیفیت سے میں گزر رہی ہوں اس میں کالج جانا بھل وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہیں میرا یہاں آنا ایک کارزیاں نہ ثابت ہو۔“

”آف خدایا، کس قدر مشکل الفاظ بولنے لگی ہو تم۔ غالباً تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر وہ خاتون تمہیں نہ ملیں تو تمہارا لاہور آنا بے کار جائے گا، ہے ناں۔“ وہ تھد تھد کے لیے لڑی۔

”تو مائی ڈیزیز کزن یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بار کے تمہارے لاہور کے سفر نے تمہاری تقدیر میں کچھ اور لکھ دیا ہو۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً.....“ وہ رک کے سوچنے لگی کہ کہے یا نہ کہے حالانکہ یہ بھی غیر معمولی بات تھی کہ شادو اور کچھ کہنے سے قبل سوچنے کی زحمت کرے۔ پھر اپنی ازلی بے دھڑک انداز میں کہہ اٹھی۔

”مثلاً ڈاکٹر خوشنوو۔ نہ تم لاہور آنے کا اتنا اچھا یک فیصلہ کرتیں، نہ ہم بائی روڈ سفر کی مصیبت مول لینے اور نہ ہی وہ..... مانوس انجینیئر لگتا۔“
”واٹ ریش؟ تمہیں پتا ہے تم کیا بک رہی ہو؟“ حسب توقع مقدس کی گلابی رنگت غصے کی حدت پا کے اناری ہو گئی۔

”سب پتا ہے۔“ وہ اس کے بلند لہجے کے رعب میں قطعی نہ آئی۔

”اور تم جانتی ہو کہ تمہاری ہر بات کا پتا پہلے مجھے چلتا ہے بعد میں تمہیں۔ بلکہ جب تک میں تمہیں نہ بتاؤں تمہیں تو یہ بھی خبر نہ ہو کہ تم سوچ کیا رہی ہو اور چاہتی کیا ہو۔“
”تو تم بھی سمجھتی ہو کہ میں تم پر پینڈ کر لی ہوں۔“ اس کے اس قدر دست اندازہ لگانے پر مقدس تھلائی۔

”میں بھی.....؟“ شادو ”بھی“ پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔

”تو گویا کوئی اور بھی ہے جو اس راز سے واقف ہے۔“

”فضول باتیں مت کرو۔ بات کوئی ہو رہی ہو تمہیں ضرور سچ میں اپنی بے ہودہ

”کدوں؟ میں کدوں گئی کتھے؟“ (کب میں کب کہیں گئی ہوں؟) وہ آئیں بائیں
شاہیں کرتے لگئیں۔

”آپ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہیں۔ کیوں نہیں مجھے بتا دیتیں ان کے بارے
میں۔“ وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ شاد بھی قریب چل آئی۔
”اور اماں، یہ شخص کون تھا، تمہارا کیا لگتا ہے؟ کہاں گئی تھیں تم اس کے ساتھ۔؟“
اس نے بھی اماں پر رکتے کو گھیر لیا تو وہ ہتھے سے ہی اکڑ گئی۔ اچانک مقدس کے حلقے نے
اسے چونکا ضرور دیا تھا۔ لیکن ذرا سنبھلنے کے بعد وہ پھر اپنی جون میں آ گئی۔

”پراس ہٹو کر پو، قانے دارنیوں، کتھوں آسکیاں میں میرے نال پچھ پریت کرن
والیاں، ہنیرای نہیں دی کہ نہیں، مانا لگدا ایوے او بندہ تھا ڈاتے نانی لگتی آں میں ہنیروی
تھانوں تلی کر اوان۔“ (مرے ہٹو کر یوں، قانے دارنیوں، کہاں سے آ گئی ہیں، مجھ سے
پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔ کسی غیر نہیں سکھائی تھیں۔) وہ تمہارا مانا لگتا ہے یا میں تمہاری
نانی گئی ہوں جو تمہارے سوالوں کے جواب دوں) وہ ہر طرح جھڑکتی آگے چل پڑی۔
”لوکر والی عزت افزائی۔“ شاد نے اسے جتایا۔

”ویسے بید، واقعی سوچنے والی بات ہے ڈاکٹر خوشنود کا اس مائی سے کیا تعلق؟
تمہارے پاس تو کارڈ بھی تھا ناں ان کا۔ اس بھڑکیلی اماں سے سر پھوڑنے کے بجائے تم
انہی سے پوچھ لو۔ شاید کوئی سرا ہتھ لگ جائے۔ نہی ہو تو کم از کم تمہاری تسلی تو ہو جائے
گی۔ ہو سکتا ہے وہ محض انسانی ہمدردی کی بنا پر اسے لفٹ دے بیٹھے ہوں یا اس کی کسی
عزیزہ کا مفت علاج معالجہ کر رہے ہوں۔“ شاد کی عادت تھی وہ ہمیشہ مسئلہ پیش کرنے
کے ساتھ ساتھ اس کے کئی ایک حل بھی بتا دیتی تھی۔ یا یوں کہیے کہ کسی بھی بات کے مثبت و
منفی پہلو دونوں ہی سامنے رکھ دیتی تھی۔

”ڈاکٹر خوشنود بلی وردگ۔“

کارڈ پر لکھے نام پر سرسری کی نگاہ ڈال کے وہ نیچے درج فون نمبر کی جانب متوجہ ہوتا
چاہتی تھی لیکن خوشنود کے نام کے آگے لگے حوالے نے اسے ٹھنڈ کر دیا۔ خوشنود کا ”وردگ
ہونا پڑا سر اسرا خاتون کا مومنہ ہونا، ثابت کر رہا تھا۔

”ہیلو ڈاکٹر خوشنود اسپیکنگ۔“

”ہیلو۔۔۔۔۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

ریسرچ پیش کرتی ہوتی ہے۔“
”تم چاہے اسے بے ہودہ ہو یا فضول۔ لیکن دیکھ لینا میری اس ریسرچ کا رزلٹ سو
فیصد درست نکلے گا۔ ڈاکٹر خوشنود کا بار بار تم سے ٹکراتا ہے مقصد نہیں ہے۔“

”مت بھولو کہ ہر بار میرے ساتھ تم بھی ہوتی ہو۔“ اس نے باور کرایا۔
”میں تو نہیں بھولی، لیکن کیا کروں ڈاکٹر صاحب کو بھی یاد نہیں رہتا کہ تمہارے
ساتھ، میں بھی ہوتی ہوں۔ بلکہ وہ تو مجھیں دیکھ کے شاید خود کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔“
”تم یہاں بیٹھ کے اس خود ساختہ فلمی کہانی میں رنگ بھرنا اور جسکے لے لے کے سوچو
جو بھی سوچنا ہے۔ کم از کم میرے سامنے یہ بات امت کہنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں
ہوگا۔ سمجھیں۔“ وہ بیک کا نہ ہے پہ لٹکا کے کھڑی ہو گئی۔

”ارے۔۔۔۔۔ ارے رکو تو۔۔۔۔۔ اور وہ رک گئی۔ شاد کی آواز پہ نہیں پارنگک میں
کھڑی سلور گرے کرولا سے آرتی اماں پر رکتے کو دیکھ کے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اور کوئی
نہیں، خوشنود تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی اس کا درواز
قد، اور غیر معمولی چوڑے شانے اسی کا شاید دلار ہے تھے۔ باہر کی طرف نکلتی مقدس نیم وا
بڑے سے گیٹ کی اوٹ میں ہو گئی۔ اماں کا رے نکلنے کے بعد بھی ہنوز پچھلی سیٹوں سے
کچھ سامان نکالنے میں مصروف تھی۔ آخر کار وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔
ڈاکٹر گرے ٹوپیں سوٹ کے ساتھ بلیک شرٹ اور بلیک ہی سن گلاسز بھی وہ واقعی خوشنود
تھا۔ اس نے جھک کے اماں کو سامان اٹھانے میں مدد دی دو شاہنگ بیکیز میں زنانہ سوٹ
تھے جو شاید استعمال شدہ لگ رہے تھے۔ باسکٹ میں قرم اس اور چند برتن، ایک ٹشو پیپر
کے ڈبے کے ساتھ رکھے تھے۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد اماں اچانک رکی، جیسے کچھ یاد
آ گیا ہو، پھر اپنی عادت کے مطابق بلند آواز میں پوچھنے لگی۔

”میں تمہارا پتر، اسے اس جگہ کھانا پینا تے محس، کہ میں سویرے بخنی تے دلیہ بنالیا
واں؟“ (میں نے کہا بیٹا، ابھی اس نے کچھ کھانا پینا تو نہیں؟ یا پھر میں صبح بخنی اور دلیہ
بنالیاؤں) نبھانے خوشنود نے کیا جواب دیا تھا۔ مقدس اماں کو گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھ
کے پیچھے ہو جانے کی وجہ سے صبح سن نہیں پائی۔

”کون سے ہا پٹیل سے آ رہی ہیں آپ اماں؟“

مقدس نے اچانک سامنے آ کر اماں پر رکتے کو گڑ بڑا کر رکھ دیا۔

”آپ.....“ اسے گمان ساگزرا لیکن اپنی خوش بختی کا اتنا یقین نہیں تھا کہ وہ پورے وثوق سے اس کا نام لے سکتا۔

”السلام علیکم“ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اپنا تعارف کیسے کرانے۔

”وعلیکم السلام، مقدس؟“ اس نے آس و امید سے چور چور لہجے میں پوچھا۔

”جی.....“ اسے اپنے ہونے پر شرمندگی تھی یا پھر شاید فون پر ہونے کی۔

”زے نصیب، کیسے کیسے یاد کیا؟“

”مجھے آپ سے ایک کام تھا۔“ وہ براہ راست اپنے دعا براہ آگئی۔

”میری خوش نصیبی کہ اب آپ کو بھی مجھ سے کام پڑنے لگے۔“ اس کا چکنا مقدس کو ایک آنکھ نہیں بھارا تھا، اس نے چڑ کے موبائل آف کر دیا۔ خوشنود کے مسلسل سکرانے لب یکدم سکر گئے۔

”تف ہے تم پر ڈاکٹر ورگ، ایک لڑکی کا فون کیا آگیا، باجیس چیر چیر کے ڈانسیا لگ بھانڈنے لگے، یہ احساس کیے بغیر کہ مخاطب ایک مقدس ہستی ہے۔“ اس نے اپنے اندر گنگنا تے جذبے کو ڈنسا اور پھر سے اپنی سویرو سنجیدہ جون میں آتے ہوئے سی ایل آئی پر نمبر چیک کیا۔

”پیلو“ زندگی سے بھر پور آواز شادو کی تھی۔

”مس شادو میں ڈاکٹر خوشنود بول رہا ہوں۔ ابھی چند منٹ قبل اس نمبر سے مس

مقدس نے مجھے کال کی تھی۔“

”جی جی..... وہ بس..... اچھا آپ بات سمجھتے۔“ اس نے زبردستی مقدس کے کان

سے موبائل لگایا۔ شادو کی بے موقع تمسکراہٹیں اسے زہر لگی رہیں۔

”جی مس مقدس، ہمیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ دوسری طرف سے

آتی سنجیدہ آواز نے اسے دوبارہ بولنے پر آمادہ کیا۔

”میں صرف یہ جانتا چاہتی تھی ڈاکٹر خوشنود کہ اماں برکتے..... شادو کے ہاسٹل کی

ملازمہ کے ساتھ آپ کون سے ہاسٹل گئے تھے؟“ بغیر کسی تمہید کے اس نے سوال کر دیا۔

”جی.....؟“ حیران تو وہ پہلے ہی تھا کہ ریزروسی رہنے والی اس محتاط مزاج کی لڑکی کو

اس سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے لہجے میں موجود استعجاب یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مقدس

کا یہ اچانک سوال اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ اس کو سننے میں چند سیکنڈ لگے لیکن وہ

دوسرے سوال سے خود کو روک نہ پائی۔

”اگر میرا سوال بہت زیادہ ڈالی نہ ہو تو کیا میں یہ جان سکتی ہوں کہ اماں برکتے

ساتھ رہنے والی خاتون سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“ اس کے ہنسنے ہوئے لہجے پر وہ مزید

ٹھٹھکی کا۔

”یہ سوال تو میں بھی کر سکتا ہوں، لیکن چونکہ آپ نے پہلے پوچھا ہے تو میں بتا دوں

کہ میں شیخ زائد ہسپتال میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمود غوری سے ملنے گیا تھا، وہاں ایک

مریضہ کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ میرے علاقے کی ہیں اور ہم لوگ اپنے علاقے کی

رعایا کا خیال رکھتے ہیں، یہ ہمارے بزرگوں کی روایات ہیں۔ محض انسانی ہمدردی اور کچھ

اپنی ذات قبیلے کی ہونے کی وجہ سے، میں نے ڈاکٹر محمود سے ان کے علاج معاملے کی

خصوصی درخواست کی اور ان اماں جی کو بھی صرف اخلاقی ہاسٹل تک لفٹ دے دی تھی۔

اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کو اصل امتزاج کس بات پر ہے، ان اماں جی کو لفٹ دینے پر یا

ان اماں جی پہ توجہ دینے پر۔“

وہ شاید اس توجہ پر گمان ہی لیتی اگر خوشنود کا ورگ ہوتا اس پہ کل نہ گیا ہوتا۔ اس

لیے قصداً اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ شیخ زائد ہاسٹل میں کس وارڈ میں مل سکیں گی.....

پلیز.....“ اس کے بے تاب لہجے میں محنتی اکتھا ڈاکٹر خوشنود کے ٹھکے ہوئے دل کو پھر سے

چونکا گئی۔ اس نے کچھ سوچ کے کہا۔

”ایسا سمجھتے ہیں مجھے وقت بتا دیں میں آپ کو لے چلتا ہوں ان کے پاس۔“

”نہیں..... میں صبح دس بجے ہاسٹل پہنچ جاؤں گی۔ آپ بس مجھے ان سے ملوادیتے

گا۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے لائن ڈس کنکٹ کی، دوسری جانب ریسور

ہاتھ میں لیے ڈاکٹر خوشنود کے چہرے پہ تعجب اور الجھن کے اثرات نمایاں تھے۔

☆☆☆

”زریاب.....!“

آج فجر سے سے علی بی بی جان کے دل کو جیسے پیٹنے لگے ہوئے تھے کبھی ادھر کبھی

اُدھر۔ ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ ظہر کی نماز ادا کر کے وہ آج اوپر اپنے

کمرے میں آرام کرنے چلی گئی تھی، ورنہ ہمیشہ ہی وہ مغرب کے بعد اپنے کمرے کا رخ

کرتیں۔ ان کا ٹھکانا دن بھر لاؤنج میں بچاؤ جہازی سازتخت ہوتا جہاں سے وہ با آسانی دن میں کئی کئی بار اٹھ کے پاچا جان کے کمرے تک ہوا کرتے۔ لیکن آج تو انہوں نے اپنے خانہ جی کے کمرے میں بس بیچ ایک ہی بار جھانکا تھا۔ بستر پر جسے وحشت حرکت پڑے لائے مگر خفیف سے وجود کی گدلی آنکھیں جھٹ پہ گئے پچھلے پہنچیں۔

”خانہ جی!“ انہوں نے آواز دی۔

”زریاب!“ کھٹی کھٹی سانسوں پر ڈولتا یہ تاہم ان بوڑھے لوں سے آزاد اور خطر سے بس آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ بی بی جان کو دھچکا سا لگا اور پہلی بار..... پہلی بار وہ خانہ جی کے کمرے کو کوئی دلا سدیے بغیر، کوئی خوش آمدند نہ سنائے بغیر وہاں لوٹ گئیں۔ آج تو انہیں خود کسی تسلی بھرے ہاتھ کی ضرورت تھی، چلتے خڑے پہلو پر اپنے بچے پر سر رکھا ہی تھا کہ پیچھے مردان خانے سے کچھ شور مٹا دیا۔ عموماً فریاد کے آنے سے اس طرح ہلکا کر چا کرتی تھی اس کی سرکاری گاڑی کے ساتھ گاڑا زور مگن مین کا ایک ریلوے بھی تو ہوتا تھا انہوں نے لینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اٹھ کے بیٹھ گئیں۔ ابھی اپنی بڑی سی چادر پھیلا کے شانوں پہ ڈال ہی رہی تھیں کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا ان کی پرانی ملازمہ دگر حواس باختہ سی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اندر گھس آئی۔ بی بی جان نے اس کی جسات کو ٹالنے نہ دیکھا۔

”ولے ہے؟“ (کیا ہے لڑکی؟)

”زریاب لالہ رانگلے۔“ (زریاب صاحب آگئے۔)

”ولے؟“ (کیا؟) وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”سوئے زریاب؟“ (کون زریاب؟)

”خانہ جی۔“ (ہاں جی)

انہیں کچھ بتانہ چاہا کہ وہ کمرے سے نکلیں کب بیڑھیاں اتریں اور کب وہ اس کے رو برو ہوں۔

”زریاب.....!“

انہوں نے سامنے کھڑے شگرت و جود والے ہارے ہوئے انسان میں وہ شہزادوں کی سی چھب ڈھونڈنا چاہی۔ ان چمکتی آنکھوں میں ہر دم ہلکے لیتا وہ معصومیت بھرا تجسس تلاشنا چاہا وہاں فقط ٹوٹے ہوئے آئینے کی چریاں تھیں۔ وہ تہذیب کے کھڑی رہ گئیں دل کی طرح ماننے کو تیار نہ تھا یہ وہی خانہ جی زریاب خٹک ہے جسے وہ آنکھ بھر کے دیکھتے بھی

گھبراتی تھیں۔ مبادا اپنی ہی نظر لگ جائے۔ زریاب اپنا کرچی کرچی وجود خود ہی سمیٹ کے بی بی جان کے گنگے لگ گیا۔ ان کے بازوؤں نے بڑھ کر اسے سمیٹا مٹا کے گرم جوش سینے سے لگ کے برسوں سے ٹھنڈا پڑتا خون پھر سے اُبل پڑا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اپنے ہی آنسو اس کے لیے اجنبی اجنبی سے تھے۔ وہ تو کب سے نہیں رویا تھا، کب سے نہیں بٹھا تھا۔ بلکہ اس نے تو بہت عرصہ پہلے ہی وہ سب کرنا چھوڑ دیا تھا جس سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا۔ حضرت بی بی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھما اور کپکپاتے لہجے میں کہا۔

”میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ خانہ جی کا سامنا کیسے کروں۔ ان کی آنکھوں کے سوال اب مجھ سے ٹالے نہیں جاتے تھے۔ اللہ نے مجھ پہ کرم کر دیا اب میں خانہ جی کے پاس جاؤں گی، ان کا زریاب لے کر۔“

☆☆☆

طویل کوریڈر سے گزرتے ہوئے خوشنود اور مقدس دونوں ہی متضاد کیفیات کا شکار تھے۔ خود سے دو قدم کے فاصلے پہ موجود مقدس کا سنا سنا وجود خوشنود کو اک خواب سا لگ رہا تھا، اس کے ذہن میں بہت سے سوال کللا رہے تھے، لیکن ان بہم سوالوں کو زبان دے کر وہ اس خواب سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔ اسلام آباد سے سگاپور روانہ ہونے سے ایک روز قبل ہی اس خط کا ملنا شاید اس خواب کی تہہ کی۔

لاہور پہنچنے سے قبل ہی اس اتفاق ملاقات نے اسے پہلی بار اک خواب دیکھنے پہ اکسایا۔

ابھی تو اس نے دل کی باتوں میں نہ آتے ہوئے خواب دیکھنے سے ہر ممکن احتراز کیا تھا کہ چند اور حادثاتی ملاقاتیں آنکھوں کو خوابوں کا ذائقہ زبردستی سونپ گئیں۔

اس کو خود سے محکوم ہوتے دیکھنے کا خواب.....

اس کے ہمراہ قدم بہ قدم چلنے کا خواب.....

اور..... اور وہ دیکھنا چاہتا تھا یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔

مقدس کا ہر اختتام قدم کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیتا تھا۔ آج وہ ایک ایسی ہستی کو دیکھنے جا رہی تھی جو شاید کسی بھی انسان کی دنیا میں سب سے قریبی اور عزیز ترین ہستی ہوتی

ہے۔ آج سے کچھ دن پہلے اس نے بھولے بھٹکے بھی کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اس

ہستی سے مل پائے گی۔۔۔۔۔ اس ہستی کا اس دنیا میں وجود ہے بھی یا نہیں۔

اور پچھلے کچھ دنوں سے وہ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے، اسی ایک ہستی کو سوچ رہی تھی،

اس کے بیکر کو تصور میں تراش رہی تھی اور آج۔۔۔۔۔ آج محض چند قدم کے فاصلے پہ۔۔۔۔۔

چند سائمتوں کے بعد وہ اس کے زور بد ہوگی۔ خوشدو کے تھمتے قدموں نے اسے بھی زک

جانے پر مجبور کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے اشارے پہ آئی کسی

پوکی گلاس وال کے آگے کھڑی ہو گئی۔

ایک۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ تین اور نمبر تین بیٹھ پہ اس کی مشاکی نظر س جم گئیں۔ آکسیجن

ماسک سے ڈھکا وہ چہرہ صرف ایک ہی رخ سے نظر آ رہا تھا لیکن مقدس کو اس چہرے سے

آشنائی حاصل کرنے کے لیے ایک ہی نقش کا ہی تھا۔ وہ دھیسے سے چبکتی ہوئی چند قدم آگے

سر کی لیکن وہاں سے یہ ادھورا عکس بھی نظر آنا بند ہو گیا وہ پلٹ کے پھر سے اپنی جگہ پہ آئی۔

خوشنود حیرت زدہ سا اس کی بے تمایاں جھنجھکی کو کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھا کے

ڈیوٹی پہ موجود سز سے اجازت طلب کی اور اسے اندر لے آیا وہ کسی معمول کی طرح اس

کے پیچھے چلتی بیٹھ نمبر تین کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

کھڑی مغرور ناک اور گداز کناؤ دار لیوں والے چہرے پہ عمر نے اتنے اثرات

نمایاں نہیں کیے تھے جتنے کہ بیمار یوں نے، یہ اس چہرے کی جھمیر یوں سے پاک شفاف جلد

سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن نیلے پڑتے ہونٹ، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور ہاتھوں

بیروں کا لاغر پن اس بات کا گواہ تھا کہ دل کا یہ شدید دورہ پہلا حملہ نہیں تھا اور ایک طرف کا

زخماں۔۔۔۔۔ جلے ہوئے نشانات لیے بنجانے کن کہانیوں کو چھپانے ہوئے تھا۔ اس نے

ہولے سے اس چہرے کو چھونا چاہا۔ ان سیاہ پڑتے تھکے ماندے لرزتے پتھلوں کے نیچے کیا

اب بھی شہد کی جھیلیں آباد ہیں۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

”ممہا!“

اور۔۔۔۔۔ خوشنود علی وردگ کا خواب ٹوٹ گیا۔

اپنے خیالوں میں گم کھڑی مقدس خوشنود کے چہرے کا بدلہ رنگ دیکھ سکی، نہ جھجک

کے وہ قدم پیچھے ہٹا محسوس کر سکی۔ اس کی تمام تر حیات تو سامنے موجود مومنہ علی کی طرف

متوجہ تھیں اپنے پیچھے لیے لیے ڈگ بھر کے واپس جاتے ڈاکٹر خوشنود کی طرف تو اس کا
دھیان ہی نہ گیا۔

☆☆☆

”سب کچھ کتنا واضح تھا، بالکل صاف۔۔۔۔۔ بنجانے مجھے کچھ میں وقت کیوں لگا۔ اتنا

وقت۔۔۔۔۔ اتنے وقت میں تو اب۔۔۔۔۔ اب کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔“ اپنی سی بک

اپنے کمرے میں آ کے خوشنود نے سرے سے اس سارے قصے کو بھٹکا چاہا۔

”تو وہ ان کی بیٹی ہے، یعنی صرف ان کی نہیں بلکہ خان زریاب خٹک کی۔

کیا ضرور اسے ہی خٹک خاندان کی بیٹی ہونا تھا؟

اور کیا یہ بھی ضروری تھا کہ اس شخص کا حوالہ اس کے ساتھ ہوتا؟

اور ضروری تو یہ بھی نہیں تھا کہ ساری دنیا چھوڑ کے تمہارا دل ایک اسی لڑکی پہ آتا

ڈاکٹر خوشنود علی وردگ۔۔۔۔۔

لیکن۔۔۔۔۔

تقدیر اپنے فیصلے، سارے نفع نقصان ذہن میں رکھ کے نہیں کرتی۔ اسے چھپدے گیاں

پیدا کرنے کا شوق ہے۔ اچھی بھلی سیدھی سادی چلتی کہانی میں نیا موز لانا تو قسمت کی

برائی عادت ہے۔“ وہ بے بسی سے آنکھوں پہ بازو رکھ کے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی

کوشش کرنے لگا کہ اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ خون کا معاملہ تھا۔۔۔۔۔ خون کا

نردنگ بدلا جاسکتا ہے نہ تاثیر۔

مقدس کی رنگوں میں دوڑنے والا خون اس شخص کا تھا جس کے ہاتھوں میں فیروز علی

وردگ کا خون لکھا تھا۔ اور فیروز علی وردگ کا خون خود خوشنود علی وردگ کے جسم میں تھا جس

مار رہا تھا۔

خون کی یہ تاثیر تھی کہ جس کے خوف سے اس کی ماں لائٹی بی بی نے اسے اپنی

آنکھوں سے دور کر لینا گوارا کر لیا۔ وہ ڈرتی تھیں کہ سید و شریف کی نفاذوں میں موجود

فیروز کی جوان اور المناک موت کے نوے کہیں کچے ذہن کے خوشنود کو اس راہ پہ نہ

چلا دیں جس پہ چلنا بچتوں اپنی شان تصور کرتے ہیں ایسے میں وہ خود کو صرف ایک غیرت

مند بچتوں کی حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ وہ کسی کا سہاگ بھی ہیں،

کسی کی گود کا بچھل بھی ہیں، کسی بہن کی تمام تر امیدوں کا مرکز بھی ہیں۔

لائی بی بی خود بھی ایک جلی بخون زادی تھی، آن، بان اور وقار پہ سب کچھ نچھاور کر دینے والی لیکن مٹا کا جذبہ کب اس کے سارے جذبات پہ حاوی ہو گیا اسے پتہ ہی نہ چلا وہ شوہر کے بعد اب بیٹے کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی، پھر فیروز کے ساتھ سات سالہ رفاقت نے اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ خود فیروز اپنے قبیلے کے دیگر مردوں سے کس قدر مختلف المزاج ہے۔ اپنے بھائیوں کی ناست وہ اپنے کسی بیٹے کے سبیلے بارگاز کرنے پہ چشمنانے کے بجائے اس کی تعلیم پہ زیادہ توجہ دیتا۔ اس نے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلا کے کچھ بنانے کا خواب دیکھ رکھا تھا۔ اس حقیقت سے سب ہی واقف تھی۔ لائی بی بی نے سرسوار باپ کے آگے گزرا کے فیروز کے خوابوں کو پورا کرنے کی بھیک مانگی، انہیں احساس دلایا کہ فیروز جیسے بھتوں سے گندھے حس شخص کی روح کی تسکین اس کے خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہے، نہ کہ خون کی ندیاں بہا کے جذبہ انتقام کو پورا کرنے میں، لڑکپن میں ہی بیرون ملک حصول تعلیم کے لیے چلے جانے والا خوشنودی تمام تحقیقوں سے آگاہ تھا۔ اس کا باپ عین عالم شباب میں محض ایک عہد کی بامداری میں اپنے سب سے قریبی دوست کے ہاتھوں، غدار کی اور بے وفائی کا مکروہ الزام لے کر مارا گیا۔ لیکن وہ عہد کیا تھا اور وہ الزام کیا تھا۔ اس سے وہ اب تک انجان ہی رہا۔ اس کی ماں اسے ہر بات سے انجان ہی رکھنا چاہتی تھی، وہ تو شاید یہ سب بھی اس تک نہ پہنچنے دیتی لیکن دادا اور چچاؤں کی جانب سے اسے ہمیشہ اُسکادینے والی معلومات ملتی رہیں وہ خود بھی اب تک دل میں بدلے کی چنگاری سلگنے بیٹھے تھے اور فیروز کے اکھوتے بیٹے کی جانب سے بھی ایسی ہی خاندانی شان و جلال کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن لائی بی بی کا فیصلہ بروقت تھا اور اقدام بالکل درست۔ آ زاد فضا کی وسیع انتظری نے اس کے اندر جذبہ کوز زیادہ پختہ نہ دیا۔ وہ مسیحائی کا وصف لے کر وطن لوٹا تھا۔

حوبلی میں ہونے والی چینگویوں کو وہ سر جھٹک کے نظر انداز کرتا رہا۔ اسے احساس تھا کہ اتنے سالوں بعد بھی اس کے ضعیف دادا کی کاری ضرب بھلائی پائے اور چچا بتایا اپنے اپنے کنہوں اور کاروباروں میں مشغول ہو گئے پھر بھی اب تک گھات لگائے بیٹھے ہیں اس نے اپنے روپے سے ان کی ہر طرح کی توقع کو مسترد کر دیا۔ اور پورے دھیان کے ساتھ ”فیروز ہاسٹل“ کی تیاری میں لگ گیا۔ لائی بی بی نے اسے جو تربیت دی تھی اور روشن خیال باپ کے خون کی جوتاغیر اس میں موجود تھی اس کے زیر اثر باپ کی محبت کو خراج

تحسین پیش کرنے کا اسے اس سے بہتر حل کوئی نظر نہ آیا۔ اسے نہ تو باپ کے قاتل سے کوئی سروکار تھا نہ ہی بدلہ لینے کی تڑپ تھی اور یہ تو اسے اس دن پتا چلا کہ بظاہر انجان بنے رہنے کے باوجود اس کے اندر کہیں بہت اندر نفرت کی جڑیں موجود ہیں۔ وہ کچھ مشینری کے سلسلے میں سگلا پورا نہ ہونے والا تھا کہ سید و شریف سے جان محمد اپنی خان بی بی کا راز دارانہ پیغام لے کر پہنچا۔

”اس خط کے ساتھ جو دوسرے رقعے میں اس عورت کا پیغام اور پتہ موجود ہے جس کی مرتے دم تک مدد کرنے کا تمہارے مرحوم باپ نے عہد کیا تھا۔ فیروز علی وردگ کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے میں اس کے تمام عہد نبھانے کی پابندی ہوں اور تمہاری ماں ہونے کی حیثیت سے تمہیں حکم دینے کی مختار بھی۔ یہ عورت جسے تمہارے مرحوم باپ نے تحفظ اور عزت دینے کا عہد کیا تھا اور اسی عہد کو نبھائے وہ اپنی جان بھی گنوا بیٹھا، تمہارے لیے قاتلی احترام ہے۔ اس تک فوراً پہنچو اور اپنی خاندانی روایات کے مطابق عہد کی پاسداری کا فریضہ نبھائو۔“

وہ ابھی اور ساتھ میں موجود شکستہ تحریر والے مختصر خط کو پڑھنے لگا۔ ”تم سے رخصت ہوتے وقت میں نے وعدہ کیا تھا کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پہ تمہیں ضرور نکال دوں گی۔ میں شاید اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہوں اور میں نے یہ جان لیا ہے کہ انسان کی اپنی شناخت اور کچھ نہیں، سوائے اس کے اپنوں کے، نہ مٹی نہ خون، محبت کے جذبے کے رسوا ہونے کے بعد میں نے خون کے رشتوں میں پناہ لینا چاہی۔ انسانوں کے اس جنگل میں محض اس لیے آن بی کہ یہاں میری جڑیں ہیں، میرے باپ کی میرے دادا کی..... یہ شہر مجھے قبول کر لگا۔ اس شہر نے میرے وجود کو دنیا سے چھپا تو لیا لیکن گلے نہ لگا۔ گلے لگانے کے لیے مجھے آج بھی اپنی مٹی کی ضرورت ہے اور اس مٹی کو ڈالنے کے لیے کسی اپنے کی مٹھی کی۔“

میں تم سے اور کچھ نہیں مانگی بس تمہیں اس عزت کا واسطہ جو فیروز لالہ نے مجھے دی تھی اور اس محبت کا واسطہ جو اس کے حوالے سے میں نے تمہیں دی تھی، مجھے بے یار و مدد گار مرنے مت چھوڑنا۔ میں چاہتی ہوں کہ پہاڑوں کے سچے ہی کسی میری بھی ایک قبر ہو، اپنے باپ کی طرح۔ جہاں چند لوگوں کو بھی مگر کسی کو خبر تو ہو کہ اس مٹی کے پیچھے میں سو رہی ہوں میں.....

طلب گار۔

لفظ ایک فاتحہ اور ذرا سی زمین کی

مومنہ

اس نام سے تو وہ بخوبی واقف تھا اور اس نام کے ساتھ ایک اور نام بھی تازہ ہو جاتا تھا، خان زریاب خٹک کا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خان زریاب کے ہاتھوں اس کے بابا جان کے ہاتھ مارے جانے میں اس عورت کا کردار کیا رہا ہے۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ ماں نے ہمیشہ مومنہ نامی خاتون کا غائبانہ تعارف اس سے بڑے احترام اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اس محبت کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ زریاب خٹک جیسے درندے سے اتنی نفرت تو پھر اس کی بیوی کا ذکر اسنے اچھے الفاظ میں کیوں؟

اب بھی ماں کا حکم نامہ پڑھ کے وہ اُلجھ گیا۔ اسے لائٹی بی بی کی یہ بے مقصدی خواہش سراسر فضول لگ رہی تھی۔ اگر وہ لب گور پڑی اس عورت کے ٹکڑن وٹن کا بندوبست ہی کرتا چاہتی ہیں تو کسی بھی قابل اعتماد ملازمہ کے ہاتھوں یہ فریضہ ادا ہو سکتا ہے۔ جان محمد بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ اس نے فون پر ہلکا سا احتجاج کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اسے مسٹر کر دیا گیا۔

”اس نے کسی اپنے کی خواہش کی ہے خوشنود اور بھائی کے بعد اس کی اولاد سے زیادہ اور کن اپنا ہو سکتا ہے۔ تم بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً لاہور پہنچو، ہو سکتا ہے اسے تمہاری ہی ضرورت ہو اور اس کی سانسیں کچھ دن اور رہ جائیں۔“

بڑی ہی بے دلی سے وہ اپنا سارا پروگرام اپ سیٹ کر کے لاہور جانے کے لیے نکلا۔ وہاں دیے گئے ایئر لائن پر پہنچ کر ایک اچھی زبان والی کرخت مزاج عمر رسیدہ خاتون سے بڑی دقت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کر پایا۔ وہ اسے لے کر سروسز ہاسٹل لے آئی جہاں کوویڈیور میں زمین پر پڑی اس عورت کی حالت دیکھ کے وہ دہل گیا یہ تو وہ جانتا تھا کہ سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں کا ”مفت علاج“ کس طرح ہوتا ہے، لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اگر غریب کے ساتھ ساتھ کمپری اور لاوارثی بھی ہو تو مریش کو اس طرح بے یار و مددگار ننگے فرش پر مرنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔

اس وقت اسے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کے سامنے ایک ایسا مریش ہے جیسے مریشوں کے لیے اس نے فیروز ہاسٹل بنانے کا خواب دیکھا

ہے، شیخ زائد ہاسٹل میں محمود غزنوی کو وہ جانتا تھا جو اس کے ساتھ لندن میں ہوتا تھا وہ وہ بچی کبھی سانس لینے اس نڈھال سے وجود کو وہیں لے گیا۔ محمود کے دماغ میں بھی موت سے لڑنے کا سودا مایا تھا۔ اس نے ایک پہنچ کی طرح اس مریشہ کو قبول کیا جس کا کینسر لاسٹ اسٹیج پہ تھا اور جلد کے انتہائی شدید دورے کے بعد کوئی مناسب طبی ہولت میسر نہ ہونے کے بعد بھی زندہ تھی اور اسے مزید کچھ دن بھی زندہ رکھنا ایک امر دشوار تھا، لیکن شاید خدا نے اس کی عمر بڑھا رکھی تھی، یا اس کے جسے کے کچھ مزید تماشے دیکھنے رہتے تھے کہ خوشنود اور محمود کے اندر کے خمدی ڈاکٹر تھک کے ہار نہ مان رہے تھے۔

سنگ پور جانا، ہاسٹل کے دیگر معاملات، خوشنود کو کچھ بھی نہ یاد رہا۔ رہی سہی کسر اتفاقاً ملنے والی مقدس نے پوری کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے اس نئے اور خوش کن موڑ پہ حد سے زیادہ حیران تھا۔ ابھی تو وہ دل میں بیٹنے والے نئے نوپے سہانے سے جذبے کو محسوس کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا ابھی تو وہ آنکھوں کی چٹلیوں میں ڈولے اس عکس کے رنگ بھی نہیں گن پاتا تھا کہ یہ ایک بھگنا.....

اس کی وقتی روپر روپر سے چند منٹ پہلے ہاسٹل میں پیش آنے والے واقعے کی طرف چلی گئی۔

”مہا.....!“ یہ ایک لفظ اسے خود سے کتنی دور لے گیا تھا جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنی اپنی اپنی گئی تھی۔

جب وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا تو اسے پانا کتنا سہل لگتا تھا۔ اور اب جب وہ اس کے بارے میں سب جان گیا ہے تو اسے سوچنا بھی ایک ناگوار امر محسوس ہو رہا ہے۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ بدلے اور انتقام کی تپش اس کے دل تک نہیں پہنچ پائی۔ یہ بھی درست کہ اس کی میٹائی کی طرف مائل فطرت کسی کا خون بہانے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور یہ بھی ایک حقیقت کے ماں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم نے اسے عداوت و خفارت کے جذبے سے کوسوں دور ہی رکھا لیکن پھر بھی..... پھر بھی کیا وہ اپنے اندر یہ تسلیم کرنے کی ہمت پاسکے گا کہ وہ اپنی باپ کے قاتل کی بیٹی سے محبت کرنے لگا ہے۔ ”نہیں ہرگز نہیں۔“ اس نے زور زور سے کئی میں سر ہلایا۔

”میں کچھ بھی کر لوں اتنا اعلیٰ ظرف تو کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے خود سے ہار مان

کے اپنی کمزوری تسلیم کی۔

فران..... مرن فون کی بیل پہ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے، دوسری جانب ڈاکٹر محمود غزنوی کی پر جوش آواز بھی ”خوشنود علی، مجزہ ہو گیا۔ میں اسے مجزہ ہی کہوں گا۔ تمہاری پچھت مومنہ خاتون آج آئی۔ سی یو سے پرائیویٹ روم شفٹ کر دی گئی ہے۔ انہیں ہوش آ گیا ہے۔ میرے خدشے کے برعکس وہ کوئے میں نہیں سگیں اور نہ ہی ان کی ذاتی حالت کو کوئی فرق پڑا ہے تم چاہو تو ابھی ان سے مل سکتے ہو۔“

نڈھال سا بڑا خوشنود سرے سے پڑ عزم ہو گیا۔ وہ یہاں ایک مرنی ہوئی عورت کی آخری خواہش پوری کرنے آیا تھا، لیکن قدرت نے اسے سالوں سے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ اس موقع کو گونا گونا چاہتا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ اس کے روبرو تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں گھنٹوں میں سر دیئے زارہ قطار روئے جاری تھی اور شناور سے خاموش کرانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کے اب خود رو دینے والی ہو رہی تھی۔

”مقدس، اپنی جان لوگوں کی تم میں رو رو کے۔ آخر بتائی کیوں نہیں کیا ہوا؟ کہاں گئی تھیں تم؟“

”میں ہاسپٹل گئی تھی شناور..... اور وہ میری ماما ہی ہیں۔“ اس نے برکت چند الفاظ کہے اور پھر سے بچیاں بندھ گئیں۔

”وہ میری ماما ہیں۔ میں فوراً پہچان گئیں انہیں دیکھتے ہی۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتیں ورنہ شاید وہ بھی مجھے پہچان لیتیں، لیکن نہیں..... پہچانے تو انہیں ہیں جنہیں یاد رکھا جائے، وہ بھلا کہاں یاد رکھ بائی ہوں گی کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اگر وہ تمہاری ماں ہیں تو پھر..... خیر یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کیسے جانتے ہیں اماں مومنہ..... میرا مطلب ہے آئی کو؟“ اس کے سوال کے جواب میں وہ چپ رہی۔

کچھ اندیشے تھے جو اسے کل کے ماں کے ملنے کی خوشی بھی نہ منانے دے رہے تھے۔ وہ ان خدشات کا اظہار کر کے اپنی ذات کو کسی کی نظروں میں بے وقعت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مقابلہ شناور گل تھی جو اس کی تہہ سے بھی اصل بات کھوج لاتی۔ مسلسل سوال

کر کر کے اس نے یہ اگلو ہی لیا کہ ڈاکٹر خوشنود علی، فیروز وردگ کا بیٹا ہے، اس فیروز وردگ کا جس کے بے لوث دوستی کے قصیدوں سے اس کے بابا جان کی ڈائری بھری پڑی ہے اور اس فیروز وردگ کا بیٹا جس کے ذکر سے اس کے گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ جس کے نام کی وہشت سے بی بی جان اور تایا جان اپنے لاڈ لے زیریاب خشک کی خیر مانگتے ہیں۔

”واٹ، ہاؤ سر براؤنگ، کتنا افسانوی سا لگ رہا ہے۔ یوں بچ در بچ اتفاقات کی کڑی ملتے جاتا۔ اسے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قدرت خود تمہاری رہنمائی کر رہی ہے، وہ خود ان رازوں کو تمہارے سامنے کھولنا چاہتی ہے اور تم بے وقوف یوں منہ اٹھاتے واپس چلی آئیں کہاں تو ماں کی تلاش میں دیوانی ہو رہی تھیں اور کہاں ان کے ملتے ہی سب چھوڑ چھاڑ یہاں اندھیرے میں آسو یہاں نہ ملے گی۔“

”تو کیا کرتی، میں جانتی ہوں اس اسرار کے پردے میں میرے لیے کوئی خوش کن انکشاف نہیں ہے۔ کاش مجھے کتنی ہی نہیں یا پھر..... یا پھر وہ مجھے زندہ نہ ملتیں۔“ اس نے بے رحمی سے کہا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بابا کی ڈائری نے میرے ذہن میں ان کا ایک پیکر تراش دیا تھا۔ خاندان بھری باتوں کو نظر انداز کر کے میں نے انہیں ہمیشہ ہی اپنے تصور میں ایک باوقار اور باوقاف خاتون کی حیثیت سے سوچا۔ لوگ کیا کہتے ہیں مجھے کبھی اس کا یقین نہ آیا۔ لیکن..... شانو..... تم خود سوچو..... سارے زمانے کے کٹ کر..... اولاد اور شوہر کو بھلا کے..... زندگی کے اس انتہائی موڑ پہ آج اگر کوئی ان کے پاس ہے تو ایسی شخص کا بیٹا جس کا نام ان کے ساتھ اتنی ذلت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میں ڈرتی ہوں شناور کہ کبیں یہ سب سچ ثابت نہ ہو جائے۔“

”خوشنود کے اندیشے ہیں تمہارے دل میں، میری یہ بات یاد رکھو مقدس زیریاب کہ اور حوا ہمیشہ تکلیف دیتا ہے۔ اگر تم اس سچی میں ہاتھ ڈال ہی چکی ہو تو اب اس کے تمام سر سے کھٹکا تم پر فرض ہے۔ اب سچ چاہے جو بھی نکلے اسے ہمت اور حوصلے کے ساتھ قبول کرو۔ لیکن پہلے سچ کی تلاش تو کرو ہو سکتا ہے سچ اس سے بالکل مختلف ہو جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اب تک ایسا کتنا کچھ ہو چکا ہے جو تمہاری توقعات کے بالکل

ہو گیا۔ وہ ہر وقت مجھے کافر رسم و رواج سے بچانے کی سعی میں لگن رہتا۔ میری ماں کی موت نے اس کے لیے واپسی کی راہ کھولی لیکن تجانے سے وہ کوئی نایابہ چیز یاں نہیں جتنوں نے اس کے پیر بہرور بت کی وادی سے باندھ دیئے تھے۔

میں اس وادی میں رہتے ہوئے بھی سب سے الگ تھی۔ سب سے کٹ کے رہنے میں جو اذیت ہے اس کا مزاج میں آج سے نہیں لے رہی یہ تو میرے بچپن کا تجربہ ہے۔ تنہائی نے ایک نشے کی طرح ایک لٹ کی طرح مجھے بکڑ لیا۔ یہ تنہائی تب اور تکلیف دہ ہو گئی جب ابابھی مجھے چھوڑ کے چلا گیا اس کے بس میں ہوتا تو وہ بھی نہ مڑتا۔ آخری دنوں میں ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے یہ شرمندگی کہ محض میری ذات کی وجہ سے اباباپنے عشق کو غلطی کہنے پر مجبور ہو گیا۔

مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی صرف میری وجہ سے اس لازوال عشق پر یہ دھبا۔

ابا بچھٹارہا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ کیوں نہ مجھے لاہور لے گیا۔ شاید اس کے رشتے دار بھی مجھے تسلیم نہ کرتے لیکن ابا کو یہ اطمینان تو رہتا کہ وہ کلمہ کولوگوں میں اپنی بنی چھوڑے جا رہا ہے۔ میرے ہر طرح سے یہ یقین دلا دیتے پر کہ میں ہر حال میں اسلام پر قائم رہوں گی کسی کافر سے شادی نہیں کروں گی، ابانے سکون سے آنکھیں موندیں بعد میں مجھے لگا لگا کے خدشے تقریباً بے بنیاد تھے، ہستی کے لوگ جاہل تھے، کافر تھے، جنگلی تھے مگر پیارے تھے۔ جو پیار کرتے ہیں انہیں پیار سے ہی کہا جاتا ہے ناں۔ کسی نے میرے ایمان کو نہیں پچھانی۔

میں انجنیوں کے درمیان بھی بڑی بھولت سے زندگی گزار رہی تھی کہ ایک دن وہ آیا جسے پہلی نظر دیکھ کے ہی مجھے سالوں سے روزِ فجر سے ماگی اپنے دعاؤں کے پورا ہونے کا یقین آنے لگا۔ وہ زریاب تھا۔ جس نے ابا کی قبر پر فاتحہ پڑھ کے مجھ سے اپنا رشتہ اور پکا لیا۔ میں اسے چاہنے لگی ویسے ہی جیسے کوئی بھی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ بغیر کسی طلب کے، بغیر کسی چاہ کے، بغیر کسی صلے کے..... میں اسے چپ چاپ جانتی رہتی تا مگر، چاہے وہ چاہتا یا نہ جانتا، چاہے یہاں رہتا چاہے چلا جاتا۔ مجھے کوئی فرق نہ پڑنے والا تھا۔ لیکن ایک عجیب سی بات ہوئی اسے بھی مجھ سے چاہت ہو گئی۔ لیکن وہ یہی چاہت نہ تھی جیسی کسی کو بھی کسی سے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک خدی خان زادے کی چاہت تھی جو ہر جن چاہی چیز کو اپنا

دیکھنا چاہتا ہے۔

میری محبت ایک بخارِ محبت تھی، عاجز، مسکین، ہر حال میں راضی خوشی رہنے والی صابر شاکر محبت اور اس کی محبت نوابی تھی، جلالی تھی، طوفانی تھی سب بہا کے ساتھ لے جانے والی۔ اسے اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ میں اس کی ہو کے رہوں یا اس وادی کی۔ یہ فخر مجھے اونچا کر گیا لیکن میں کم ظرف نہ بنی اپنے ابا کا شہر دیکھ چکی تھی۔ مرنے دم بھی اس کی آنکھوں میں جو بچھتاوے تھے اس نے مجھے جتنا دکھایا تھا اور میں نے عشق اور ذہن کو الگ الگ رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن زریاب کے لیے عشق ہی سب کچھ تھا، عشق ہی سانس، عشق ہی اس عشق ہی زندگی اور عشق ہی موت، وہ وصال کے بغیر عشق کو سونپنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا۔

اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ میں چاہتی تو ایک جست لگا کر اس اجنبی دنیا سے نکل سکتی تھی لیکن میں نے اور بھی بہت کچھ سوچا۔ اگر میں زریاب کو اپنے ابا کی طرح یہاں رہنے پر مجبور کرتی تو ایک بار پھر وہی کہانی دوہرائی جاتی۔ میں جانتی تھی وہ اپنے عشق اور طلب میں اتنا دیوانہ تھا کہ سب عشق و آرام ترک کر کے میرے پاس پہاڑوں پہ بنے لکڑی اور گارے کے مکان میں زندگی گزارنے پر تیار ہو جاتا لیکن میرا عشق اپنی ماں کی طرح خود غرض نہ تھا۔

میں جانتی تھی چند سال بعد اسے خون کے رشتوں سے جدائی اسے ابا کی طرح ادھورا انسان بنادے گی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اس کے دل پہ تو شاید میں بھرنی کر لوں لیکن اس کے گھر میں مجھے ایک ان چاہے فرد کی حیثیت حاصل رہے گی۔ مجھے اپنی انا اور ذات کا غرور ہمیشہ بہت عزیز رہا ہے۔ ان سر بلند پہاڑوں اور اونچے پتیلوں کی سنگت نے اپنی ہی خوشبو پیدا کر دی تھی مجھ میں، مجھ سے کسی کی میری نظر میں برداشت ہوتی تھیں نہ ہی کسی کی آنکھیں اٹکی۔ مجھے اکیلا رہنا منظور تھا لیکن کم حیثیت زندگی نہیں۔ میں محبت کے بدلے رسوائی اور بے عزتی قبول کرنے پر تیار نہیں تھی۔

میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی وہ صرف مجھے محبت دے سکتا ہے اپنے اعلیٰ نسب گھرانے سے وقار نہیں دلا سکتا۔ بے وقور ہو کے رہنا مجھے منظور نہیں تھا اس لیے اس کی ہر درخواست میں رد کر دی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا عزیز دوست

فیروز اس کی حالت برداشت نہ کرتے ہوئے مجھے سمجھانے چلا آیا۔ بڑے ہی دلولے اور اپنائیت کے ساتھ وہ اپنے دوست کی وکالت کرتا رہا لیکن میرے نقطہ نظر واضح کر دینے کے بعد ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے لگا جو بات زریاب کو سمجھانے میں ناکام رہی ہوں، وہ بات فیروز سمجھ گیا ہے۔ میں نے اسے مزید قائل کرنے کی کوشش کی۔

”آج انہی لوگوں کی یہ بستی میری سرپرست تو ہے میں اسے چھوڑ کے زریاب کے ساتھ چل پڑوں تو بالکل ہی لاوارث اور بے سائبان کھلاؤں گی۔ زریاب کے دنیا میں صرف میں اور وہ ہی نہیں ہوں گے اس کا پورا خاندان ہوگا۔ اس بھری پری دنیا میں اپنی جگہ کس مل بوتے ہے بناؤں گی۔ جہتیں بھانا آسان ہے لاہر شتے بھانا مشکل، میں زریاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی اور مجھ سے مشکل چیز اور سی ہے جسے سائنس لینے کے لیے مجھے عزت کی ضرورت ہے، عزت میری بھوک ہے لاہر، وقار میری پیاس ہے، محبت صرف عادت، عادت اور ضرورت کے بغیر رہا جاسکتا ہے بھوک اور پیاس سے کوئی کتنی دیر لڑسکتا ہے۔ میں کم فہم یا خوش فہم نہیں ہوں جانتی ہوں میں ایک حقیر بے مایہ سی پہاڑن ہوں اور زریاب کے مقابلے میں تو بالکل بھی کچھ نہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ زندگی کے ہر قدم پہ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس دلایا جائے۔ ان پہاڑی کم حیثیت لوگوں میں میں بہت خوش ہوں۔ یہ لوگ مجھے جانتے ہیں، میری ماں کو، میرے باپ کو، میری اور میرے خاندان کی تعظیم کرتے ہیں میں بڑے وقار کے ساتھ اس بستی میں بغیر کسی دلی وابستگی، خوبی رشتے اور محبت کے زندہ ہوں لیکن وہاں زریاب کی عالی شان حویلی میں میں کس حیثیت سے داخل ہوں گی۔“

”فیروز علی وردگ کی بہن کی حیثیت سے۔“ اس کے فیصلہ کن انداز نے مجھے چونکے پہ مجبور کر دیا اور ابھی میں سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اس کا مضبوط ہاتھ میرے سر پر ٹھہر گیا۔

”تم نے جتنی بھی بار مجھے لاہر کہہ کر پکارا مجھ خود پہ فخر محسوس ہوا ہے مومنہ۔ زریاب سے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ لیکن خود تم مل کر احساس ہوا کہ تم کیا نایاب گوہر ہو۔ جو عورت محبت پر عزت کو ترجیح دیتی ہو۔ جو آسائش سے بھری زندگی گھس وقار کے لیے ٹھکرا دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ اس عورت کی عزت بھی کی جاسکتی ہے۔ آج اس لمحے میں نے اپنے دل میں تمہارے لیے بے پناہ عزت و احترام محسوس کیا ہے اتنا کہ جتنا میرے دل میں اپنی ماں کے لیے ہے۔“

اس کی انتہا پسندی مجھے ہواؤں میں اڑانے لگی۔

”لیکن تم مجھ سے چھوٹی ہو اس لیے میں تمہیں بہن کہوں گا۔“

”لاہر.....!“ سسکیوں کے درمیان میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکل سکا۔ اس کا ہاتھ میرے سر پہ ہنوز آسمان کی طرح سایہ کیے ہوئے تھا۔ اب کے بعد زریاب وہ واحد شخص تھا جس سے لگاؤ اور انسیت سے بڑھ کے کچھ محسوس کیا تھا میں نے، جس کی محبت کو پور پور اتر کر میں شات ہوتی تھی لیکن رشتہ اور مان و محبت سے کہیں بڑھ کے طنائیت نہیں ہوتا ہے یہ مجھے اب اندازہ ہوا۔ فیروز نے مجھ سے یہ مقدس رشتہ جوڑ کے مجھے معتبر کر دیا تھا۔

”اور ایک بھائی ہونے کے ناتے میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ تمہارا نکاح آج ہی خان زریاب خٹک سے کر دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے کہ تم میری نیت پہ شک کرو میں یہ واضح کر دیتا ہوں کہ تم نکاح کے بعد میرے ساتھ میرے گھر چلو گی۔ زریاب کے والدین میرے پاس آکر باقاعدہ تمہارا رشتہ طلب کریں گے اور میں ایک باپ کی طرح اپنے گھر سے تمہیں رخصت کروں گا۔“ اس نے بڑے استحقاق سے فیصلہ سنایا۔

”میں یہ عہد کرتا ہوں مومنہ علی کہ میرا گھر تمہارے لیے ہمیشہ کیے کی طرح آباد رہے گا، چاہے میں رہوں یا نہ رہوں۔ اس گھر سے تمہیں سیکے کا تمام تر مان اور وقار ملے گا۔ تمہارے نام کے ساتھ اب فیروز علی وردگ کا بھاری ٹھکر حوالہ ہے۔ تم زریاب خٹک کے گھر کم حیثیت اور ان چاہے فرد کی حیثیت سے داخل نہیں ہوگی۔ یہ میرا، ایک خالص بچتوں زادے کا عہد ہے۔“

اور میں اس عہد پر ایمان لا کے ہای بھر بیٹھی، عورت بھی کتنی عجیب چیز ہے، بچتوں کے بارے میں لاکھ شدت اور انصاف پسندی کا دعویٰ کرے، کہیں نہ کہیں ڈنڈی ماری دیتی ہے، میری ماں اپنے عشق میں اتنی جتنی بھی کموت کو گلے لگا بیٹھی لیکن جیتے جی ابائے لیے اپنے رشتے داروں کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ کر سکی اور میں..... زریاب خٹک کے لیے..... اپنے محبوب کے لیے اتنی بے لوث ہو کر سوچتی تھی کہ خود کو تباہ کر لینا منظور تھا، اسے کسی امتحان میں ڈالنا گوارا نہ تھا، میں ڈرتی تھی میری شدت پسندی اور انا پرستی اس کے لیے مسائل کھڑے نہ کر دے اس لیے خود کو محرم کرنا گوارا کر لیا تھا میں نے اور فیروز خان اس کی بار میں کتنی خود غرض بن گئی..... یہ نہ سوچا کہ مجھے تحفظ دینے کا عہد کرنے والا کہیں کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔ اس نے میرا اعتماد بحال کیا اور میں نے بڑی آسانی سے اپنا

ہر اجنبی اور پھر وہ دور شروع ہوا جو میری زندگی کا سب سے حیران کن دور تھا۔

چند مشکلات کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ میں چند ہی دنوں میں بیاہ کر زریاب کی جویلی آگئی اور پھر وہ دور شروع ہوا جو میری زندگی کا سب سے حیران کن دور تھا۔

تم جانتا چاہو گے کہ حیران کن کیسے؟ تو وہ اس طرح کہ میرے تمام تر خدشے بھر بھری ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ نہیں ایسا نہیں تھا کہ زریاب کے گھر والوں نے مجھے با آسانی اور کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ وہاں میرے لیے سردہمی تھی، اعتبار تھا۔ زریاب کی بی بی جان مجھے مسلمان ماننے پہ تیار نہ تھیں وہ اور ان کی خاص ملازماں تک باقاعدہ مجھ سے کٹراتیں۔ کوشش کی جاتی کہ میں اپنے کمرے تک محدود رہوں لیکن جانتے ہو حیران کن بات کیا تھی..... وہ یہ کہ یہ تمام اہانت آمیز رویے بھی مجھے بھڑکانے سکے۔ میں جو اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں سر رو دیے مجھے سے موت نہ مار دیں ہر کسی سے انجان ہو کر رہ گئی عجیب کھوئے کھوئے دن تھے۔

مجھے سوائے زریاب کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا، کچھ سنائی نہ دیتا۔ کون مجھے ہندی کہہ کے پکارتا ہے کون کافر کہہ کر، احساس ہی نہ ہوتا۔ مجھے برتنوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی لیکن مجھے اس میں بھی کوئی ہنک محسوس نہ ہوتی۔ میری نماز روزے کو ذھولسا کہا جاتا، میں پروانہ کرتی، شاید اسی کوشش کیسے ہیں اور شاید اسی لیے نئے کوئے غریبی اور ذلت کہا جاتا ہے۔ نشہ چاہے محبت کا ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ ہستی کی طرف لے جاتا ہے۔ میں جو جنگلی بیڑوں کی طرح سر بلند اور اکھڑتی، وادی کے بادلوں جیسی شفاف تھی، اتنی بے گانگی اور ذلت و حقیر برداشت کرتی رہی، زریاب سے کبھی ایک لفظ تک نہ کہا۔ وہ پاس ہوتا تو مجھے کسی بات کا ہوش بھی نہیں آتا ہوتا تھا۔

میں بخوار بھی تو محبت بھی مشکلوں کے سکوں کی طرح گنگن کر کرتی تھی، جویلی میں آئی تو مٹھیاں بھر بھر کے چمچاؤ کرنے لگی۔ زریاب کی طرح میرا عشق بھی بلاخیز ہو گیا۔ میں..... مومنہ علی جو عزت کو اپنی بھوک اور تعظیم کو اپنی پیاس قرار دیتی تھی۔ اب سانس بھی لیتی تو صرف اس لیے کہ فضا سے آئی زریاب کی خوشبو کو اپنی نس میں اتار سکوں۔ زریاب کی دیو لگا بھی جوں کی توں تھی بلکہ جب سے اسے پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں وہ میرا پہلے سے بڑھ کے دھیان رکھنے لگا۔

انہیں دنوں زرسا نگہ، زریاب کی بڑی بہن بھی ڈیوری کے لیے میکے آئی۔ میری

اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ زریاب کو بے حد عزیز تھی اس لیے میں نے بھی بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے ملنا چاہا لیکن اس کے روئے میں بھی میرے لیے سردہمی اور گرہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جتنے دن رہی مجھ پہ طنز کے تیر تا کہ تاک کے چلائی رہی۔

لی بی جان کا رویہ ایک خاموش اعتبار تھا لیکن ان کی بیٹی کے روئے کا جارحانہ پن مجھے کبھی بھی نشے سے چھوڑ ڈالتا تھا۔ میں نے پھر بھی اس کی تلخ حرا جی اور ترش روی کو اس کی صحت کی خرابی پہ محمول کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کی صحت مزید بگڑ گئی جس کی وجہ سے اس کا سینے میں قیام طویل ہوتا چلا گیا انہی دنوں فیروز لالہ کی بیوی لالی بی بی یعنی تمہاری ماں اپنی دیگر رشتہ دار خواتین کے ساتھ مجھے لینے آئی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیروز کی خواہش کے مطابق میرے بیٹے کی پیدائش میرے سینے میں ہو۔ اس توجہ و عنایت پہ میں کھل اٹھی لیکن زریاب سے پہلے بھری جدائی مجھے قبول نہ تھی اس لیے جانے سے منع کر دیا۔

میری بچی مقدس اسی گھر میں اپنے باپ دادا کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ نے سوچ رکھا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو ہو بہو میری تصویر تھی۔ زریاب نے کس لیے کسی سے کہا تھا۔

”اب میں تم سے کہاں تک بچوں کا مومنہ۔ تم کتنے روپ بدل کے مجھے تزییر کرو گی۔“

فخر سے میرا سر بلند ہو گیا۔ مقدس نے باپ کی توجہ بانٹ لی تو میرے بھی کچھ ہوش ٹھکانے لگے اب مجھے زریاب کے علاوہ بھی کچھ نظر آئے لگا۔ میں نے پہلی بار بیٹی کے گھر والوں کے اچھے رویے اور گرہ کو محسوس کیا۔ غیر جانب داری سے سوچتے ہوئے مجھے کچھ تصور اپنا بھی نظر آیا۔ میں نے خود کو صرف اپنے شوہر تک محدود کر رکھا تھا صرف اس کی محبوبہ کی حیثیت سے یہاں رہ رہی تھی۔ میں نے ایک بہو ہونے کے تاتے خود کو مومنہ کی کوشش کی ہی نہیں تھی، اگر لی بی جان مجھے کافر سمجھتی تھیں تو مجھے اپنی حیثیت ان پہ واضح کرنا چاہیے تھی، اپنی جگہ بنانے کے لیے کوئی قدم تو اٹھانا چاہیے تھا۔ میں نے حقیقت پسندی سے سوچتے ہوئے اپنا احتساب کیا۔

باجا جان مصر تھے کہ اس بار بیرونی ملک کا رویہ دورے پہ زریاب ہی جائے جب کہ وہ میری اور اب بھی مقدس کی کشش سے بندھ چکا تھا۔ میں نے ہی اسے جانے پہ

آمادہ کیا ایک بیٹا ہونے کے فرائض سے آگاہی دلائی۔ ایسا کر کے شاید میں خود ایک اچھی بہو بننے کی تیاری کر رہی تھی۔ بشکل وہ جانے پہ تیار ہوا اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے فیصلے کی سختی کا اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ نے کتنی تیز دھوپ جھٹک کر آنے سے روک رکھی تھی۔ اس کے جاتے ہی جیسے بھابھڑ چلنے لگے۔ زرسا نگہ کے طعنے ناقابل برداشت ہوتے چلے گئے۔ میرے اندر کی اتار پرست بھاڑن بھڑ سے جا گئے تھے۔ اچھی اور قابل قدر بہو بننے کا ارمان کہیں سو گیا اور سمجھوتے کے تمام تر منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

زریاب کے ہمراہ وہ تمام رویے جو میں سرسری جان کے چھوڑ دیتی تھی، اب جان کو آ جاتے۔ میں نے جھگ آ کے اپنے کمرے تک محدود رہنا شروع کر دیا۔ یوں بھی بھرے گھر میں مجھے کوئی مسئلہ نہ لگتا۔ نہ تیار نہ ہوتا تھا۔ بی بی جان مجھے دیکھتے ہی وضو کرنے چل پڑتیں۔ ملازما کیں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دور دور رہتیں۔ چاچا جان اپنے کمرے یا پھر مہمان خانے تک محدود رہتے۔ زریاب کے بڑے لالہ شہر میں رہتے تھے ان کے گھر والوں سے میری سرسری سی ملاقات ایک آدھ بار ہوتی تھی، ان کے روئے میں بھی کوئی خوش آئند جھلک نہ تھی۔ جب کہ زریاب کے چھوٹے بھائی سے میری کبھی ملاقات ہی نہ ہوتی تھی۔

زرسا نگہ ابھی تک طویل تھی اور اس کی بد مزاجی اور چڑچڑاہٹ عروج پہ تھی۔ ہر پختے اس کا شوہر جیم گل آفریدی اس سے ملنے آتا۔ ہر بار ہی دونوں میں کوئی نہ کوئی ٹکئی پیدا ہو جاتی جس میں میرے نزدیک سارا قصور زرسا نگہ کا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ جیم گل بڑا مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ ہنس کھی کھی تھا۔ خوب دینی اور اپنی بیوی سے خاصا مکر مچھتی۔

مجھے تو پتہ چارے کی قسمت پہ افسوس ہی ہوتا تھا ایک تو بڑی عمر کی بیوی، اوپر سے جاہل، بد زبان اور کم شکل بھی۔ پورے گھر میں وہی تھا جو مجھے خنک خاندان کی بہو والا درجہ دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کے تعظیماً کھڑا ہو جاتا، ادب سے سلام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جتنا میں زر سا نگہ سے بچ کر رہتی جیم گل کے آنے پہ اس سے ضرور ملتی۔ وہ تھا ہی ایسا عزت کرنے والا اور عزت کرانے والا۔

اس دن میں حد سے زیادہ بے زار اور اداس تھی۔ مقدس کو سلائے کے بعد میں نے زریاب کو خط لکھا، پہلی بار میں نے اس سے اس کے گھر والوں کے ناروا سلوک کا ذکر کیا۔

ورنہ اس سے پہلے میری کوشش ہوتی کہ جتنا وقت بھی وہ میرے پاس رہے ہمارے درمیان کسی دوسرے کا ذکر نہ آئے اور تکلیف وہ ذکر تو ہرگز نہیں۔ لیکن اس دن میں نے اپنی ہر تکلیف اس سے بیان کی۔ اپنی تنہائیوں محرومیوں کا ذکر کیا۔ کس کس طرح میری عزت نفس کو چھین بیٹھائی جاتی ہے سب لکھا۔ بیرون ملک خط پوسٹ کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ پتہ انگریزی میں لکھا جاتا ہے جب کہ کوشش کے باوجود میں لکھا ہوا پتہ لگانے پہ بہو نہ اتار سکی تو خط لے کر جیم گل کے پاس چلی آئی۔ وہ رات ہی لگی مروت سے آیا تھا۔

”گل لالہ، ذرا یہ انگریزی کا پتہ تو اس لگانے پہ لکھ دو۔“

میں نے لفاظی اور قلم اس کے سامنے رکھا تو وہ مستی سے اُٹھ بیٹھا۔ تنہا اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے چمک رہا تھا۔ شب خوانی کا لباس پہن سکتا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا اس نے ساری رات اسی کرسی پہ بیٹھے بیٹھے گزار دی ہے، مجھے اس کی متحصل حالت پہ افسوس ہوا۔

”کیا ہوا لالہ، طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تمہاری۔“

”کچھ نہیں بھابھی! بس سفر کی مکان ہے اور..... میری قسمت کا ہم سفر مکان اتارنے والا نہیں، بڑھانے والا ہے۔“ اس نے انگلیوں سے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے کہا رات بھی زرسا نگہ کے کمرے سے کافی دیر تک تلخ و متند جملوں کی تکرار سنائی دیتی رہی تھی، میں ان کے درمیان موجود تھی کی وجہ سے ناواقف تھی پھر بھی میری تمام تر بھدردیاں رحیم گل کے ساتھ تھیں شاید اس کی وجہ میرے اور میری نند کے سرد تعلقات تھے۔

میں نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

”چھوڑو لالہ، ذرا ذرا سی بات پہ یوں مسئلہ لگانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔“ میں اس سے چھوٹے بھائیوں کی طرح چیخ آئی تھی شاید وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا بھی تھا حالانکہ رشتہ اس کا مجھ سے بڑوں والا تھا۔

”ہاں شوسے بہانا تو عورتوں کی عادت ہے نا۔ ذرا کوئی زیادتی ہوئی دریا بہا کے دنیا بھر کی ہمدردیاں سمیٹ لیں گی۔ مرد اپنی مردانگی کے زخم میں دل بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔“ وہ پچھلی سی ہنسی بکس کے پتہ لکھنے لگا۔ میں نے یونیورسٹی میں رواداری میں کہہ دیا۔

”تو تم مجھ سے دل ہلکا کر لیا کرو۔ میں بھی تو تمہاری کچھ گتھی ہوں۔ یقین کرو تمہارے دل کی بات میرے دل تک ہی رہا کرے گی۔“

”ہائے اللہ جی، میں برباد ہو گئی..... یہاں تو دل سے دل تک بات پہنچ گئی۔“

دھڑ سے دروازہ کھلا اور سینہ کو بی کرتی زرسا نگہ اندر داخل ہوئی۔ رحیم گل سرخ چہرے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔
”بکواس بند کر دو زر۔“

”ہائے بی بی جی..... آپ بھی مجھے کوں رہی تھیں ناں کہ شوہر کو راضی نہیں رکھ پاتی اس لیے دومنت پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔ آنکھیں دیکھیں زرا اس کے پاس نہ بیٹھنے کی وجہ خود دیکھیں۔“ اس نے شور مچا کر بی بی جان کو بھی بلایا ان کے ساتھ ساتھ وگمہ اور سرحدی جیسی ملازما نئیں بھی لپک کے تماشہار کھینے آگئیں۔

”میں کہتا ہوں زرسا نگہ، زبان قابو میں کر لو ورنہ۔“

رحیم گل نے دھاڑ کے کہا لیکن اسے زرا پروا نہ تھی۔

”اسی لیے بھانے بھانے سے روکھ کے کمرے سے نکل آتا ہے۔ دوسرا کمرہ اس جادوگر نے ہی جو آ باد کیا ہوتا ہے۔“

میں سن ہو گئی۔ اس ریک اہرام نے میری قوت گویائی ہی سلب کر لی تھی۔ وہ زہر اگلتی رہی۔

”آدمی رات کو میں نے خود اسے بن ٹھن کے اس کمرے سے نکلے دیکھا تھا۔ طبیعت بھری نہیں جو چند گھنٹے بعد پھر سے اندر گھس گئیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا اس کا منہ نوچ لوں لیکن قدم من من بھر کے ہو کر زمین سے اٹھ نہ پارہے تھے۔ خود رحیم گل بھی بیوی کے سفید جھوٹ پہ ہکا بکارہ گیا۔

”نہ بی بی..... ساری رات میں خود رو یا رب دلہن کے پاس تھی۔ بچی کو بخار آ رہا تھا، بی بی تو تلی تک نہیں کمرے سے۔“ سرحدی نے خوف خدا سے لرزے لگاوا دی۔

”تو..... بڑھی چڑیل.....“ زرسا نگہ نے عمر رسیدہ ملازمہ کو جھپٹ لیا اس کا منہ نوچتے ہوئے وہ بے تحاشا چیختی گئی۔ بی بی جان بیٹی کی ویو اگی پہ ہراساں ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ چکی تھیں، بدن پر نرہ طاری تھا اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے لیکن پھر مجھے اس سے بھر دہری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے کھن محسوس کر کے منہ پھیر لیا۔

”وگمہ..... اسے سنبھالو..... نبھانے کیسا دورہ پڑا ہے بچی کو جب سے بیاہ ہوا ہے کھلا کے رہ گئی ہے نبھانے کیسا کسی نے تعویذ پچھو کا ہے بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے معصوم بچی کا۔“

”ہونہر معصوم بچی.....“ رحیم گل نے تفر سے کہا اسے بی بی جان کا بیٹی کے لیے یوں فکر مند ہونا بالکل پسند نہ آیا، انہوں نے داما داور بہو کے یوں بے عزت ہونے پر اک لفظ تک نہ کہا اور کچھ کا بھی تو بیٹی کے لیے۔

”دورہ نہیں پڑا..... ذرا سے کرتی ہے پاگل پن کے۔ تاکہ جو مرضی آئے کرتی پھرے کوئی کچھ کہہ نہ سکے کہ بیماری پاگل جو ہے۔“ رحیم گل نے غصے سے کہا۔
”میں پاگل ہوں؟ میں پاگل نہیں ہوں تم مجھے پاگل کر دو گے؟“

”میری بچی پاگل نہیں رحیم گل۔“ بی بی جان نے سخت لہجہ میں کہا۔ رحیم گل اس پاس بڑی چیزوں کو کھوکھرا تا غصے سے کمرے سے نکل گیا۔ میں کسی بے جان چیز کی طرح گونے کی دیوار سے کبھی چپکلی کھڑی تھی۔ یہ تماشہ میرے گمان سے بھی باہر تھا۔ زرسا نگہ کی اکثر تحریکیں مجھے عجیب سی لگا کرتیں لیکن وہ اس حد تک جنونی بھی ہو سکتی ہے مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس نے تو شوہر کے ساتھ ساتھ، مجھے..... اپنے بھائی کی عزت کو بھی دو کوڑی کا کر دیا۔

غم و غصے نے مجھ سے اتنی ہمت بھی چھین لی تھی کہ میں بھی رحیم گل آفریدی کی طرح اس کمرے سے نکلنے کا سوچتی اور شاید میری بد قسمتی تھی کہ میں اس کمرے میں موجود تھی۔ زرسا نگہ نے نفرت سے مجھے دیکھا اور اپنا آپ جھڑاک مجھ پہ چھٹی۔ اس نے میری چادر کھینچ کے پھینک دی اور گر بیان سے بکڑ کے مجھے زمین پہ لایچھینکا۔ میرے بدن ٹوٹ کے بکھر گئے میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے تعجب تک نہیں کی اور آسانی سے اس کے ہاتھ چڑھ گئی۔ اس نے میرے بال نوچ کے مجھے گھٹینا کیا۔ بی بی جان کے کہنے پہ ملازما نئیں آگے بڑھیں لیکن تب تک اس نے میرے منہ پہ طمانچے مار مار کے میرے رخسار نوچا دیے تھے میری ناک سے خون بہہ رہا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ میری پیچ و پٹکا میرے اندر ہی کہیں ڈن ہو رہی تھی۔ اس قدر ذلت مجھے فریاد کرنے بھی نہیں دے رہی تھی وگمہ اور سرحدی نے اسے پکڑ لیا لیکن اس نے زور سے لات مار کے میری پٹیلیوں پہ وار کیا۔ میں درد کی شدت سے دہری ہو گئی۔

”کافرن..... ہندنی ایک مرد سے تیری تسلی کہاں ہوتی ہوگی۔ چھوڑ میرے بھائی اور شوہر کا پیچھا چل جا اپنے منحوس پہاڑوں پر وہاں رواج ہوگا چار چار مرد کھنے کا آزادی سے عیش کرتا۔“

”کافرن ہوگی تو.....“ میں پھٹ پڑی۔

”میں مومن ہوں..... مومنہ..... خان زریاب کی من چاہی بیوی..... مجھے چار مردوں کا طعنہ دینے والی ڈائن۔ خواہج مرد کے قابل بن کے تو دکھا مجھے۔“ میں مزید چپ نہ رہ سکی میری لکڑا پہ اس نے خود کو چھڑایا۔ لپک کے آتش دان سے جلتی لکڑی نکالی۔ اس کا توجہ بھانپ کے میں نے خود کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن میں خود کو مکمل طور پہ اس سے محفوظ نہ رکھ پائی۔ میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی دکھادی۔

اس وقت کی تمام تر اذیت مومنہ کے لیے ہی اُتر آئی۔ خوشنود آنکھوں میں درد لیے اس نڈھال چہرے کے اس سیاہ پڑے حصے کو دیکھنے لگا جہاں ایک بے رحم داغ پہ چند آنسو سر کر رہے تھے۔

”میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

مقدس کے قدم اس ایک جملے نے باندھ دیے۔ وہ آئی سی یو سے ہوتی ہوئی اس کمرے تک آ رہی تھی۔ کمرے میں خوشنود کو پا کے وہ ہنسی۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی موجودگی میں اندر چلی جانی یا چپکے سے واپس لوٹ جائے کہ ماں کی آواز نے اس کا دھیان کھینچ لیا۔ وہ درد میں ڈوبی اس آواز میں گرفتاری ہو کے دروازے کے پینڈل پہ ہاتھ رکھے وہیں کھڑی رہ گئی۔ سنسان کوریڈور میں کوئی ذی روح نہ تھا۔ باپٹل کے پرسکون ماحول میں دروازے کے اس پار کھڑی مقدس تک مومنہ کی گفتگو کو جتنی پہنچ رہی تھی۔

”میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

مقدس کے رخسار دھکنے لگے۔ اس نے شدت ضبط سے لب پیکل ڈالے۔ مومنہ نے گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

”وہ رات بڑی غلام تھی۔ ساری شام میں نیں بے ہوشی کے عالم میں اسی کمرے کے ایک کونے میں پڑی رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے گال کو کوئی چھیل رہا ہے۔ میں نے سوچی ہوئی آنکھیں بخش لیں۔ سرحدی ہاتھ میں مرہم کی پیپالی لیے کھڑی تھی۔ برستی آنکھوں کے ساتھ اس نے ہی شاید میرے چلے ہوئے رخسار کو صاف کرنا چاہا تھا اور درد کی تیز لہر مجھے گھٹنوں کی بے ہوشی سے کھینچ لائی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔ مجھے اس کے اور دیگر ملازماؤں کے سامنے ہونے والی تذلیل یاد آگئی۔ اب ان ہمدردیوں سے اس کا اثر لاپس ہو سکتا تھا۔ میں نے گرتے پڑتے اپنی چادر اٹھائی، ڈھولتے قدموں سے کمرے سے نکلی۔ سرحدی نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے اسے جھٹک دیا اس وقت مجھے سب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔“

رات گہری ہو چکی تھی، مقدس بستر پر لیٹی لاکڑیاں بھر رہی تھی۔ سرحدی کی گیارہ سالہ پوتی اسے کھلا رہی تھی۔ مجھ سے نظر پڑتے ہی وہ سراپمہ ہو گئی۔ مجھے جھننا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ اگلے قدموں کمرے سے نکل گئی، مقدس اس کو نظروں سے اوجھل پا کے رونے لگی۔ میرے کانوں تک اس کے رونے چلانے کی آواز بہت دور سے کہیں آ رہی تھی، میں نے خالی خالی نظروں سے اسے بستر پہ ہاتھ پیرخ کے روتے دیکھا لیکن میرے اندر کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی میرا پورا وجود برف ہوا ہاتھ صرف آدھا چہرہ جیسے شعلوں کی زد میں تھا۔ میں اس کے برابر لیٹ گئی۔ سرحدی نے آہ بھر کے مجھے دیکھا اور مقدس کو دودھ کی بوتل اور کھلونے سمیت اٹھا کے باہر لے گئی۔ جاتے جاتے وہ میرے سر ہانے مرہم رکھ گئی۔ کئی گھنٹے ایسے پڑے رہنے کے بعد میں اٹھی اور آئینے میں خود کو دیکھنا چاہا۔ میری سچ نکل گئی۔ میرے گال سے چربی باہر نکل ہوئی تھی۔ آدنک تک جلد جھلس چکی تھی۔ دروازے کے میرا گلا بیٹھ گیا۔ دن چڑھے تک میں بیوی بیاسی، بخار میں جلتی، درد سے تڑپتی اکیلی پڑی رہی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔

زریاب کے آئے میں ابھی کئی دن تھے۔ اتنے دن تک میں یوں بے یار و مددگار نہیں رہ سکتی تھی میں جانتی تھی اس سنگلاخ چوٹی میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں، کوئی میری تکلیف بانٹنے نہیں آئے گا۔ کوئی مجھے سنبھالنے نہیں آئے گا، اس طرح تو میں ختم ہو سکتی تھی جب کہ مجھے زندہ رہنا تھا مقدس کے لیے زریاب کے لیے، مجھے خود اپنے لیے کچھ کرنا تھا۔ زرا سنگ نے مجھے اگلا جان کے میرے ساتھ یہ تم ڈھایا۔ بی بی جان مجھے لاوارث سمجھ کے یہاں مرنے چھوڑ گئیں، لیکن میں ان سب کو تادوں گی کہ میں لاوارث نہیں..... بے یار و مددگار نہیں۔

مجھے فیروز لالہ یاد آئے اور ان کا عہد بھی میرے اندر ایک توانائی سی بھر گئی۔ میں نے اپنے زخم کو مرہم سے ڈھانپا۔ گرم دودھ منگوا کے پیا۔ ذرا ہمت آ جانے پہ سرحدی کی مدد سے مردان خانے جا کے فیروز لالہ کو فون کیا۔ میری سسکیاں انہیں احساس دلائیں کہ بات غیر معمولی ہے اس لیے تین گھنٹے میں ہی وہ میرے پاس موجود تھے۔ میری حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔

”مومنہ..... تم..... یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ گمان بھی نہ کر پائے کہ یہ سب کس نے کیا ہوگا اور جب میں نے خود پہ پڑنے والی افتاد کا ذکر کیا تو وہ چند لمحوں کے بیٹھنے سے بیٹھنے رہے پھر ان کی آنکھیں غیرت کے مارے لہو رنگ ہو گئیں۔

”اس گھر میں فیروز خان وردگ کی بہن یہ اتنا گھٹیا الزامات لگائے گئے۔ کیا یہی سب وہ خوشحال تھیں جنہیں دکھانے کا وعدہ کر کے زریاب تمہیں یہاں لایا تھا۔ وہ میرا دوست ہے لیکن اب میں بھول جاؤں گا کہ وہ میری بہن کا شوہر ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی رشتہ رکھتا ہے اسے اس رشتے کے تمام حقے پورے کرتا ہوں گے۔“

”نہیں لالہ زریاب کا کوئی قصور نہیں وہ کچھ نہیں جانتے۔ وہ تو جب مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو تجھے کیسا محسوس کریں گے۔ یہ سب ہوا ہی ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو کس کی مجال تھی مجھے ہاتھ لگانے کی، میری چادر کھینچنے کی، مجھ پر گندے الزامات لگانے کی۔“

”ٹھیک ہے وہ تمہارا شوہر ہے، تمہارا سنا سنا..... لیکن باقی افراد سے بھی تمہارا کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ سب یہ تمہاری حرمت فرض ہے۔ شوہر کی غیر موجودگی میں تمہارا بے سنا سنا اور غیر محفوظ ہونا ثابت کرتا ہے کہ زریاب تمہیں یہاں تمہاری شایان شان حیثیت نہیں دلا سکا۔ میں بات کرتا ہوں باچا جان سے، وہ خود چل کے آئے تھے، تمہیں بیانے تمہارے والی ہیں تمہارے سر پرست۔“

وہ میرا ہاتھ تمام کے باچا جان کے کمرے میں لے گئے۔ بستر پر نیم دراز باچا جان سنبھل کے بیٹھ گئے۔

”السلام علیکم باچا جان“ فیروز لالہ نے غصے کی آخری حد میں بھی تعظیم یاد رکھی۔

”آؤ فیروز آؤ“ انہوں نے درز دیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے فیروز لالہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شاید انہیں میرا پول کمرے میں گھسے چلے آنا پسند نہیں آیا تھا۔ اب تک ان کی کسی بہو کو اتنی جسارت نہ ہوئی تھی کہ وہ بلا اجازت ان کی تنہائی میں چل بیٹھتی۔

”باچا جان میں صرف آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا خنک خاندان میں عورت کی عزت صرف ماں، بہن اور بیٹی کے رشتے کے حوالے سے کی جاتی ہے؟ کیا بیٹے کی عزت گھرانے کی عزت نہیں کہلاتی جانی اور کیا بہو کو بیٹی والی تعظیم نہیں مل سکتی۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو فیروز۔“ باچا جان کے لیے سے ناگواری جھلک اٹھی۔

”صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں باچا جان“ اس نے میرے چہرے سے چادر سر کا کے

مجھے آگے کیا۔ باچا جان میرے چہرے پہ یہ گہرا نشان دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ سب کیسے ہوا اور کب؟“

”آپ یہ پوچھیے باچا جان کہ یہ سب کس نے کیا اور کیوں؟ اس لیے کہ یہ نشانات

حادثاتی نہیں ہیں۔ آپ کی صاحبزادی نے نا صرف اپنی بھالی بہن سمانی تشدد کیا ہے بلکہ نہایت بے رحمی سے رک رک کر ترین الزامات بھی لگائے ہیں جو اس خاندان کی بہو کے حوالے سے مومنہ کے لیے انتہائی شرمناک ہیں۔“

”اس نے کوئی الزام لگائے ہیں نہ ہی تشدد کیا ہے۔“ بی بی جان کمرے میں چلی آئیں۔

”نند بھانج کے جھگڑے کس خاندان میں نہیں ہوتے۔ بس کل بات ذرا زیادہ ہی بڑھ گئی اور وہ بھی سب اس کی وجہ سے ہوا۔ یہ پہاڑوں کی رہنے والی زبان دراز گنوار، خاندانی طوراً عوامی کر لیا جانے۔ اس کی زبان۔ تو یہ تو بہ..... زمر سا نگہ بھی مشتعل ہو گئی۔“

”یہ محض نند بھانج کا جھگڑا نہیں تھا بی بی جان۔ بلکہ یہ جھگڑا ہی نہیں تھا۔ جھگڑا اور طرفہ ہوتا ہے۔ یہ تو زیادتی تھی جو آپ کی بیٹی کی طرف سے ہوئی ہے۔ ظلم ہے جو اس نے میری بہن پر توڑا ہے، وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہے۔“

”تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟“ بی بی جان کو جلال آ گیا۔ فیروز لالہ نے نظریں جھکا لیں۔ ”آپ میری بزرگ ہیں میں آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا لیکن خدا کے لیے اپنی بزرگی کا مان رکھ لیں۔“

”سچ کیا ہے حضرت؟“ باچا جان گرے بی بی جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن بد بدکارے رہ گئیں۔ سچ کہنے کی ہمت نہ تھی اور جھوٹ وہ اپنے خان جی کے سامنے بول نہیں سکتی تھیں۔

”زمر سا نگہ کہاں ہے؟“ وہ بولے۔

”وہ بیجاری تو کل سے بیمار پڑی ہے۔ اپنی سمدھ بدھ ہی نہیں اسے۔ میں نے کہا ناں عورتوں کی لڑائی تھی، زبانی کلامی طغٹوں سے بات اس عورت نے آگے بڑھائی، زمر سا نگہ کو مارنے کے لیے آگے بڑھی تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے اسے دھکا دے دیا۔ غلطی سے آگے یہ جا پڑی۔ وہ بے چاری تو خود رشت اور خوف کے مارے بیمار ہو گئی ہے۔“ انہوں نے بھی ہوئی نظروں کے ساتھ بات بتائی۔ باچا جان کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کے میں نے کہا۔

”باچا جان ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا یقین کیجئے ان پہ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات میں تو ان کا اٹھا ہاتھ روکنے کی جسارت بھی نہیں کر پائی۔ سارا گھر گواہ ہے انہوں نے..... میرے ساتھ..... میں سبک اٹھی۔“

”مجھے ملانچے، لاتیں، گھونے مارے، گالیاں بدعائیں دیں۔ گندے الزامات لگائے، جلتی لکڑی میرے چہرے پہ رکھی۔ میں بچ کبھی ہوں باچا جان میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اللہ رسول کی قسم، میرا کوئی قصور نہیں۔“

”تو کیا اور تیری قسم کیا۔ جب اللہ رسول پہ تیرا ایمان ہی نہیں تو قسم کیوں اٹھاتی ہے۔ تو تو قسم اٹھا کسی بت کی، کسی سانپ کی، سورج کی، جن چیزوں کو پوجتے ہو تم کافر لوگ۔“ بی بی جان کے اس طعنے پہ فیروز لالہ بھڑکیا۔

”باچا جان، یہ آخری حد ہے، آپ خود اندازہ لگائیں اس گھر میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ یہاں نہ اس کے کردار کا احترام کیا جاتا ہے نہ ایمان کا۔ جب میں نے اسے رخصت کیا تھا تو آپ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آپ کے گھر میں اس کا پرانا حوالہ کوئی یاد نہیں رکھے گا۔ یہ وردگ جو حلی سے رخصت ہو رہی ہے، وردگ خاندان سے خٹک خاندان تک جاری ہے میں نے اپنا نام اس کے نام کے آگے لگا کے اسے آپ کے حوالے کیا تھا۔ بی بی جان نے اسے نہیں مجھے گالی دی ہے میرے خاندان کو دی ہے۔“

”خاندان خون سے ہوتا ہے، نسب سے ہوتا ہے فیروز تم بھی پٹھان ہو، ہم بھی پٹھان ہیں۔ یہ بات تو جانتے ہو گئے نلیس اپنا خون پیچتی ہیں تو نام کے آگے کوئی حوالہ لگتا ہے۔ میں ان پشتوں کو نہیں مانتی۔ زبانی کلامی کہہ دینے سے کوئی بہن ہو جاتی ہے نہ بھائی بن جاتا ہے۔“

”بی بی جان میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ باچا جان سے اجازت لینے آیا ہوں کہ مومنہ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب زریاب آگے گا تو ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔“ ابھی باچا جان کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ بی بی جان کہہ اٹھیں۔

”یہ نہیں نہیں جائے گی۔“

”کیوں نہیں جائے گی۔ اس کی حالت دیکھیں۔ یہ کمزور ہے، بیمار ہے، ذہنی ہے۔ اسے کس کے سہارے چھوڑ کے جاؤں میں۔ آخر آپ کی بیٹی بھی تو کافی عرصے سے یہاں

رہ رہی ہے۔“

”یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔“

”مومنہ بھی اپنے بھائی کے گھر جاری ہے۔“

”وہ اپنے شوہر کے ساتھ، اس کی اجازت سے یہاں آئی ہے۔“

”میں بھی باچا جان سے اجازت ہی طلب کر رہا ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں مومنہ سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ زریاب کے

آنے میں چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ بلکہ میں اسے جلد از جلد بلوانے کی کوشش کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم ہمیں رک کے اس کا انتظار کرو۔“ میں متذبذب کا شکار تھی میری ہچکچاہٹ دیکھ کے بی بی جان نے غصہ ابدالا۔

”شوہر کی غیر موجودگی میں قدم باہر دھرنے والی عورتیں بااعتماد نہیں ہوتیں۔ پھر بھی اگر جانا چاہو تو یاد رکھو پٹی میں تمہیں نہیں لے جانے دوں گی۔ تم پہ تمہارے اس نام نہاد بھائی کا اختیار چل سکتا ہوگا۔ خٹک خاندان کی بیٹی یہ وہ کوئی حق نہیں جما سکتا۔“ بی بی جان کا خیال ہوگا بچی کے بغیر میں جانے کا فیصلہ نہیں کر پاؤں گی، اور شاید ایسا ہی کرنی میں نہیں فیروز لالہ نے اصرار کیا۔

”مومنہ میری بات مان لو یہاں تمہاری عزت اور جان دونوں غیر محفوظ ہیں۔ تمہیں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے زندہ رہنا ہے، ورنہ سچ کو دبانے کے لیے یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس تبصرے پہ اب تک تجل سے بیٹھے باچا جان بھی ہلکے اٹھے۔

”فیروز خان تم بے ادبی کے مرکب ہو رہے ہو،“ میں اور بھی خوفزدہ ہو گئی۔

”ہمت کرو مومنہ، بچی ان کا اپنا خون ہے اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں اگر یہ رکھنا چاہتے ہیں تو کہنے دو چند دن کی بات ہے۔ زریاب سے رابطہ کر کے میں اسے فوراً واپس بلاتا ہوں۔ میرے گھر یہی ساری بات ہوگی۔ تم تیاری کرو۔ یہاں رہو گی تو یا تو پاگل ہو جاؤ گی یا بار بار گی جاؤ گی۔“ میں نے اک نظر باچا جان اور بی بی جان کے جلائی چہرے دیکھے، میرے رخسار سے ٹپٹپٹ اٹھنے لگیں۔ میں نے فیروز لالہ کو دیکھ کے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے چھوڑنے کے کپڑے اٹھائے اور مقدس کو پیار کر کے باچا جان کے پاس رخصت لینے آئی۔ دونوں نے منہ پھیر لیا۔

”تمہیں عزت کی بڑی خواہش ہے اور خود تم اس گھر کی عزت رو نہ کے جاری ہو۔ اس شخص کے ساتھ جو تمہارے ساس سر دونوں کی بے عزتی کر گیا تمہارے سانسے اور یاد رکھو تم اس گھر سے بغیر کسی رضامندی کے جاری ہو۔ نتائج کی ذمہ دار بھی تم ہی ہو گی۔“ باچا جان نے سرد لہجے میں کہا اور میں..... میں چلی گئی۔

مومنہ خاموش ہو گئی لیکن مقدس کو ایک تنہی سچی بچی کے رونے کی آواز اس اب تک آ رہی تھیں۔

☆☆☆

”بی بی جان میں شکستہ ہو چکا ہوں کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہ ہی دل اب اور کوئی گھاؤ سہہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“

جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔“

زرباب نے بے بسی کی آخری انتہا پہنچنے کے لی بی جان کے گلشنے تمام کے فریادی جو باچا جان کی بچی لگا ہوں سے ہار مان کے عرصے سے سینے میں دبا رکھولنے پر آمادہ تھیں۔ انہوں نے زرباب کے ہاتھ اپنے پہلو سے اٹھائے، بلوں سے لگا کے کہنے لگیں۔

”زرباب مجھے معاف کر دینا۔ میں خان جی کے سامنے، اپنے بیٹوں کے سامنے تم سے معافی مانگتی ہوں اور یہ اعتراف کرتی ہوں کہ تمنا کی کسوٹی پر میں کبھی نہ اتر سکی۔ ایک کمزور لہجے نے مجھے سنگے اور سوتیلے رشتوں میں ڈنڈی مارنے پر اکسادی۔ میری ذرا سی لغزش نے کئی زندگیاں برباد کر دیں۔ مجھے معاف کر دو میں تمہاری گناہ گروں۔“

”بی بی..... جان!“ وہ بے یقینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہتھکھلاہٹ اس کے چہرے سے ہویا تھی۔

”میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ خدا ارادہ مجھے پوری بات سنائیں۔ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟“

”یہ لیے میری بیٹی زرباب کی زندگی سے میری زندگی تک نقب لگا کے چلے آئے تھے۔ تم جانتے ہی ہو تمہاری بہن کی وجہ سے میں کتنی پریشان رہتی تھی۔ تیس سال سے اوپر ہونے کے بعد بھی اس کی شادی نہ ہو پاری تھی۔ شکل و صورت بھی اس کی واجبی تھی اور تعلیم بھی برائے نام تھی۔ اگرچہ خلک خاندان کی بیٹی کے لیے اس کے خاندان کا نام بھی بہت ہوتا ہے، صورت وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں لیکن اس کی قسمت کے خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی مرد نہ تھا۔ اور خاندان سے باہر لڑکیاں بیانیے کا ہمارا درواج نہیں تھا۔ ایسے میں بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ تنہائی بھری اور ماپوسی نے اس کے قدر چڑچڑا دیا اور مزاج بنا دیا تھا۔

تمہیں یاد ہی ہوگا خان جی نے مجھ سے اپنی بہن پر دبا ڈالنے کے لیے کہا جس کا عینا رحیم گل ہماری زر سے پندرہ سال چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ تامل تھا لیکن خان جی کے یتیم اصرار پر میں، بہن سے فریاد کر بیٹھی۔ میری محبت میں اس نے کسی طرح بیٹے کو منایا لیا یوں بھی سترہ اٹھارہ سال لڑکا ابھی اتنا خود سر کہاں ہوا تھا کہ احتجاج کر پاتا ماں باپ کے سامنے۔ لیکن اپنی ساری تنگی اس نے بیوی بچے کا نشانہ شروع کر دی۔

زرباب کوئی کم عمر اٹھو تو نہیں تھی کہ شوہر سے دب جاتی پھر شوہر بھی وہ جسے چند سال پہلے تک وہ گود میں کھلاتی رہی ہو۔ اس نے بھی رحیم گل سے لہجہ شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ ہماری برادری کا پہلا واقعہ نہیں تھا اس سے پہلے بھی کئی بے جوڑ رشتے ہو چکے تھے اور برے

بھلے بیٹھ بھی چکے تھے لیکن اب وقت بدل رہا تھا۔ تعلیم اور شعور نے ذہن تبدیل کر دیا تھا۔ نواز رحیم گل کثرت مزاج کی عمری بیوی کو بہن تسلیم کر سکا نہ ہی زرباب کے خواہوں کو تعبیر ملی اکھڑے اکھڑے رہنے والے کم عمر شوہر سے، رحیم گل کے ساتھ نے اس کی رہی سہی خود اعتمادی بھی چھین لی۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی اور تم یہ کہ رحیم گل کا رویہ اس کے احساس کمتری کو دوبارگی میں بدلنے میں مددگار ثابت ہونے لگا۔ وہ اس کے سنگھار پر تنقید کرتا، اس کی عمر اور شکل پر بے رحمانہ تبصرے کرتا، اپنی مظلومیت کا رونا روتا اور اس کی کم علمی اور بدزبانی کو کھوتا۔ زرباب نگاہ ہمیشہ یہ سب مجھ سے بیان کرتے ہوئے بلک پڑتی۔

”بی بی جان! باچا جان نے کیوں زبردستی مجھے اس کے سر منڈھا، میں اس چاہی ہستی کی طرح اس کے اوپر مسلط نہیں رہنا چاہتی۔ لوگ اسے ترمیم آواز نظروں سے دیکھتے ہیں اور مجھے ایسے پیسے میں کوئی جادو کرتی ہوں جس نے ایک شہر والے کو اپنی قید میں کر رکھا ہے۔“

بی بی جان! مجھے محرم ہی رہنا تھا تو خلک باؤس کے ہی کسی کو نے میں رکھ دیتے۔ غیروں کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اتنا کر کے، خالہ جی اب اٹھتے بیٹھتے جتنا ہیں کہ بہن کے بھکالے میں اس کے بیٹا ناقدوں میں رول دیا۔ ان کی بیٹیاں ماں کو سناتی ہیں کہ ہمدردی اور ترس کے نام پر اکھوتے بیٹے کے لیے اماں اٹھلائی ہو۔“

”صبر کر دے صبر۔“ میں اور کیا کہتی۔ ”وقت کے ساتھ ساتھ سب صحیح ہو جائے گا۔“ ”نہیں بی بی جان آنے والا وقت اور بھی تنہائی لانے والا ہے۔ ابھی رحیم گل کم عمر ہے۔ باپ کے زیر اثر ہے، پڑھ رہا ہے وقت کے ساتھ ملنے والے اختیارات اسے خود مختار بنادیں گے ابھی وہ بھوری کے ساتھ مجھ سے نہا رہا ہے۔ کل کو شاید۔“

”اچھا بول منہ سے نکال دے۔ تو اس بننے والی ہے ابھی بائیس سو جا کر۔ آنے والی اولاد تیری قسمت کھول دے گی۔“ لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اولاد اس کی قسمت میں اور اندھیرے لکھلائے گی، شادو جن دونوں پیدا ہوئے والی تھی، نذر سے نہیں تھی۔

مجھے تم مومن کو بیاہ لائے۔ یہ واقعہ اس کی ازدواجی زندگی میں نئی نئی محمول گیا۔ رحیم گل تمہیں اتنی آزادی کے ساتھ سن چاہی بیوی ملنے پر رشک و حسد کا شکار ہو گیا۔ اس کا نشانہ بچپاری زرباب نگاہ ہی ہوتی۔

”میں مانیان کرتا تم لوگوں کا پیدائشی حق ہے، ہے ناں؟ بیٹی کو خود سے آدمی عمر کا خوب صورت لڑکا چاہیے تھا، ماں بچک مانگ کے لے آئی۔ بیٹے کو بھنگی بھول پسند آیا۔ باپ سیلوں چل کے کوڑا لیا اور کچھ لوگ مجھ جیسے بے قسمت ہوتے ہیں۔ جن کی ذور سدا

دوسروں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔“

”لا رک شادی کا ذکر کیوں بار بار کرتے ہیں آپ؟ اگر انہوں نے پسند کی شادی کی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟“

”اور میرا قصور کیا تھا جسے اطاعت اور فرماں برداری کے سبق سکھائے گئے۔ جب میری ماں نے کہا کہ رحیم گل کو اس رشتے پہ اعتراض ہے تو تمہارے والدین نے میرے گھر آ کے میرے ماں باپ کو اپنی پڑھائی کی بجائے کہ مرضی کیا چیز ہے۔ اصل بات خاندانی ناموس کی ہے۔ خاندان کے بیٹے ہی خاندان کی عزت نہیں ڈھاپیں گے تو کیا باہر سے لوگ آئیں گے مجھے ہر طرح سے مجبور کر کے قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ زریاب کو کھلی چھٹی کس نے دی؟ تمہارے باپ نے ہی۔ اب کیوں برادری کی کوئی ذہنی عمر کی کنواری نظر نہ آئی؟ اُس کے یہ طعنے روز کا معمول بن گئے۔ زرے آخری دنوں سے تھی۔ اس حالت میں عورت ویسے ہی زور دینا اور حساس ہوتی ہے۔ رحیم گل نے اسے جلا جلا کے اور بھی ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ سنگ باری کر کے چلا جاتا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مومنہ پہ توجہ کرنے پہ مجبور ہو جاتی۔ تمہاری محبت نے اس پہ بھی گناہوں والا روپ چڑھایا تھا۔ اس کے جھل مل کرتے چہرے اور قلقل کرتی ہنسی زرے کے دل پہ برجھی بن گئی۔ وہ تم دونوں کو دیکھ کے کھسنے لگتی۔ تمہارے قہقہے اسے اپنے نوحوں پہ ہنسنے معلوم ہوتے۔ اپنی ناخوشگوار اور غیر متوازن زندگی کا قلق اسے رہنے لگا۔

ایسی ہی عجیب ذہنی وجہ بذاتی کیفیت میں اس نے شاد کو ختم دیا۔ کمزور صحت کی وجہ سے اس کا چڑچڑاپن عروج پہ پہنچ گیا۔ کسی کی ذرا سی بات بھی اسے مشتعل کر دیتی۔ رحیم گل پر ہفتے آتا اس کی حالت میں مزید ابتری پیدا کر کے چلا جاتا اور وہ اپنی بے بسی کا اظہار اپنی اولاد ملاؤں پہ لگا لکرتی۔ رفتہ رفتہ مومنہ بھی اس کا نشانہ بن گئی، پھر مقدس کے بعد جب تم کا رو باری دورے پہ گئے تو ایک بار پھر رحیم گل آیا۔ اسے اس کی ماں نے زرے ساگد کولانے کے لیے بھیجا تھا۔ بیوی کی حالت دیکھ کر وہ اور چڑ گیا حالانکہ یہ حالت سراسر اس کی دین تھی۔ زچگی کے بعد افسردگی اور زندگی سے بیزاری نے اسے صحت کی جانب لوٹنے ہی نہ دیا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کر اس کا سارا خون جل گیا تھا۔ چہرے پہ جھانیاں پڑ چکی تھیں، آنکھیں زرد اور ہاتھ پیرے جان۔

”اس لاش کولانے بھیجا ہے ماں نے ساری عمر تو میں ہی اولاد پیدا کرتی ہیں۔ تم نے نرمی تو نہیں کی جو چہ میمنے سے بسر سنبھالے پڑی ہو۔ اولاد کے بعد تو عورت کے چہرے

پہ نور آ جاتا ہے، تمہارے چہرے کی تو رہی سہی رونق بھی غائب ہو گئی ہے۔ اپنی بھادون کو دیکھو۔ گلاب کھل رہے ہیں چہرے پہ۔“

”تو جاؤ سگھلو، وہ تو جنگلی پھول ہے ناں بقول تمہارے۔ جنگلی سوغاتیں سب کے لیے ہوتی ہیں تم بھی حرا لے لو۔“

”شٹ اپ بدتمیز عورت کچھ تو لحاظ کر تمہارے چھوٹے بھائی کی بیوی ہے وہ۔“

”تم کیوں نہیں رشتوں کا لحاظ کرتے جب اس کے سن کے قہیدے پڑھتے ہو۔“

”کون سا قہیدہ پڑھا ہے میں نے؟ تم تو مفت میں بدنام کرنے والی عورت ہو، تمہارے سائے سے بھی دور رہنا چاہیے۔ منوں بڑھیا۔“ وہ زہر تھوک کے چلا گیا اور زرے ساری رات ان کڑوے الفاظ کی بارشیں رہی لیکن کمزور اعصاب کی عورت اتنا سب سہہ نہ کی جب اس کے اندر لاوا پک کے تیار ہو گیا تو وہ کمرے سے نکلی اسے پتا چلا کہ مہمان خانے میں رحیم کے ساتھ مومنہ بھی موجود ہے تو جیسے آتش فشاں پھٹ گیا۔ اتنے دنوں سے اس کے اندر جمع ہنجز اس ایک دم ہی نکل گئی اس نے مومنہ اور اپنے شوہر کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ وہ بھی غصے سے باہر نکل گیا اور مومنہ بھی ضبط نہ کر سکی اس کے منہ سے جواب سن کر زرسا نگہ بالکل ہی دیوانی ہو گئی اس نے..... اس نے تمہاری بیوی پہ ہاتھ اٹھایا۔ میں نے، وگمہ نے، سرحدی نے سب نے اسے قابو کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ جیسے کوئی جن جن اس پہ قابض ہو گیا تھا اتنی طاقت اس کے اندر بھر گئی تھی، عجیب سی وحشت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی، میں خوفزدہ ہو گئی وہ بار بار خود کو چھوڑا لیتی اور مومنہ پہ مل پڑتی، ہاتھوں، پیروں کے بے دریغ استعمال کے ساتھ اور پھر..... میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آتش دان سے ٹکڑی نکالی اور مومنہ کا..... مومنہ کا چہرہ داغ دیا۔“

زریاب دم بخود بیٹھا رہ گیا۔ داب اور افراسیاب کے چہروں پہ بھی استعجاب تھا جب کہ بی بی جان نے ایک بار بھی نہ نظر اٹھائی نہ چہرہ۔ ان کے جھکے چہرے سے آنسو ٹپک ٹپک کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ پڑنے لگے۔

زریاب کے تصور میں مومنہ کا بے داغ ہنسا ہوا چہرہ آیا اور شعلے..... اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

”میں باقی ہوں مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے مومنہ کی دلجوئی کرنا چاہیے تھی اگر میں اس وقت اسے سنبھال لیتی تو شاید حالات اتنے خراب نہ

ہوتے لیکن زمر سانگہ کی کیفیت نے میرے ہاتھ پاؤں پھلاد دیے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور ڈاکٹر کے مطابق اگر یہ کچھ دیر اور ہوش میں رہتی تو اس کی دماغ کی شریان کا پھٹنا یقینی تھا۔ دوسری طرف غم وغصے اور بے بسی کا شکار مومن نے میری لاعلمی میں فیروز کو مدد کے لیے طلب کر لیا۔ خان جی اب تک سارے قصبے سے امتحان تھے۔ لیکن اب ان کے ساتھ ساتھ سارے گھر کو علم ہونے والا تھا کہ زمر سانگہ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔ جب اسے ہوش آنے پہ علم ہوا کہ فیروز مومن کے ساتھ خان جی کے کمرے میں ہے اور زریاب کو بلوانے کا فیصلہ ہو رہا ہے تو وہ سراسیمہ ہو گئی۔ میرے ہیر پکڑ کے منت کرنے لگی۔

”بی بی جان زریاب کو کچھ پتا نہ چلے۔ وہ پاگل ہو جائے گا اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ کے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

”اسے تو پتا چل ہی جائے گا زمرے، مومن کا چہرہ خود بتا دے گا۔ یہ تو نے کیا کیا بد نصیب۔“ میں نہ جانتے ہوئے بھی اسے کو سننے پہ مجبور ہو گئی۔

”رجیم گل پہلے ہی مجھے بسانا نہیں چاہتا۔ اب مجھ پہ پاگل پن کا الزام لگا کے مجھے رسوا کر دے گا بھائی کی نظروں سے بھی کر کے میں کہاں جاؤں گی۔ میں تو ہر طرف سے بے وقعت ہو جاؤں گی بی بی جان۔“ وہ ہلک بھلک کر رو رہی تھی۔

”یہ تو پہلے سوچنا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے بات میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی جب تو آگ اٹھا کے اس پہ لگی تھی۔ زریاب کی حیثیت کا منہ جلادیا تو نے۔ وہ تو اک پل یہاں نہ رہے گا اب۔“

”کچھ کرو بی بی جان، کچھ کرو زریاب کے آنے سے پہلے پہلے کچھ ایسا کرو کہ میں بچ جاؤں، دنیا مجھے جینے نہیں دے گی۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ سسرال والے پاگل کہہ کے ٹھکرائیں گے تو بھائی بھی نفرت کریں گے۔ مجھے بھالو۔ زریاب کو کچھ پتہ نہ چلے۔ دو۔ مومن کے پاؤں پکڑ کے منت کروں گی میں، اسے کسی طرح جانے سے روک دو میں اس سے معافی کی بھیک مانگوں گی، بھوں کی میرا نام وہ مت لے۔“

”اور اگر وہ نہ مانتی تو؟“

”تو..... تو پھر میں اسے مار دوں گی۔ جب میں اس کا چہرہ جلا سکتی ہوں تو پورے کا پورا بھی بھسم کر سکتی ہوں۔ وہ نہ رہے گی تو کون بتائے گا زریاب کو، کیسے چلتے چارے جاریم گل کو۔“ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر چڑھ گئیں اور ہاتھ جیر مڑنے لگے۔ گردن کو خنیف سے جھکے لگنے شروع ہو گئے۔

میں ہار گئی..... ممتا کے ہاتھوں..... ساری عمر پلڑا سلامت رکھا..... ایک لمحہ ایسا نہ آیا اسنے سالوں میں کہ تم میں اور افراسیاب میں دراب اور زمر سانگہ کے مقابلے فرق برتا ہو، لیکن اس وقت..... لیکن نہیں..... شاید زمرے کے بجائے میری کوئی اور بھی اولاد ہوتی تو میں بھی کرتی..... چاہے تم ہوتے چاہے دراب..... جب کسی ایک اولاد کی جان پہ بن آئے تو ماں سب کر گزرتی ہے میں نے سوچا تمہاری ہڈا دی شدہ زندگی میری بیٹی کی جان سے قیمتی تو نہیں ہوگی۔ بیٹا سلامت ہوگی۔ تو ہوئیں اور مل جائیں گی اپنی لاڈلی کہاں سے لاؤں گی۔ میں کیا جانتی تھی میں تو سب کچھ گواہی جان رہی تھی سب کچھ۔

میری ہر کوشش کے باوجود فیروز مومن کو لے گیا خان جی مومن کے ساتھ ہونے والے سلوک سے ناخوش تھے لیکن فیروز کے اشتعال انگیز جملے انہیں بھی ناگوار گزر رہے میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کے انہیں اور درغلا یا اور ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ میں جانتی تھی فیروز کے بلانے پہ زریاب فوراً چلا آئے گا۔ اور پھر۔ مومن کی زبانی سب کچھ نہ کر..... یہی تو میں نہیں جانتی تھی بیٹی کے ساتھ ساتھ مجھے بیٹا بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا میں نے زریاب کو خان جی کی بیماری کی اطلاع دے کر فوراً آنے کو کہا۔ میرا پیغام جب اسے ملا جب تک تو فیروز اپنے گھر بھی نہ پہنچا ہوگا۔ زریاب اطلاع ملتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا اس طرح فیروز سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن جب..... بی بی جان نے کہتے کہتے سر اٹھایا، کمرے میں موجود تمام نقوش پہ ایک نظر ڈالی، پھر ان کی نگاہیں کم صم بیٹھے زریاب پہ جم گئیں۔

”تیسرے دن تم..... تم آئے تو میں حواس باختہ ہو گئی۔ خان جی کا غصہ کم ہو چکا تھا۔ وہ میری چال میں شریک ہونے سے انکاری تھے بلکہ انہوں نے مجھے سختی سے باز رہنے کا حکم دیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا میں نے اپنی عمر بھر کی وفاؤں اور خدمتوں کے بدلے ان سے یہ گستاخی کا حق مانگ لیا انہیں اللہ اور رسول کے واسطے دیے، اولاد کی قسمیں دے کر مجبور کر دیا۔ وہ چپ کر گئے اور میں نے انہیں.....“

ان کی آواز لڑکھرائی تو زریاب نے ہاتھ کھڑا کر کے انہیں خاموش رہنے کی استدعا کی۔ وہ جانتا تھا آگے کیا ہوگا۔ بوٹھل قدموں کے ساتھ وہ دائیں طرف موجود بڑی سی کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

شفیق کی لالی حد تک خون کی نیکر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بی بی جان کے سالوں پہلے کہے بہ رم الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔

”میں نہ کہتی تھی زریاب، نسب کے بغیر اصول کچھ نہیں ہوتا۔ جنگل کے پھول جنگلوں میں ہی رہ پاتے ہیں۔ تمہاری وہ بیوی چار دن تمہارے بغیر نہ رہ سکی۔ تمہارے جاتے ہی وہ تمہارا دوست فیروز جو خود کو اس کا بھائی بتاتا ہے، تو پتہ ہے کیسے رشتوں کو پامال کرتے ہیں۔ بے پردہ بیوی آجاتا تھا ملنے، اس سے پہلے مجھے اعتراض نہ ہوا پھر لوگ باتیں بنانے لگے آخر خون سارہ والا بھائی تھا۔ گھٹاؤں کرے میں بند رہتے تھے۔ میں نے صاف الفاظ میں ٹوکا تو وہ تو کھل کر ہی سامنے آگئی۔ بے شرمی سے اپنے اور اس کے تعلقات کو تسلیم کرتے ہوئے کہنے لگی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تمہیں اپنا بیٹا مبارک ہو جس نے مجھے یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ میں فیروز کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میری تمام تر خوشیاں اسی کے پاس ہیں نامراد بیٹی تک چھوڑ گئی۔“ وہ چیخ اٹھا تھا۔

”بس کریں بی بی جان، آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں اس کے متعلق کہہ رہی ہیں اور کس سے کہہ رہی ہیں۔“ اس وقت ملیش کے مارے اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ اپنا سر سامنے کی دیوار سے پھوڑ ڈالے، کیونکہ یہ لغو ترین بات کہنے والی اس کی معزز ترین بی بی جان تھیں جس سے بے ادبی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس قدر فضول باتیں۔

”پانی سرے اونچا ہو چکا ہے زریاب تمہیں یقین نہیں تو اپنے باپ سے پوچھو، میں تو ساس ہوں ناں اس کی اور تمہاری سوتیلی ماں۔ جھوٹ بھی کہہ سکتی ہوں، اس گھر کے ہر فرد سے پوچھ لو۔ کس نے شرمی اور بے غیری کا مظاہرہ کر کے گئے ہیں تمہارا دوست اور تمہاری بیوی۔ دیکھو خان جی کی حالت اور جا کے دیکھو زریاب کو۔ کہہ کیسے بے سدھ پڑی ہے۔ یہ تماشا بھی تو جایا تھا اس گھر کے درود دیوار کے لیے۔ میں تو کہتی ہوں میں زندہ ہی کیوں ہوں یہ سب دیکھنے کے بعد شاید تمہاری آنکھوں میں بے اعتباری کے رنگ دیکھنا باقی تھے یا شاید تم سے جھوٹا ہونے کا الزام سننا باقی تھا۔“

”بے حیا میرے سامنے ہی کتنا گندک بگئی۔ کہنے لگی زریاب جیسے شخص مرد کے ساتھ کوئی عورت چار دن بھی خوش رہ لے تو بڑی بات ہے۔ ہر وقت رنگوں میں گم رہنے والا دیوانہ۔ میں تو فیروز جیسے مرد کے پیچھے جاتی ہوں جسے مرد کہنے میں بھی حرا آتا ہے۔“

بی بی جان کا یہ جملہ زریاب کو بھڑکا دینے کے لیے کا تھا۔

”موم..... نہ..... وہ چیخا۔“

”میں چھوڑوں گا نہیں اس ذلیل عورت کو نہ ہی اس بے غیرت شخص کو۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکی دونوں نے۔“ غیرت دھسنے سے وہ کپکپانے لگا۔

”دفع کرو مردوں کو۔ تیرے خفیہ بیچ اس کا فرن ہے، جانے دے جہاں مرضی خواہ ہوتی پھرے اس کی منزل یہ گھر تھا ہی نہیں شکر ہے تمہاری بچی محفوظ رہی ہے۔“

”ایسے کیسے دفع کروں..... وہ میری مردانگی کو کالی دے گئی ہے، فیروز میری دوستی کا خون کر گیا ہے۔ میں بے غیروں کی طرح بیٹھ جاؤں..... نہیں بی بی جان..... میں اس دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ دیوار سے لگی رانگل اٹھا کے باہر چکا۔

”زریاب..... رک جاؤ۔“ وہ لپکریں باجا جان اٹھتے اٹھتے کر پڑے۔ اچانک ہی فالج نے ان پہ حملہ کر دیا۔ حضرتی بی نے ایک نظر شوہر کے اٹھنے سے دئے وجود پر ڈالی دوسری نظر ظوفان کی طرح باہر نکلتے کر ذلیل بیٹے پر ڈالی۔ پہلی بار انہیں اپنے فیصلے کی عکسگی کا احساس ہوا۔

☆☆☆

ہر ویلے تانگن یار دیاں
میں تاں بیٹھی کاگ اڈواں

وہ دودن قیامت کے دن تھے۔ کہتے ہیں ناں روزِ شرمی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا۔ وہی حال میرا تھا ناں دونوں، فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہ تھا۔ میری سانسیں ابھرتی تھیں، ڈوٹی تھیں اور ہر سانس کے ساتھ تسبیح کے دانے کی طرح ایک نام سینے میں گر جاتا تھا۔

زریاب.....

میں پاگلوں، دیوانوں کی طرح حویلی کے دروازے تک دن میں کئی پھر لگایا کرتی۔ ہر آہٹ مجھے اس کے آنے کی خبر دیتی اور اسے نہ پا کے مارے مجھے بھلاہٹ کے میں شرمیے

ہواؤں سے لڑ پڑتی۔ آپ دیکھاں کہ میں قاصد دیکھاں
میرا تھی گیا حال نماں

فیروز لالہ سے جرح کر کے میں نے زنج کر ڈالا۔

مجھے یقین نہ آتا کہ وہ زریاب سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مجھے لگتا جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔

”کہیں زریاب نے آنے سے انکار تو نہیں کر دیا، کہیں میرا بغیر اجازت گھر سے نکلنا اسے ناراض تو نہیں کر گیا، کہیں بی بی جان نے اسے بھی تو یہ کہہ کر نہیں ورغلا یا کہ زریاب گم ہے جھگڑا ہوا بھانے میں ساری غلطی میری ہے۔“

میری ہر سوچ کی تان انہی خدشوں پہ آ کے ٹوٹ جاتی۔ اس کی ناراضگی کا ہلکا سا

نسل کی عورت..... جسے عزت راس نہ آئی..... بلا اسے..... اس کے سامنے میں تیری لاش گراؤں گا..... تیری، جس کے ساتھ وہ اپنی ”خوشی“ اور ”مرضی“ سے آئی ہے اور اسے..... اسے میں یہاں نہیں ماروں گا..... بے وفا ہی کبھی ہے تو میری بیوی..... اس کے نام کے آگے میرا نام لگا ہے، اس کی ناپاک لاش میرے ہی گھر میں کسے گی..... میں اس کا خون بھی کسی غیر زمین پہ بہانا پسند نہیں کرتا..... وہ کیا ہتھی ہے میرے جیتے جی دوسرا یاد دھونڈ نکالے گی۔“

”زر۔ زیاب.....“ آنکھیں میٹھا کے اس کے زہرا گھلتے لہجے پر غور کرنے والا فیروز لالہ جیسے کسی خواب سے جاگ کے دھاڑا تھا۔

”زر زیاب..... ہوش میں رہ کے بات کرو۔“ وہ دونوں کچھ گھما گئے۔ میں اسی طرح سگی مورتی کی طرح جیسے دبلیز پر نصب، گرنے آٹھنے سے کے انداز میں اندر بھاگتی رہی۔ مجھے زریاب کے ہلاکت میں ڈال دینے والے جملے بھی سنائی دیے تھے اور فیروز لالہ اور اس کا ایک دوسرے پر جھپٹنا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں سے خون ٹپک کے مٹی میں گر رہا تھا اور پھرائی ہوئی بے یقین آنکھوں سے بے آواز آنسو اس خون کو پتلا کر کے مٹی میں جذب ہو رہے تھے، مجھے لگ رہا تھا جیسے اب کبھی میں ہل سکوں گی نہ ہی بول پاؤں گی۔ اچانک فائر کی آواز نے مجھے ہلا کے رکھ دیا اور میرے اس گمان کو توڑ کے رکھ دیا۔ لرزتی ناگوں پہنچتے ہوئے میں نے آخری بار فیروز لالہ کو خون میں لت پت زمین پہ گرتے دیکھا۔

حجرے کے دوسری طرف سے بہت سے بھگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید فائر کی آواز نے ملازمین کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے زمین پہ گری چادر اٹھائی، اپنے گرد لیٹی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔“

مومنہ خاموش ہوئی تھی لیکن دروازے کے اس طرف کھڑی مقدس اور دوسری جانب اس کے قریب ہی بیٹھا خوشنود..... دونوں کتنی ہی دیر اس کے دوبارہ بولنے کے منتظر رہے۔ لیکن..... مومنہ کے خشک لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے، ننھے ننھے ستارے پروئے ہوئی پگلیں بند ہو گئی تھیں۔ پپوں کی ہلکی سی لرزش اس بت میں جان ظاہر کر رہی تھی۔

”پھر.....؟“ خوشنود اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار اپنے دادا اور تایا سے باپ کی المناک موت کا واقعہ سن چکا تھا لیکن اتنی تفصیل سے سننے کے بعد اور وہ بھی ایسی ہستی کی

زبانی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے زندگی سے موت کی جانب جاتے دیکھا تھا، ایک عجیب سی نگاہ اور ادا سی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طویل سر آہ بھرنے کے بعد اس نے کافی دیر سے خاموش ساکت لپٹی مومنہ کو مخاطب کیا۔ اس کی پگلیوں میں خفیف سی جھنجھ پیدا ہوئی۔

”پھر.....؟ پھر بیس سال..... وہ بیس سال صرف میرے تھے ان بیس سالوں میں اور کوئی نہیں..... نہ فیروز لالہ..... نہ مقدس..... نہ کوئی اور..... بس میں ہی..... بلکہ شاید میں بھی نہیں نہیں تھی..... بس بیس سال تھے..... خالی..... تنہا کیلے..... بیس سال..... ان کا کیا بتاؤں تمہیں..... تم جانتا چاہتے تھے وہ میں نے بتایا ہے وہ بھی صرف اس لیے کہ تم نے فیروز خان وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا اور اس کے اور لائی کے مجھ پہ بہت سے قرض ہیں۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی، خوشنود نے سہارا دے کے اسے بٹھایا۔

”خوشنود..... اب تو تمہیں یقین آ گیا کہ تمہارا باپ سے موت ضرور مارا گیا لیکن بالکل بے قصور..... وہ مجھ سے کچھ گناہ آدمی تھا۔ جہاں جاتا رشتے بنالیتا یہی رشتے اسے ڈس گئے۔ زریاب نے اس کے جذب کو مٹی میں رول دیا۔ اس دن صرف فیروز لالہ نہیں مرا تھا..... خلوص اور موت کی موت ہوئی تھی، سچائی کا خون ہوا تھا۔ میں بڑی سے بڑی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ وہ شخص مجھے تو کیا کسی عورت کو غلط نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا مجھے تو ہرگز نہیں۔ اس لیے بھی کہ اس نے مجھے بہن کہا بھی نہیں مانا بھی تھا اور اس لئے بھی کہ میں زریاب کی بیوی تھی، اس زریاب کی جسے اپنا سب سے قریبی دوست کہتا تھا وہ اور اس زریاب نے ہی.....

میرے سالوں سے مرے ہوئے دل میں اچانک ایک شدید حرکت پیدا ہو جاتی ہے، جب مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نبانے زریاب کی طرح اور کتنے لوگ ہوں گے جو اس کے اور میرے رشتے کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ میرا بس چلو اپنی جان دے کے بھی سب کو یقین دلادوں کہ وہ میرا لالہ تھا میرا بھائی..... صرف اور صرف بھائی۔ تم..... تم تو یقین کرتے ہو ناں میری بات کا۔“ اس کے سر ہلانے پر مومنہ نے سکون سے سیکے پر سر ٹکا دیا۔

”تو تمہاری نسلی ہو گئی اب۔“

”لیکن.....“ دروازے نے بے آواز حرکت کی اور مقدس دو قدم اندر چلی آئی۔ اس کی آواز پہ خوشنود بری طرح چونک کر بیچھے چلا۔ مومنہ بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ساتھ

اٹھ بیٹھی اس کی بچٹی بچٹی آنکھیں ہلکے نیلے شلوار قمیص اور سفید بڑی سی چادر میں ملیوں اس کم عمری ”مومنہ“ نے جچی تھیں جس کے چہرے پر اتنی ہی تھکان تھی، آنکھوں میں اتنی ہی ویرانی تھی، جتنی کہ اس بستر پر بڑی ”مومنہ“ کی آنکھوں اور چہرے پر تھی۔

”لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔ میری..... یعنی مقدس زریاب خشک کی..... بہت سے سوال ہیں جن کے جواب مجھے چاہئیں..... اگر ڈاکٹر خوشنود نے اپنے سوالات کے لیے فیروز علی دروگ کا پناہ ہونے کا حق استعمال کیا ہے تو میں زریاب خشک کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں زریاب خشک جو آپ کا شوہر ہے..... اب بھی..... ابھی تک..... آپ..... آپ..... مومنہ علی..... آپ میری ماں ہونے کی حیثیت سے مجھے جواب دہ ہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتی اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بیڈ تک گئی۔ مومنہ مگر کمر دکھتے ہوئے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اگر وہ اپنا تعارف نہ بھی کرتی تو تب بھی اسے سینڈرنگٹن مقدس کو پہچاننے میں وہی پیشانی..... وہی سنہری رنگت..... ہلکے ابروؤں پہ قطار کے ساتھ بنے وہی بھورے تین تل..... جو اس کے چہرے پر قدرتی تھے..... اور وہی نیلی کانچ سی جلی جلی آنکھیں۔

”یوں لگتا ہے جیسے نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کسی نے ہیرے چور چور کر کے بکھیر دیئے ہوں۔“ اس کی ہلکیوں پہ ننگے آنسو دیکھ کے مومنہ کو وہ بات یاد آئی جو زریاب نے اسے پہلی بار دوتا دیکھ کے کہی تھی۔ اس نے سالوں سے سسے باز اپنی بیٹی کے لیے پھیلا دیئے۔ اس کا دل الجھل الجھل کے پسلیوں تک پہنچ لگا لگا لڑائی کو چھپائی سے سونے کے لیے، لیکن..... لیکن وہ دل خود ہی حیران سا ہو کے رک گیا..... وہ باز خود ہی پشیمان سے ہو کے گود میں دوبارہ آگرے جب اس نے مقدس کو کسی جذبے اور احساس کے بغیر وہیں کھڑے خود کو گھورے پایا۔

”تو تم بھی..... تم بھی ان میں سے ہو جنہیں یقین کرنے کے لیے میری جان کی ضرورت ہے..... آہ..... مجھے خبر نہ تھی کہ میرا اپنا خود بھی مجھے اے اعتبار جانے گا۔“

”میں یقین کر سکتی ہوں بلکہ مجھے یقین ہے ان سب باتوں کی سچائی کا جو آپ نے کہیں لیکن.....“ اس کے الفاظ پھر سے مومنہ کو زندہ کر گئے۔

”لیکن یہ آدھا سچ ہے..... سچ بھی اودھار نہیں ہوتا..... کبھی مصلحت پسند نہیں ہوتا..... سچ کبھی بزدل نہیں ہوتا..... سچ گورو پوشی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی..... آپ کہہ رہی تھیں ناں

ابھی کہ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کر سب کو یقین دلا دوں کہ فیروز اور میرا کیا رشتہ تھا تو پھر..... آپ نے یقین کیوں نہ دلایا۔ آپ کے چہرے پہ ظلم کا یہ نشان گواہ ہوتا آپ کی بے گناہی کا۔ جو محبت میرے باپ کو مشتعل کرنے کا سبب بنا تھا وہ اگر اتنا ہی بے بنیاد اور کھوکھلا تھا تو آپ ایک ہی وار میں اسے مسمار کر سکتی تھیں لیکن آپ نے ایسا نہ کیا..... آپ نے ایسا کرنے کی کوشش ہی نہ کی..... آپ فرار ہو گئیں..... کیوں..... کس لیے؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”نیمک میں جانے لگی تھی پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہوتے ہیں“ مومنہ نے سر کوئی، کی، ایسی سرگوشی جسے صرف وہ ہی سن سکتی تھی۔

”آپ بتائی کیوں نہیں ایسا کیا تھا جس کو چھپانے کے لیے آپ خود چھپنا پڑا؟“ ”کچھ نہیں.....“ وہ ضبط نہ کر سکی اور اتنی غصہ کے باوجود چیخ اٹھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا اور رنگ زرد پڑ گیا تھا خوشنود کے اندر کا ڈاکٹر بیدار ہو گیا۔ اس نے فوراً اٹھ کے زس کو تیل دی اور اسے سر سے مٹی پہلی بار مقدس کو مخاطب کیا۔

”مس مقدس..... ہو سکے تو آپ کل تشریف لے آئیے ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ یہ کوئی شدید اعصابی اور جذباتی جھٹکا سمجھیں۔“ اس نے اسے دیکھے بغیر پیشہ دارانہ سی رائے دی۔ جسے ان ہی کرتے ہوئے مومنہ پہنچتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں کچھ چھپانے کے لیے فرار ہوئی تھی نہ ہی اپنی جان بچانے کے لیے۔ میں اس کے ہاتھوں مر کے اس کی جھوٹی فطرت کی تسکین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں..... میں تین دن تک بھوک پیاس صرف اس کے انتقال میں راستے کا پتھر بنی رہی، اس کی راہ نکتی رہی۔ وہ آئے گا تڑپا ہوا آئے گا..... میری حالت دیکھ کے اس کا خون کھول جائے گا..... مجھے ملنے والے ایک ایک زخم کا حساب لے گا وہ..... اور وہ آیا..... مجھے ایک نیاز خدے دینے کے لیے..... میری رہی سہی جان بھی نکالے کے لیے..... مجھے مان دینے والے واحد شخص کو مجھ سے چھیننے کے لیے..... میں سہہ جاتی؟ تاؤ میں ایسے ہی سہہ جاتی؟ میں کچھ نہ کرتی؟ میں نے بھی وہی کیا جو مجھ کرنا چاہیے تھا..... ایک ہاری ہوئی..... روندی ہوئی ریزہ ریزہ عورت کو کیا کرنا چاہیے تھا..... میں نے..... میں نے.....“ اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

”میں نے وہی کیا..... بالکل ٹھیک کیا..... زریاب کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔“ وہ غڑ خال ہو گئی۔ خوشنود نے بے بسی سے نہ چاہتے ہوئے بھی مقدس کو دیکھا وہ چپ

چاپ لائے قدموں باہر نکل گئی۔
 نرس نے کچھ ہی دیر میں مومن کو پرسکون کر دیا۔ آکسیجن کی نالی اور مصنوعی دھڑکنوں کے سہارے وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ اس کا ہاتھ خوشنود کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنی الجھن سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے رہ رہ کے مقدس پہ غصہ آتا جو جاتے جاتے اسے بھی ایک سوال میں الجھا گئی تھی۔

اس عورت کے ایک ایک لفظ پر ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔ خود اس کی ماں کی گواہی بھی کافی تھی اس لیے ہی تو وہ اتنی اپنائیت اور عقیدت کے ساتھ اسے پھونکی جان کہتا تھا لیکن..... پھر وہ فرار۔ یہ اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ زریاب پہ اس کا غصہ کچھ میں آنے والی بات ہے لیکن اولاد تک سے چھپ کر زریاب کو تو قانون سے سزا دی تھی۔ یہ الگ بات کہ بار بار کی اپیل نے سزائے موت کو غیر قید میں بدل دیا تھا لیکن پھر.....
 وہ سر جھٹک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بی الحال مجھے ان کے مکمل صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔“

اس نے سوچا حالانکہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جس قدر خراب حالت میں وہ اسے اٹھا کے اس ہاسپٹل تک لایا تھا، اس کے بعد اس کا نہ صرف بچ جانا بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اتنی دیر گفتگو کرنا بھی ایک معجزہ ہی تھا اور اب ایک اور معجزہ ہی ہوگا اگر مومن ان مصنوعی سہاروں کے بغیر بھی زندہ رہ لے۔

وہ پوری رات اس نے موت سے لڑتے لڑتے کزاری۔ ہر بار ہوش میں آنے کے بعد اس کے لبوں پہ مقدس کا نام ہوتا اور پھر وہ ڈھے جاتی۔ اس کی ڈھنکی بھینس اور کئی دھڑکنیں خوشنود کو گھر مند کر جاتیں لیکن رات گزرتے ہی جیسے وہ پھر سے خدا سے زندگی مانگ لاتی۔ شاید وہ خود بھی کسی کے دل میں اپنے لیے بدگمانی اور خدشہ چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتی تھی۔

”تم..... تم خوشنود..... تم کیسے جانتے ہو مقدس کو؟“ ذرا سنبھلتے ہی اس نے سوال کیا۔ ایسا سوال جس کا اصل جواب دینا شاید خوشنود کے لیے خود کو ہار دینے کے مترادف تھا۔ ”بس کچھ ہی دن پہلے اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی لیکن درحقیقت وہ پہلے ہی آپ کی تلاش میں تھیں۔ انہیں کسی نے آپ کے لاہور میں ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ آپ کے ساتھ رہنے والی اماں برکتے تک تو وہ پہنچ ہی چکی تھیں اور ایک دن اماں کو میرے ساتھ دیکھ کے مجھ سے پوچھنے لگیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں کہ ان کا

آپ سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے، میں کچھ سوچے سمجھے بغیر آپ کے پاس لے آیا۔ مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو پہلے آپ سے ذکر کر لیتا۔“
 ”میں نے کہا بھی تھا کہ کسی کو میرے متعلق پتا نہ چلے اور کیا تمہیں اس کی صورت دیکھ کے کبھی کچھ محسوس نہ ہوا۔“
 ”ہوا تھا..... بہت کچھ محسوس ہوا تھا۔“ وہ کھو یا کھو یا سا سانسے رکھے پھولوں کو بے دھیانی سے نکل رہا تھا۔

”تمہیں تو اسے دیکھنے ہی پتا چل جانا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔“

”میں نے کہا نا.....“ وہ خود کو کبھی بھلا چکا تھا۔

”میں نے کہا نا میں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں..... اس سے جتنا تو کہیں جاتا۔ مجھے کچھ یاد نہ تھا نہ آپ کی ہدایت نہ کچھ اور..... وہ سانسے ہو تو پھر مجھے بس.....“ خوشنود..... مومن نے یقینی سے پکار بیٹھی۔ اس کی غبار غبار ہوتی آنکھیں جھلک پڑیں اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ ہفت سے اس کا گندمی چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔

”خوشنود بس ایک بار اور میری مدد کرو۔ مقدس کو ایک بار میرے سانسے لے آؤ مجھے اسے کچھ کہنا ہے..... اب تو مجھے اس سے سب کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ بات صرف میری نہیں رہی۔ وہ کہانی جو مجھ سے شروع ہوئی تھی۔ وقت نے اس میں کتنے کردار شامل کر دیے ہیں۔ مجھے اب ہر کردار کا حق پورا کرنا ہے اسے بلاؤ۔“

”نہیں پھونکی جان“ اس نے اپنی معذوری ظاہر کی۔

”آپ میرے لیے قابل احترام کی لیکن میں کیسے بھولوں کہ وہ خان زریاب خٹک کی بیٹی ہے۔ مجھے اس کے سامنے جانے پوچھو مت کریں۔ میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔“
 ”وہ صرف تمہارے ذہن کی بیٹی نہیں تمہاری پھونکی کی بیٹی بھی ہے اور تمہاری پھونکی بھی ان مہمان سانسوں کے ساتھ اپنی اکلونی اولاد کو دیکھنے کی خواہش کر رہی ہیں۔ کیا تم اس کی یہ خواہش پوری کرو گے۔“

وہ چپ چاپ نمبر پش کرنے لگا۔

”نہیں ڈاکٹر خوشنود..... میں نہیں آ سکتی۔ جس ماں کی تلاش نے مجھے اتنا بھڑکایا، اس کے مل جانے نے مجھے اور الجھا دیا ہے جب تک وہ میری اس بات کا تسلی بخش جواب نہیں دیں گی کہ وہ کیا وجہ تھی جس نے انہیں اپنی اولاد تک کو فراموش کر دینے پہ مجبور کر دیا،

میں کبھی انہیں اپنی ماں تسلیم نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی بچپن کی تمام خوفزدہ کردینے والی راتوں اور محرم جاڑوں کا حساب چاہیے۔“

”خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی ماں کو اس حساب کتاب کے لیے زندہ رکھے۔“ اس نے منہ پر ہونے لگے میں کہا۔

”جی۔ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ مس مقدس کہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں اس حقیقت کو جھٹلاتے نہیں سکتیں کہ وہی آپ کی ماں ہیں۔ ایک اگلی اولاد ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ ان کے آخری وقت میں ان کے قریب رہیں۔ ان کے کیا فرائض تھے کیا تھیں، اس بحث میں پڑنے کا کافی الحال وقت نہیں ہے۔“ اس نے صاف صاف کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کی توقع کے عین مطابق آدھے گھنٹے کے اندر اندر مقدس وہاں موجود تھی۔ اس نے کمر اٹھا کر نکل جانا چاہا لیکن مومنہ نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

”مقدس! میری بیٹی! کیا تمہارے دل میں اپنی ماں کے خلاف اتنا زہر بھردیا گیا ہے کہ برسوں بعد ملنے کے باوجود تم نے اپنی ماں کے گلے لگانا گوارا نہ کیا۔ میری باتیں چھٹی روہ لگائیں اور تم..... واپس چلی گئیں۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں میرے دل میں زہر ہے نہ ذہن میں کسی قسم کا کوئی شک۔ آپ نے خود پوچھ ہی کہا میں اس کا یقین کرتی ہوں اور آپ اور جو بھی تائیں گی میں اس کا یقین کر لوں گی لیکن آپ تائیں تو سہی..... مجھے جواب تو دینے کے مجھ سے..... میری ذات سے آپ کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا جو آپ نے خود کو اٹھایا تھا۔“

”مجھے تم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا میں صرف خود سے خوفزدہ تھی۔ اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی تھی، اپنی ممتا سے خائف تھی مجھے

خطرہ تھا تو اس بات سے کہ کہیں میرے اندر کی محبت پھر مجھ پر حاوی نہ ہو جائے۔“ اپنی اولاد سے محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھیں آپ کیوں؟“ وہ بے بسی سی گرنے

کے انداز میں نزدیکی کر رہی پوچھ گئی۔

”میں آپ کی یہ بہم بائیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا اتنے سالوں میں کبھی آپ کو مجھے کھودینے کا مالال نہیں ہوا۔ کبھی بھی آپ میرے لیے نہیں تڑپیں۔ کبھی میرے لیے نگر مند نہیں ہوئیں؟“

”میں نے تمہیں کھوپا نہیں تھا مقدس میں خود کھو گئی تھی اور دیکھو آج تمہیں مل گئی

ہوں۔ تم مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھیں صرف میری آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھیں پھر مال کس بات کا۔ ہاں ملک تھی سو وہ تو نصیب کا ایک حصہ جان کے سنبھال لی بیٹے میں۔ میں تو یہ جان کے خود کو مطمئن کر لیتی کہ تم اپنیوں میں ہو۔ اپنے باپ کے گھر۔ اپنے خاندان کے ساتھ۔ ایک مضبوط چھت کے نیچے۔“

”ہونہ۔ اپنے۔“ وہ ادا سی سے سکرانی۔

”میں نے بیس سال اندھیرے میں ٹھوکر کھانے گزارے ہیں۔ عمر کا آدھا حصہ۔ ہاں وہ حصہ جس میں کسی بھی انسان کو ماں باپ کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ حصہ میں نے ان دونوں رشتوں سے سکرانجاں رہتے ہوئے گزارا۔ بہت سے لوگوں کے ماں باپ نہیں ہوتے، لوگ پیدا کئی خیمہ ہوتے ہیں لیکن وہ کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ ان کے ماں باپ کی قبریں کہاں ہیں؟ وہ کون تھے کیسے تھے؟ اور میں..... میں تو اتنا بھی نہیں جانتی تھی میرے ماں باپ زندہ ہیں یا پھر.....

میں تو اپنی ماں کے نام سے بھی انجان تھی۔ بیس سال بعد میں جان پائی کہ وہ دونوں زندہ ہیں اسی زمین کے کسی کونے پہ موجود ہیں۔ بابا جان کے مجھ سے دور رہنے کی وجہ کیا تھی وہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن آپ تو آزاد تھیں پھر کیوں یہ خود ساختہ دیواریں کھڑی کر لیں کہ..... میں آزاد کب تھی..... میں آزاد کب ہوں۔ تم جانتی ہو مقدس پھولوں کے رنگ سیاہ کیسے ہوتے ہیں..... میں بھی نہیں جانتی تھی..... تمہارا باپ جانتا تھا لیکن وہ مجھے بتا نہیں پایا پھر..... پھر میں خود بھی جاننے لگی جب کسی پھول کو محبت کا پانی ملنا بند ہو جائے..... اس کی جڑوں میں زہر اتر جائے تو..... تو آہستہ آہستہ وہ کالا پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔

میری جڑیں بھی ایک دم زہریلی ہو گئیں تھیں..... میرے دل کے کالے پن نے مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کیا۔“

”کیا؟“ وہ بے تابی سے بول اٹھی لیکن مومنہ کا دھیان اس پہ نہیں تھا وہ اپنی ہی کہتی رہی۔ ”اور جانتی ہو اس پھول سے نازک دل کو کالاسک نے کیا۔ نفرت نے..... نفرت چیز ہی ایسی ہے، پیار چاہے تو پھر میں بھی خوشبو بھر دے اور نفرت..... نفرت بھی کمزور جذبہ نہیں۔ نفرت چاہے تو پھول میں آگ لگا دے۔ جیسے جیسے مٹیوں کی ماری کھسکا کر اپنا شعلہ کروے میں نے اس نفرت کو سنبھالا کہ کہہ لیا اس نفرت کے بغیر میں بڑی کمزور تھی۔ مٹیوں کی کمزور بنادیتی ہیں نا..... میں نے نفرت کے سہارے مضبوط بننا چاہا، اتنی سنگدل بننا چاہتی تھی میں کہ.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی اک نظر دونوں کو دیکھا۔

”کمزور یا بکوسہ اسنا تے ہوئے میرا دل نہ کاچے۔“
 ”مگر زریاب خٹک کو قانون نے سزا دی تھی۔“ اب تک اعلق بیٹھا خوشبود کہہ اٹھا۔
 ”ہاں..... قانون نے ہی سزا دی تھی۔ فیروز لالہ کے قتل کی..... لیکن..... زریاب قاتل نہیں ہے۔“ مومن نے کہا۔ ☆☆☆

”کیا کیا تو نے حضری؟“ بی بی جان نے اپنے گروے، چھوے پھولے مگر گہری لکیروں سے بھئی سخت پھیلے والے ہاتھ بغور دیکھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔
 ”زندگی میں سب کچھ ”بھرم“ ہی تو نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے یہ ”بھرم“ اتنی کھوٹلی جھٹ..... اتنی ہلکی چادر..... یہ کیا سر چھپائے گی۔ پھر کبھی فقط اسے سلامت رکھنے کے لیے انسان سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بھرم ہی تو تھا جس نے اتنے سالوں تک یہ کھیل مجھ سے کروایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے بی بی کی محبت نے یہ سب کرنے پر مجبور کیا لیکن پھر..... پھر کیا ہوا..... نہ بی بی رہی..... نہ اس کی خوشیاں..... بیٹا بھی نظروں سے دور ہو گیا..... اس کے بعد صرف یہ کم بخت بھرم ہی تو رہ گیا تھا جسے بچانے کے لیے اتنے سال تسلسل سے یہ تماشا ہوتا رہا۔ کیسے اپنے بچوں کی نظر میں خود کو ہلکا کرتی میں، اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے، لیکن وقت سے بڑا جاہل اور کون ہے..... مٹوا ہی لیا مجھ سے سب کچھ..... اگر یہ سب یونہی ہونا تھا تو کیوں بے کاراتی زندگیاں برباد ہوئیں۔“

مجھے اپنی اولاد کی نظروں سے کرنا ہی تھا تو کیوں بے کاراتی زندگیاں برباد ہوئیں۔“
 وہ خاموشی سے اپنا احتساب کرتی رہیں۔ تمام قصہ کہہ دیے کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکیں۔ زریاب کی حیران بے اعتبار اور افسردہ اسباب اور دراب کی ملاحتی نظروں کی وہ تاب نہ لاسکیں۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ اپنے اندھیرے کمرے میں اپنے زندہ رہنے کا کوئی جواز ڈھونڈ رہی تھیں۔

بے شک ضمیر نے یہ کوڑا آج پہلی بار لہرا کے انہیں مارا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بیس سال تک ان کا ضمیر دل کے کسی کونے میں سویا رہا تھا۔ وہ تو عرصے سے چنگیاں بھر رہا تھا اور اس نے تو پہلی چنگی تب بھری تھی جب ان کی آنکھوں کے سامنے زریاب بندوق لہرا تا ہوا نکلا تھا۔

انہیں اپنے اقدام کے سنگین نتائج کا اندازہ تب ہی ہو گیا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھیں زریاب بیوی سے بدگمان ہو کے اس سے تعلق توڑ لے گا اور وہ بڑی آسانی سے مومن کا ہاتھ صاف کر پائیں گی لیکن زریاب خٹک جیسے بختون نسل کے سامنے اس کی بیوی کے

خود ساختہ معاشقے کی تفصیل اتنے بے رحم الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے وہ بھول گئیں کہ بھلے اپنے اصل سے وہ کتنا ہی دور دور رہا ہو، ہے تو ایک ”خانوادہ“ ہی جسے غیرت سے آگے کچھ نہ جھٹتا نہیں۔ اسے بھی کچھ نہ سوجھا۔ اب مگر میں جان سے عزیز بیوی اور قابل اعتبار کے خون کا پیاسا بن گیا اور یہ پیاس اسے بھانسی کے تختے تک لے گئی۔

زر سا گلہ بانی حرکت کا اتنا سخت انجام سہہ نہ سکی اس کے دماغ کی شریان بھٹ گئی۔ ذہنی حالت تو اس کی دن بدن کمزور ہوتی ہی جا رہی تھی یہ آخری اور شدید جھٹکا اس کا کمزور دماغ سہہ نہ سکا اسے بھرغم سے بے نیاز کر گیا۔

خان جی، وہ تو تب ہی لڑکھا اگے تھے جب ان کا بیٹا خون کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے چلا تھا۔ ان کو فاج کا پہلا حملہ اسی دن ہوا تھا پھر زریاب کی گرفتاری، موت کی سزا، بی بی کی اچانک موت یہ سب حادثات انہیں بستر تک کا ہی کر گئے۔ برسوں سے وہ اپنے رعب و دہیدہ والے اونچے لمبے خان جی کو بستر پر مفلوج بے بس، بے زبان پڑا دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔ لیکن جو بھوت بول دیا تھا وہ بھنا تو تھا ہی۔ اب سچ کہہ بھی دیتیں تو کیا ہو جاتا۔ کیا فیروز زندہ ہو جاتا؟ زریاب آزاد ہو جاتا؟ یا زراں تک لوٹ آتی؟ وہ چپ چاپ اس چنگیاں بھرتے ضمیر کو نظر انداز کرتی رہیں اور مقدس..... اس کی صورت ایک مسلسل عذاب ان کے سر پہ بیس سال تک مسلط رہا۔

مقدس کی صورت میں ایک چلتی پھرتی مومنہ کیا کم سزا تھی ان کے لیے..... اس کی صورت انہیں وہ سارا واقعہ بھولنے نہ دیتی راتوں کو اس کا جھل جھل کے روانہ ان کے دل میں کچھ کے لگتا۔ ہر کمرے میں گھنٹوں گھنٹوں چل کے جاتی اپنی ماں کو ڈھونڈتی پھرتی وہ دونی صورت کی بیٹی انہیں خود سے سوال کرتی محسوس ہوتی۔ وہ چڑ جائیں اس کے سامنے کم سے کم آئیں۔ مخاطب کرنے کی نوبت تو اکثر آتی ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں اس حویلی کی تاریخ سے مومنہ کا باب ہی مٹ جائے۔ کسی کو یاد نہ رہے بھی زریاب کی کوئی بیوی یہاں آئی بھی تھی اور اس میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہی تھیں، بڑی بہو یہاں نہ ہونے کی وجہ سے سارے قصے سے لاعلم تھی ہی، چھوٹی بہو اس واقعے کے کئی سال بعد آئی۔ سب مومنہ کے بارے میں وہ ہی جانتے تھے جو بی بی جان نے زریاب سے کہا تھا۔

دراب بھائی کی طرف سے ملنے والی شادی کی تصویروں میں سنہری بالوں، گلابی اور سنہری رنگت والی، بلوری آنکھوں والی بھانجی کو غیر ملکی ہی سمجھا اور کسی نے اس کی یہ غلط فہمی عرصہ تک دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بیٹیاں اکثر لوگ یہی جانتے زریاب کی بیوی کوئی ”مہم“ تھی۔ اس کا ذکر اس گھر میں ممنوع تھا۔

”وہ ہوتی تو میں اس سے بھی معافی مانگ لیتی۔ میں صرف تمہاری ہی مجرم نہیں ہوں میں اس عورت کی مجرم بھی ہوں جو مجھ سے کہتے خواب آنکھوں میں سجائے اس گھر میں سہاگن بن کے آئی تھی۔ میں اس معصوم بچی کی مجرم بھی ہوں، اپنے بیٹے کی..... اپنے دل کے ایک ایک ٹکڑے کی..... میں نے تمہیں یاد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔“

”نہیں بی بی جان.....! آپ کم از کم میری مجرم تو نہیں ہیں۔ میں اپنی بربادی میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا۔ آپ کو بھی نہیں۔ اپنی بربادی میں سب سے بڑا تھو خود میرا ہے میری بے اعتبار عیبت کا۔ بلکہ آپ تو مومن کی مجرم بھی نہیں اس کا سب سے بڑا مجرم میں ہوں۔ میرے اندھے جذبات اور جنون اسے لے ڈوبے۔ اپنی بچی کی تمام تر عروسیوں کا سبب بھی میں ہی ہوں۔ اس سارے قصے میں مجھے اور تو کوئی مجرم نہیں دکھائی دیتا سوائے اپنے۔ یہ میں ہی تھا بی بی جان۔ یہ میرا کمزور و خشن تھا جو بدگمانی کا ایک ہلکا سا دار نہ سہہ سکا۔ آپ کیوں معافی مانگتی ہیں بی بی جان..... معافی تو مجھے مانگنا ہے مقدس سے..... مومن سے.....“

”زر..... تم نے..... حضرت بی کو..... معاف..... دینا..... اپنی بہن..... بہن کو..... بھی..... باچا جان نے اسے متوجہ کر کے کچھ کہنے کی کوشش کی۔“

”ہاں زریاب..... اپنی بہن کے لیے تمہارے دل میں جو گلے شکوے ہیں، وہ دور کرلو..... اس کی روح کو بچھتاوے کے بوجھ سے آزاد کر دو..... اس کی بخشش کے لیے دعا کر دو۔“ بی بی جان نے التجائی۔

”میں نے کہاں بی بی جان..... میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔ اس دل میں اپنے ہی ملال اس قدر ہیں کہ.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

اندرو اندری و گدرا ہندرا

پانی درد حیاتی دا

”(اندری اندر کہیں بہتا رہتا ہے زندگی کے درد کا پانی)

”اور یہ درد تو میں نے خود دھماں کیا ہے..... یہ پچھتاوے تو میں نے خود آگے بڑھ کے خریدے ہیں۔ وہ سارے عہدہ سارے بیان میں نے ایک پل میں بھلا دیئے مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

اس کے صبح چہرے پہ نور کا وہ ہالہ

اس کے کھمرے سے لکھے ہیں کوئے وعدے

اس کی شفاف آنکھوں کے آئینے

شاید رفتہ رفتہ لوگ اس قصے کو کبیر فراموش کر دیں۔ اگر..... مقدس کا وجود نہ ہوتا۔ اس لیے وہ نہ جانتے ہوئے بھی اس کے بے ضرر وجود سے نفرت کرنے پہ مجبور ہو گئیں اس کی سوال کرتی آنکھیں انہیں زہر لگتی ایسا لگتا جیسے مومن سامنے آ کھڑی ہو اور کہہ رہی ہو۔ ”کیوں؟ بی بی جان کیوں؟“

”آہ کیوں؟“ وہ خود کو کوسنے لگیں۔ ”کیوں میں ایک مومن کے بعد دوسری مومن سے کھینچ رہی۔ کیا اس کی ماں کا نہیں تھی میری نفرتوں کی تسکین کے لیے جو میں اس معصوم سے بھی بدلے لیتی رہی شاید میں ڈرتی تھی وہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنی ماں کا بدلہ مجھ سے لینے میرے مقابل آ جائے۔ ہائے حضرت بی تو نے کیا کیا..... کیا زریاب کا اس کی نسل کا اس خاندان پہ کوئی حق نہ تھا کیا اس کے حصے کی خوشیاں ہی رہ گئیں تیری بیٹی پر بان ہونے کے لیے۔ تیری وجہ سے وہ درد بردہا، اس کا گھر آجڑا، اس کی بیوی رسوا ہوئی پھر بھی تو نے بس نہ کیا اس کی معصوم امانت تک کو کچل رہی تھی تمہاری کھینچی ہوئی آنا۔“ وہ انھیں اور خان ارباب خٹک کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

کئی دنوں سے بے چین اور مضطرب خان ارباب خٹک کے ضعیف چہرے پہ اس وقت اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ ان کا ابھری رکوں والا لانا ہاتھ ابھی تک زریاب کے ہاتھوں میں تھا بلکہ شاید جب سے وہ لوٹا تھا یہ ہاتھ تھا وہ تھا۔ وہ جھکے تھکے قدم چلتی ان کے سر ہائے پتھ لگئیں۔

”خان جی!“ انہوں نے سرفی مائل سوچی آنکھیں جھکائے جھکائے عرض کی۔

”خان جی! مجھے معافی دلائیں، مجھے زریاب سے معافی دلائیں خان جی.....“ ان کے لہجے میں اتنی عاجزی تھی، اتنا کر تھا کہ وہ تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بی بی جان! مجھے گناہ گار مت سمجھئے اس طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے مت

کھڑی ہوں کیوں مجھے میری نظروں سے گراتا چاہتی ہیں آپ؟“ اس نے شانوں سے

تھام کے انہیں اپنے قریب بٹھایا۔

”نظروں سے تو میں گر گئی ہوں لیکن مجھے گل نہیں ہے میرے اپنے اعمال ہیں جنہوں

نے میری بزرگی ساری نسل کے سامنے ہمال کی۔ میں کسی رعایت کی مستحق تو نہیں لیکن

معافی کا حق تو رکھتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو زریاب۔ تم مجھے معاف کرو، مقدس مجھے

معاف کر دے تو شاید دل کچھ ٹھہر جائے ورنہ اب اپنے ہی دل کی مالتیں سبھی نہیں جاتیں۔

نجانے مومن..... مومن کہاں ہوگی اس وقت۔“ زریاب جیسے کسی خواب سے چوٹا تھا۔

”ہاں..... مومن..... مومن کہاں ہوگی..... تم کہاں ہوگی مومن؟“

اور اپنا وہ وعدہ..... جو میں نے کبھی بڑے سچے دل سے کیا تھا۔“ اسے یاد آنے لگا۔
 ”میں تان دوزخ سرسراں
 بے میں کھ ماہی ولوموڑاں“

اور میں نے کھ موڑ لیا..... کس سفاکی کے ساتھ..... کس بے دردی کے ساتھ اور کس
 بھدے پتن کے ساتھ۔

سالوں بعد آج وہ اس کمرے میں موجود تھا جس کی دیواریں اس کے جون خیز عشق
 کی ہر ہر ادا کی راز دار تھیں۔ وہ جہر جہر جاتی زریاب اسے سنبھالتی۔
 آئینے کے سامنے چل دوپل رک کے ریشمی بالوں کی پہلے سے کی گئی چوٹیوں کے بل
 اور کستی ہوئی اکائی کی مومنہ.....

”آف یہ بال، کتنی کبھی تھی میں تانی سے بال گندھوا کے دو دودن فکر ہی نہ ہوتی تھی
 اور اب.....“ وہ مڑ کے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتی۔

”تمہاری نئی نئی فرمائشیں..... مینڈھیماں مت کرو..... بال کھلے چھوڑو..... وغیرہ
 وغیرہ..... بھلا تمہیں میرے بالوں سے کیا؟“

”کیا کہا؟“ پھر سے کہنا، کیسے یہ سر رکھے ہوئے اسے دیکھتے دیکھتے وہ اچانک اٹھ
 بیٹھا۔ ”مجھے کیا؟ مجھے نہیں تو اور تمہیں مطلب ہو گا ان بالوں سے؟ اتنے خوبصورت ریشمی
 اور لمبے بالوں کی قدر ہی نہیں عجیب رسیاں ہی تن کے چال پھیلادیتی تھیں سر پہ اور اب بھی
 کون سا میری ”نئی نئی فرمائشیں“ پوری ہو رہی ہیں۔ بال کھلے رکھنا تو ایک طرف تم میری
 پسند کے مطابق ڈھیلے سے بل والی چوٹی بھی نہیں کرتیں کس کس کے یہ دوسینگ لگا لیتی
 ہو۔“ وہ اس کی دو چوٹیوں پر تنقید کرتا۔

”کیا کروں، ڈھیلے بالوں میں سر دیکھنے لگتا ہے۔ اتنے سالوں کی عادت جو ہے لیکن
 رنگ جاؤں گی آہستہ آہستہ تمہارے رنگ میں مصیب۔“ جب کبھی وہ ترنگ میں ہوتی
 تو اس کے چڑنے کے باوجود اسے ”مصیب“ کہہ کے ضرور پکارتی۔

”سنو!“ اس کا لہجہ بدل جاتا اسے آئینے کے آگے سے ہنسنے دیکھ کے۔
 ”تم کچھ دیر اور کھڑی رہو ناں یہاں۔“
 ”کیوں؟“

”اچھا لگتا ہے تمہیں ایک نظر میں ہی ”دودو“ بار دیکھنا۔“ اس کی وارفتگی پہ اس کے
 مین شہد پڑکانے لگتے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا اس درمیانے کے قریب آیا جہاں صبح صادق کے وقت بیٹھ کے
 عبادت کرنا مومن کو بے حد پسند تھا۔ زریاب بھی صبح خیز تھا لیکن اس نے تو شاید کبھی بچپن
 کا انتظار بھی نہیں کیا ہوگا۔ سورج کی پہلی کرن کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہ ہمیشہ اس
 درمیانے کے پردے ہٹا کر کھڑی ہو جاتی اور جب وہ جاگتا اسے ڈھونڈتا ہوا سیدھا نہیں
 آتا، اسی درمیانے کی طرف جو اس کے کمرے کے ساتھ متصل اسٹوڈیو کی پچھلی طرف کھلتا
 ہے۔ اس نے گرد اور سیلن سے بھری اسٹوڈیو کی فضا میں سانس لینے میں دشواری سی محسوس
 کی۔ پرانے کاغذوں کے ڈھیر نے عجیب سی مہک پیدا کر رکھی تھی، اور خشک ہوتے پیپٹ
 سیلن زدہ سی بدبو پیدا کر رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے پردے کھینچے۔ مختصر سی بالکونی
 میں پتھر کا اونٹنی آج بھی موجود تھا لیکن اس بے جا سمن کے گہرے گہرے رنگ والے چوں کا
 سایہ نہ تھا۔ ایک ٹنڈا منڈا سرخ افسردہ سا بھانک کے نچانے کے ڈھونڈ رہا تھا۔ بیچ کے
 ساتھ ابھی بھی نگار میں وہ گھلے گئے تھیں لیکن نہ تو ان میں گلاب باقی تھے نہ تھوٹا۔ وہ تھکا
 تھکا سا اس گرد میں اٹھنے پہ بیٹھ گیا لیکن اگلے ہی لمحے تڑپ کے اٹھا تھا جیسے یہاں، اس
 مقام پہ بیٹھ کے اس سے کوئی بے ادبی سرزد ہو گئی ہو۔ اسے یاد آیا، مومنہ کا صبح کی اولین
 ساعت جیسا یہ پاک اور معصوم سا چہرہ..... سفید سوئی دوپٹے میں لپٹا ہوا..... وہ سبیں اسی
 بیچ پہ بیٹھ کے تلاوت کرتی تھی اور سامنے بیٹھا عقیدت سے اسے نکالتا جاتا۔

اس کے غیر محسوس سی حرکت کرتے گلابی یوں کو..... نل ہل کے پڑھتے ہوئے
 کانوں میں ڈوٹکی پالیوں کو.....
 جھکی ہوئی آنکھوں کی لرزیدہ پلکوں کے سامنے کو.....
 سورج کی کرنوں سے دمک آنکھیں والی ناک کی لوہنگ کو.....
 پیشانی پہ آویزاں اس بڑنور سے عکس کو.....

کیوں.....؟
 کیوں.....؟

کیوں بھلا دیا میں نے اس نور کو.....؟ کیوں نہ اس وقت مجھے یہ پاکیزگی یاد آئی
؟ کیسے یقین کر لیا میں نے کہ مومنہ..... مومنہ اور فیروز..... کیا یہی تھا میرا عشق یہی تھی
 میری محبت.....؟ یہی دعوے کیسے تھے میں نے..... اتنی بڑی محبت..... اتنے کھوکھلے
 عہد..... میں جو خود کو بڑا روشن دماغ تعلیم یافتہ، بلیٹھا ہوا اور تجویر شخص سمجھتا رہا ہمیشہ خود کو
 اس سارے روایتی اور دنیاوی سیٹ اپ میں انجینی تصور کرتا رہا۔ اصل میں کیا نکلا؟ ایک
 جاہل، کم نگاہ، وہی فرسودہ اور روایتی مرد..... جو کسی تیسرے شخص کی بے سرو پاتوں پہ بغیر

کسی ٹھوس اور واضح ثبوت کے ہی ایمان لے آتا ہے۔۔۔۔۔ جو غیرت اور امانا کے آگے محبت اور اعتبار جیسے جذبول کے پر نچے اڑا دیتا ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ جو۔۔۔۔۔

”خان صیب۔۔۔۔۔ خان صیب“

وہ پتا نہیں اور کتنی دیر خود کو ٹھہرے میں کھڑا کر کے خود ہی پتھر مارتا رہتا کہ اورنگزیب کی آواز یہ چونک اٹھا۔ اسنو دیوے نکل کے دیکھا تو وہ عجیب وحشت زدہ انداز میں کمرے میں ٹھوم ٹھوم کے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

”کیا بات ہے اورنگزیب؟“ اس نے متوجہ کیا۔

”وہ۔۔۔۔۔ خان صیب۔۔۔۔۔ بڑے خان جی۔ اپنے باجا جان گزر گئے۔“ وہ دھماکے سے مارنے لگا۔

☆ ☆

”لیکن زریاب۔۔۔۔۔ وہ قاتل نہیں ہے۔“ مومنہ کے اس انکشاف نے خوشنود اور مقدس دونوں کو دم بخود کر دیا۔

حیرت کا ایک بریڈا ٹھنڈا تھا جس نے ان دونوں کو یوں نمند کر دیا کہ وہ کوئی اور سوال کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ سختی سے آنکھیں بند کر کے لیٹنی مومنہ نے کچھ دیر کسی آواز کا انتظار کیا اور پھر رک رک کے بتانے لگی۔

”ہاں وہ قاتل نہیں ہے لیکن۔۔۔۔۔ صرف قانون کی نظر میں ہی اسے بے قصور ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ مجھ سے پوچھو۔۔۔۔۔ مجھ سے پوچھو کہ اس کے ذہان کا تھوڑا سا کس کس کا لبو ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے حساب مانگو میں بتاتی ہوں اس سے کتنے قتل ہوئے ہیں۔ کتنے جذبے بے موت مارے گئے ہیں، کتنے خواب سولی چڑھے ہیں، کتنی آرزوئیں سک سک کے فنا ہوئی ہیں اور کتنی محبتوں کا خون ہوا ہے اس شخص کے ہاتھوں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ سوائے میرے۔۔۔۔۔ اس لیے۔۔۔۔۔ صرف اس لیے میں نے۔۔۔۔۔ اس کی بار بار اپنی زبان تھک کے رک گئی۔“ آپ نے پہلے اسے جھوٹ کیوں بولے۔ وہ ساری جھوٹی کہانی۔“ خوشنود نے سر سے سے مجھ سے میں پڑ گیا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں جھوٹ بول ہی نہیں سکتی، میں نے پہلے تم سے جو کچھ کہا تھا اس کا حرف حرف سچائی لیے ہوئے ہے یا یہ ضرور ہے کہ میں نے تم سے بہت سی باتیں چھپائی تھیں۔ کچھ پردے پڑے رہنے دیئے تھے۔“ وہ الزام سہہ زدگی، اپنی صداقت تسلیم کرانے کے لیے جیسے اس میں نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اس کی آواز اب پہلے سے بلند تھی اور واضح بھی۔

”میں کبھی بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ جھوٹ بولنے سے بچنے کے لیے ہی تو میں وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ جھوٹ بولنا بھی میرے لیے ناممکن تھا اور سچ۔۔۔۔۔ سچ بتانے سے زریاب کو سزا نہ مل پاتی اور میں اسے سزا سے کیسے بچنے دیتی۔ کیا غیرت اور محبت صرف مردوں کی میراث ہے۔ کیا اپنی عزت پہ بن آتے دیکھ کے خون کی ندیاں بہانا صرف مردوں کا شیعہ ہے۔ کیا کسی عورت کے اندر بدلے کی آگ نہیں بھڑک سکتی جب اس کی وفا اور عزت پہ وار کیا جائے۔ کیا عورت کے اندر وفا، مہتا اور محبت کے خزانے بھر کے قدرت غیرت اور وقار رکھنا بھول گئی تھی؟ نہیں۔۔۔۔۔ عورت بھی اپنی ذات اور اس کے تقدس کے حوالے سے اتنی ہی غیرت مند ہوتی ہے جتنا کہ ایک مرد اور پھر میرے جیسی عورت۔۔۔۔۔ جس نے عزت کو محبت سے ترجیح دی ہو، پہاڑوں نے اپنی گود میں لے کر جسے بچپن سے ہی اپنے جیسی سر بلندی اور پختگی عطا کر دی ہو، جو تنہا جنگلوں میں بسنے والی غیر قوم کے ساتھ سرائف کے ایک عمر بھر جا چکی ہو۔ میرے لہو میں یہ سرکشی گردش کر رہی تھی، میں خود پر اٹھنے والی نگاہ بھسم کرنے کی قوت رکھتی تھی، خود پہ اٹھنے والی انگلی کیسے سلامت رہنے دیتی۔

تمہارے باپ نے مجھے پہاڑوں کی گود سے نکالا، شہر میں بسایا لیکن وہ میرے اندر کی خود سراسر غیور، بخاران کو مکمل طور پہ تبدیل نہ کر پایا۔ اس کی محبت نے وقتی طور پر اس مانوس پہ مرنے والی عورت کو سلا ضرور دیا تھا۔ کتنا ہی عرصہ اس کی محبت کے خمار میں سرشار میں ایک نامعترفی زندگی گزارتی رہی، اس کی ماں اور اس کی بہن کے طنز یہ اور تذلیل میں ڈوبے فقرے میرے کانوں تک آتے لیکن ہلکی دھمک دے کے لوٹ جاتے، وہاں زریاب کے کہے بیٹھے بولوں کا شور ہوتا تھا۔

اس کے خاندان کی نفرت انگیز اور خفاقت آمیز نظریں مجھ تک اٹھتیں لیکن میرے اندر کوئی شعلہ نہ بھڑکتا میری آنکھوں کے آگے تو زریاب کے سکرانے چہرے اور جذبے لٹانی نظروں کا ست رنگا پردہ بڑا ہوا تھا۔ لیکن جب خود زریاب کے بولوں میں وہی زہر اُترا۔۔۔۔۔ جب خود اس کی آنکھوں میں میں نے بے اعتباری دیکھی تو کیسے میری مدہوشی نہ ٹوٹی۔ اس دن۔۔۔۔۔ اس پل۔۔۔۔۔ میرے اندر کی وہ پہاڑوں پھر سے جاگ اٹھی تھی اور کسی طور نہ بہل رہی تھی۔“ وہ ہانپنے لگی۔ خشک ہوتے لیوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے دھندلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنا چاہا، سائے سے اس کی آنکھوں کے آگے لہرائے اور اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اس کی ناتوانی نے اس کی تمام حیات کو اٹھنے مستعد

رہنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ مسلسل بولتے رہنے سے اس کی بصارت نے اندھیرے اوڑھنے شروع کر دیے تھے۔ لیکن دماغ جاگ رہا تھا اور اس پہ وہ سارا منظر بہت واضح..... بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”زر..... یاب.....“ فیروز دھاڑا۔ ”ہوش میں رہ کر بات کرو۔“ اگرچہ وہ اپنی باتوں کے پس منظر سے ناواقف تھا لیکن میرے حوالے سے کہے گئے گھٹیا جملے سن کر اپنا عمل برقرار نہ رکھ پایا۔

”ہوش میں تو میں اب آیا ہوں۔ تم تو شادی شدہ تھے ناں اور وہ بھی وٹے نٹے کے ساتھ..... تمہاری ایک نہیں دودھ بنیں تمہارے سرال بیانی گئی تھی اس لیے خود شادی کر کے اپنے لیے مسائل کھڑے کرنے کے بجائے تم نے زیادہ محفوظ راستہ اپنایا۔ تمہیں تو صرف عیاشی کرنا بھی پھر چاہے وہ تمہارے اپنے ہی دوست کی بیوی کیوں نہ ہوئی۔ اور وہ..... وہ عورت اسے تو دولت اور مقام ہی چاہے تھی پھر اگر دودھ عاشقوں کے ساتھ ملتا تو کیا برا ہوتا“

”میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ زریاب تم اپنے ہوش میں نہیں.....“ غصے کی شدت سے اس کی آواز کا پربھی گئی لیکن زریاب واقعی ہوش میں نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پہ اس وقت زہر چڑھا ہوا تھا وہ بولتا رہا۔

”تم نے چند ہی منٹوں میں سارا مکمل سوچ لیا، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھ سے اس کی شادی کرواتے ہوئے اپنا حصہ واضح رکھا اور یہ کرتے ہوئے تم نے پاک رشتوں کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے اور مومنہ سے تعلق جوڑے رکھنے کے لیے تم نے اسے بہن کہہ کر مجھے دھوکا دینا چاہا۔“

”بس..... بس کرو اپنی بہن کو اس در نہ میں بھول جاؤں گا کہ تمہارا میرا کیا رشتہ ہے۔“ ”تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں۔ تمہارے اور میرے بیچ صرف ایک عورت تھی۔ آج یہ راز مکمل چکا ہے اب کچھ باقی نہ بچے گا تم نہ وہ..... تم دونوں کا مکروہ اور گھٹیا تعلق۔“

”گھٹیا تم خود ہو اور مکروہ تمہاری سوچ ہے۔“ ”اور تم دونوں تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہو۔ وہ بدکردار عورت شوہر کی غیر موجودگی چند دن بھی نہ برداشت کر سکی اور اپنے مرد کے گھر میں ہی، اسی کی چھت کے نیچے اپنا رہا ہوا کے عشق کے تماشا کرتی رہی اور جب بھانڈا پھوٹا تو گھر اور اولاد کو چھوڑ کے اسی کے ساتھ چل پڑی۔“ اس کے تفصیلی الزام پہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا خود فیروز لالہ بھی

لڑکھڑاسا گیا۔

”یہ سب بکواس کس نے کی تم ہے؟ تم نہیں جانتے ہو وہ میرے ساتھ کسی طرح اور کس حال میں آئی ہے۔ یہ ٹیکہ ہے اسی نے مجھے بولایا تھا کہ.....“ زریاب نے پوری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس پہ دوبارہ بدعنوانی تان لی۔

”میری ماں نے خود تم دونوں کو دیکھا تھا عزت اور شرم کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اور میرے لیے اس سے معتر کوہی اور کوئی نہیں۔“ چانک فیروز لالہ اس پہ بیل پڑا۔ وہ اس سے بدعنوانی چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خون بھی جوش میں آ گیا تھا۔

”اگر تم میری بہن کے شوہر نہ ہوتے تو میں تمہارا خون بھادیتا۔“ اس نے بدعنوانی کا رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے جھگڑتے اور میں اسی طرح نیچے نیچے میز پر تکلیف دہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ میں جلا کے لالہ کے کہنا چاہتی تھی۔ ”بھادو اس کا خون..... مت پروا کرو یہ تمہاری بہن کا شوہر ہے..... یہ میرا شوہر نہیں ہے یہ..... یہ تو جانور ہے۔ جانور..... جس کا شعور فنا ہو چکا ہے۔ جس کے اندر سے ہر جذبہ بٹ چکا ہے اب تو یہ سر سے تیر تک جانور ہے غلیظ وحشی اور درندہ جانور..... اور کوئی درندہ میرا شوہر نہیں ہو سکتا۔“

لیکن میں جلا نہ سکی۔ میں سکتے کے عالم میں تھی۔ ایک ایک سکتہ جو صرف جسم پر قابض ہوتا ہے، رون کو سب سہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ میں سب دیکھ رہی تھی سب سن رہی تھی۔ صرف کچھ کرنے کی قابل نہ رہی تھی۔ کاش..... کاش یہ سکتے مجھے مکمل طور پہ جکڑ لیتا..... میں کچھ دیکھ نہ پاتی..... کچھ نہ بھی نہ پاتی۔

”اب تو اپنی گندی زبان سے ان گندے تعلقات کو اس پاک رشتے کا نام نہ دو۔ وہ عورت تمہاری کیا کسی کی بہن بھی بننے کے قابل نہیں..... وہ کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں..... زریاب مسلسل اپنے زہر لے خیالات سے اسے اور بھڑکا رہا تھا۔ فیروز لالہ نے اس کی بدعنوانی چھین کر اسے اور مشتعل کر دیا تھا۔ اب وہ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اس پہ وار کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کچھ بدعنوانی اپنی طرف جھینپی شروع کر دی۔ اسی کھینچا تانی میں لالہ کی نظر دروازے پہ پڑی مجھے دہلیز پہ کرے دیکھ کے اس کی حرکت بس ایک لمحے کے لیے تھی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخ رنگت یکدم زرد پڑ گئی۔ میں نے ان آنکھوں میں ٹھٹھکت..... اور شرمساری کے سائے لہراتے دیکھے۔ شاید اسے اپنے وہ سارے دعوے یاد آئے تھے جو اس نے مجھے اس شادی پہ رضامند کرتے ہوئے کیے تھے یا پھر شاید بہن کے

ساٹنے ہی اپنے رشتے کی پامالی نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا۔

اسے کمزور پڑنا دکھ کے زریاب نے بندوق کی نالی کا رخ اس کی گردن کی طرف کر دیا۔ میرادل اچھل کے قلع میں آگیا میں نے بے اختیار لالہ کے ڈھیلے ہوتے ہاتھوں کو بندوق پہ پہنچ کر طرف پھسلے ہوئے دیکھا، عجیب حسرت زدہ انداز میں مجھے دکھ کے اس نے فائر کر دیا۔ اور میرادل قلع سے چسل کر کہیں پہنچے۔ بہت نیچے گر گیا۔ میں جان گئی اس نے یہ فائر کیوں کیا تھا۔ غیرت کا ایک رنگ یہ بھی تو ہے۔ زریاب نے اس کی پاکیزگی پہ پھڑپھڑا تھا کیا بھائی کو گالی دی تھی۔ وہ میرے سامنے ہی اتنی بڑی گالی سہ نہ پایا، شرم نے اسے اپنی جان لینے پہ مجبور کر دیا۔ فائر کی آواز سن کے ملازم اندر چلے آئے۔ لالہ خون میں لت پت نیچے پڑا تھا۔ موت نے اسے ایک بل میں ڈھانپ لیا تھا۔ لوگوں نے بندوق پکڑے زریاب کو ہر طرف سے جکڑ لیا وہ ابھی بھی اسی کیفیت میں تھا۔

”چھوڑ دو مجھے۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دو مجھے۔“

”تم نے ہمارے صوب کو مارا دیا۔ مارا دیا ہے۔“ ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ کئی ملازم روتے چلاتے مردان خانے کے اندر دنی جیسے کی طرف دوڑے۔

”ہاں میں نے مارا ہے اسے۔ میں خود کہہ رہا ہوں میں نے مارا ہے اسے۔ اسے مارنا کوئی شرم کی بات نہیں جو میں چھپاؤں گا۔“

”میں بزدل نہیں ہوں، میں کہیں نہیں بھاگوں گا، مجھے چھوڑ دو ابھی ایک حساب باقی ہے ابھی مجھے اس کی جان بھی لینی ہے۔“

میرے اندر جیسے ایک زور کا پھرجان گرا اور پھر سے میرے اندر جان پڑ گئی۔ میں نے سن ہوئے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ زریاب کے الفاظ نے مجھے ایک نئی راہ بھائی۔ وہ اتنے طیش کے عالم میں تھا کہ یہ بھی محسوس نہ کر سکا، اس کے دونوں ہاتھ تو بندوق کی نالی پہ تھے۔ اس نے لالہ کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی ہی نہیں۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ قتل اس نے کیا ہے اور اندر آئے ہوئے ملازمین بھی یہی سمجھ رہے تھے۔ دیکھا جائے تو ایک طرف سے یہ سچ بھی تھا لیکن میری نظر سے کون دیکھتا؟ میں نے نظر و عقل کے اس دھوکے کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت کیا تھی، یہ صرف میں اور لالہ جانتے تھے یا پھر خدا۔ فیروز لالہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا اس کی شرم نے اسے منوں مٹی تلے منہ چھپانے پہ مجبور کر دیا تھا اور میں..... میں حقیقت کسی کو نہیں بتاؤں گی یہ میں نے طے کر لیا اور خدا تو ہے

ہی سب سے بڑا منصف..... جتنا یہ سب فیصلے مجھ سے وہی کروا رہا تھا۔

میں نے مٹی میں پڑی چادر اٹھائی اور وہاں سے نکل بھاگی اب تک کسی کی نظر مجھ پہ نہیں پڑی تھی۔ کوارٹروں کے چھٹی طرف تندور کے پاس سے گزرتے ہوئے حواس باختہ سی لالائی کو میں نے مچوے کی بازو پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ کبھی مردان خانے کے اس بیرونی حصے کی طرف نہیں گئی تھی لیکن حویلی میں بے شور نے اسے ایسا کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ”لالائی۔ لالائی بہن۔“ فالے کے کتھے پودوں کے پیچ چھپ کے میں نے اسے آہستہ آہستہ آوازیں دیں۔ وہ چونک پڑی، بڑی سی کالی چادر ڈرا سی سر کا اس نے اپنی وحشت زدہ نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔

”مومنہ۔ تم اور.....؟“ میں اس کا ہاتھ حقام کے گندم اور اناج والی کوٹھری میں لے آئی۔ اس کی سر اسمدہ حالت صاف بتا رہی تھی کہ فائر کی آواز اور ملازمین کے رونے چہینے نے اس کی اندر کن خدشات کو جگا دیا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے بھری مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

”کیا ہوا مومنہ؟ تمہارا لالہ وہ تو اور اندر تھا۔ کہاں ہے تمہارا لالہ..... وہ ٹھیک ہے نا؟“ میں نے اس کی بھری بھری کلاکیاں، سر سے سے بھری آنکھیں اور دنداے سے سرخ لب دیکھے۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں اپنی زبان سے اسے سہاگن سے بیوہ ہونے کی محسوس خیر نہاؤں۔

”مجھ سے کچھ مت پوچھو لالائی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے جانا ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ میں نے اپنے ننگے پیر اور خالی ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ مت سمجھنا میں اپنی جان بچا کے بھاگ رہی ہوں، وقت ملا تو ضرور تمہیں ساری بات بتاؤں گی لیکن ابھی حال اتنے تم سے اپنے اور فیروز لالہ کے رشتے کے صدقے کچھ مانگ رہی ہوں۔ وہ بڑی الجھن کا شکار تھی، کبھی میری بات سننے کی کوشش کرتی کبھی مڑ کے حجرے کے اس کمرے کو دیکھتی جہاں اتنے فاصلے سے بھی جھوم بڑھتا دکھائی دے رہا تھا، اس کا سارا دھیان اسی طرف تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے طلائی ننگن اتارنے کی کوشش کی۔“

”لالائی۔“ میں نے آنسو پیٹے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا ناں بہن میں ایک انجانے سفر پر جا رہی ہوں مجھے زاہرہ چاہیے۔ خدا

کا واسطہ ہے میری مدد کر تو تمہیں لالہ کی قسم" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی لنگن اتارے۔ چادر کے پلو سے بندھے چند دس دس کوٹ لگائے، چبل اتار کے میرے آگے کی اور میرے گلے لگ کے اونچی اونچی آواز میں روئے لگی، شاید اس کے اندر کسی نے اسے اجڑنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ دوبارہ اس نے مجھ سے لالہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میں نے اس سے راز داری کا وعدہ لیا اور وہاں سے فرار ہو گئی۔

اس وقت سارے علاقے کی توجہ حویلی پہ ہونے والے واقعے کی طرف تھی۔ میں بڑی آسانی سے سید و شریف سے نکل گئی۔ پشاور جانے کے بجائے میں نے پنڈی کا رخ کیا۔ وہاں زریاب کا خطرہ کم تھا۔ پھر..... پھر میں نے نماز کیا سوچ کے لاہور کا ٹکٹ لے لیا۔ میں اس وقت بالکل اکیلی تھی۔ تنہا لاوارث، میرا کوئی نہ تھا۔ نہ سر پر چھت تھی نہ پیر کے نیچے زمین اپنی تھی۔ ایسے میں لاہور جانا میں نے مناسب سمجھا، شاید وہاں کی مٹی مجھے اپنی اپنی لگے۔ کہتے ہیں ہر انسان کی نسل باپ سے چلتی ہے، باپ کا حوالہ اس کی پہچان ہوتا ہے، میرا باپ بیٹوں کا تھا، اس شہر میں کہیں میرے خون کے رشتے موجود تھے۔ بھلے وہ مجھے نہیں جانتے تھے، میں انہیں نہیں پہچانتی تھی لیکن وہ تھے تو کسی، اس شہر نے مجھے پناہ دی۔ لائی کا دیا ہوا زور کچھ دن میرے کام آیا۔ سفر کے دوران بھی اور اس نئی جگہ پر بھی۔ لیکن پھر زندہ رہنے کے لیے مجھے نوکری کرنا پڑی۔

دن ایسے ہی گزر جاتے اگر موت مجھے خوفزدہ نہ کر دیتی۔ مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا تھا، مجھے لاوارث مرنے سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے لائی کو پھر سے صدائی۔ میں چاہتی تھی کوئی اپنا بڑی محبت سے مجھ پہ مٹی ڈالے، بڑے دل سے میری مغفرت کی دعا کرے، اور قدرت نے مجھے میرے دو اپنے ملوادیے۔ میرے لالہ کی آخری نشانی اور میری اپنی بیٹی..... میری بیٹی..... جو مجھ سے اتنی متغیر ہے کہ..... لیکن اس کا کیا قصور میں نے بھی تو ایک ماں ہونے کا فرض ادا نہیں کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا مقدس کہ میں بھول گئی تھی..... تمہیں..... لیکن میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ آس بھرے انداز میں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی مقدس کو دیکھنے لگی۔

"میں اس واقعے کی کتنی شاد تھی۔ اگر کسی کو یہ پتا چل جاتا تو لازماً مجھے عدالتوں میں کھینچا جاتا اور مجھے خدشہ تھا کہ کنبہ سے میں کھڑے زریاب کو دیکھ کے میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ میں نے کہا تھا نا تم سے کہ میں اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا تمہیں دیکھ کے میرے قدم نہ لڑکھڑکائیں۔ شاید تمہارے سر سے

باپ کا سامنا کھینچنے کی ہمت نہ ہو سکے۔ شاید زریاب کے چہرے پہ پھیلا بچپتا اور مجھے نرم کر دے۔ کھینچیں کمزور بنا دیتی ہیں، سمجھوتا کرنا سکھاتی ہیں۔ عشق عیب دیتا ہے۔ میں نے کمزور نہ پڑنا چاہتی تھی نہ نرم ہونا۔ مجھے سمجھوتا نہیں کرنا تھا، بدلہ لینا تھا میں نے محبت مار دی اور نفرت زندہ رہے۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی، میری انا کو کچھ کے لگتے۔

میرے رخسار کا داغ لودینے لگا اور دل میں پھر سے تپش بھڑک جاتی۔ اس کی گالیوں کے چھینٹے نظر آتے تو میری روح انتقام سے تسخّر جاتی۔ میں چاہتی تو عدالت میں اپنے داغ دکھا کے اور ساری سچائی بیان کر کے اسے پشیمان اور بچھتا میں سے جتنا کر سکتی تھی۔ سچائی کے آگے بی بی جان کے بودے الزام کتنی دیر قائم رہتے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا، اس کے کبے الفاظ تو واپس نہ لوٹ جاتے، بے اعتباری کا داغ تو نہ مٹ جاتا۔ بے عزتی کا دکھ میری رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ اب میری یادداشت ہی ساتھ چھوڑ دیتی تو میں یہ سب بھلا سکتی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ بھولی..... صرف اپنا عورت ہونا بھول گئی، بیوی ہونا، ماں ہونا بھول گئی، صرف زریاب کو سزا دینا یاد رہا۔

میں بھاگ گئی۔ مجھے بھانگنا ہی تھا اگر موجود رہتی تو جی بیان کرنا پڑتا اور شاید تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ وہ معافی مانگا، بچھتا تا، روتا شاید..... مجھے اسے معاف بھی کرنا پڑتا اور معافی اسے مطمئن کر دیتی۔ زریاب کو اطمینان مل جائے کیا یہی انصاف ہے؟ میں اسے عمر بھر جلتا دیکھنا چاہتی تھی چاہے اس کے لیے مجھے خود کو شعلوں پہ بی کیوں نہ جلاتا پڑتا۔

"صرف خود کو؟" مقدس کے سوال پر اس نے مگھری سانس بھری۔
"میں مانتی ہوں میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک امتحان میں ڈالا۔ لیکن میں پہلے پتا چکی ہوں کہ تمہیں تمہارے خاندان میں تمہارے اپنے لوگوں میں چھوڑتے ہوئے مجھے وہ فکر نہ تھی۔ اب میں کہاں جاتی تھی میرے نصیب کا کچھ حصہ تم بھی چرا لوگی۔" اجنبیت تمہاری سبیل بھی بنے گی اگر مجھے پتا ہوتا تو میں تمہیں کبھی اکیلا نہ چھوڑتی لیکن اپنی دور رسک تو میں نہ سوچا ہی نہیں۔ میرے دل دو ماخ پر تو اس وقت ایک ہی دھن سوار تھی۔
اب احساس ہو رہا ہے کہ اگر وقتی طور پہ زریاب کے حواس اس کے قابو میں نہ رہے تھے تو میں کب پورے ہوش و حواس میں رہی تھی۔ مقدس! میں اس کی سزا دیتی ہوں۔ میرا یہ اعتراف اس کا پہلا قدم ہے اور خوشنودم اب جان گئے ہو گے کہ زریاب

تمہارے باپ کا قاتل نہیں ہے۔ اس نے خود اپنی جان لی تھی، حالات چاہے کیسے ہی رہے ہوں، ان کا مدار چاہے کوئی بھی ہو، بہر حال اسے خودکشی ہی کہیں گے۔“
 ”آج آپ یہ کہہ رہی ہیں اور کیوں کہہ رہی ہیں، میں جان گیا ہوں۔“ اس نے کن انھیوں سے مقدس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن چھو جان، میں تو آپ کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں اور آپ نے ہی کہا تھا کہ میری نظر سے دیکھو وہ کتنے لوگوں کا قاتل ہے۔“

”اے اس کی سزا میں تو مل رہی ہے، قید میں بھی اور قید سے باہر بھی ایک مسلسل سزا اس کے تعاقب میں ہے ایک پیچھا تو اس سے بھری اجڑی ہوئی زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تم اس کی باقی سزا میں قدرت کے لیے چھوڑ دو اور اپنے اس خوبصورت دل کو صاف شفاف کر لو بالکل اپنے باپ کی طرح، بننا کسی نفرت کے، بننا کسی کدورت کے۔“

”میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔“ اس نے اٹھ کے گلاس وڈو تک جاتی مقدس کو دیکھا اور اپنی خشک تکیہ کا اٹھار کیا۔

”لیکن محبت..... اس کے لیے ابھی دل اتنا صاف نہیں ہوا کہ.....“

مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم مقدس کو بھی میری نظر سے دیکھو۔ میری نظر سے دیکھو کہ وہ ذریاب کی بیٹی ہے، یہ بھول جاؤ گے۔“ اس نے خوشنود کا مضبوط ہاتھ دباتے ہوئے اصرار کیا۔ اس کے کہنے پر اس نے نظر اٹھائی۔ کمرے کے اس کونے میں موجود مقدس شیشے سے پرے تاریک میدان کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور باہر موجود سنان لان میں چلتے آکا کا باب کے ٹھماٹے نکل شیشے پر نمایاں ہو رہے تھے۔ ان چلتے بچتے سایوں کے ساتھ مقدس کا چہرہ آج بھی اسے اتنا ہی روشن اتنا ہی منور لگ رہا تھا جتنا کہ روز اول محسوس ہوا تھا۔ اس کی خلا میں بھٹکتی آنکھوں کے نیلگوں آئینے رات کے اس سے سیاہی مائل سے لگ رہے تھے اور موی انھیاں بے دھیانی میں دیوار پہنچانے کیا لکھ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ دھند بچتی رہی..... وہ اسے دیکھتا رہا اور گرد صاف ہوتی رہی..... وہ اسے دیکھتا رہا اور روشنیاں دل میں اُترتی گئیں۔

”میرا دل..... ہاں میرا دل شفاف ہے۔“ اسے احساس ہوا تو اعتراف کرنے مڑا، مومنہ کی آنکھ لگ چکی تھی۔ دواؤں کے زیر اثر اس کے اعصاب اس کے کنٹرول سے باہر تھے۔ یہ محض اس کی اپنی قوت ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی بلکہ یادداشت کی ذمیل سے برسوں پرانے واقعات بھی ڈھونڈ لاتی تھی۔ اس نے کبیل درست کر کے اوڑھا دیا اور پچکے سے مقدس کے چھپے جا کھڑا ہوا۔ دیوار پہ حرکت کرتی اس کی انھیوں پر غور کیا وہ بے دھیانی میں ماں لکھتی چلی جا رہی تھیں۔

”ماں!.....!“ اس نے سرگوشی کی تو وہ چونک کے مڑی۔ خوشنود نے اسے انگلیاں مسل کے مٹھی بچھتے ہوئے دیکھا۔

”سزا میں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا مقدس، کیا سزا اور سزا ہمارے نصیبوں میں لکھ دی گئی ہے۔ کسی نے اپنی عمر میں کی سزا ایک گلاب چہرہ چھلکا دی۔ کسی نے اپنی عزت کا حرف آتے دیکھ کے ایک باوجود شخص کو اذیت ناک موت کی سزا دی، کسی نے انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کے ایک جذباتی شخص کو اس کے جرم سے بڑھ کے سزا سنا دی اور تم..... تم مقدس اس ماں کو کیوں سزا دے رہی ہو اسے ماں نہ تسلیم کر کے۔ جاتی ہو وہ زندہ ہی شاید صاف اس لیے ہے کہ تم ایک بار تمام شکوے بھلا کے ان کے گلے لگ جاؤ ورنہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے ان کی حالت دیکھتے ہوئے زندہ رہنے کی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مقدس ان کی سانسیں آسان کر دو۔ اس وقت تو اجنبیت کے بجائے اپنائیت کی آغوش مٹی چاہیے انہیں۔“

وہ رو پڑی..... سک سک کی رو پڑی۔

”رولو مقدس جی بھر کے رولو..... کبھی کبھی دھند یوں بھی چھپتی ہے، کبھی کبھی گرد یوں بھی صاف ہوتی ہے، میں مرد ہوں، روئیں سلسکا، جاتی ہو میں نے اپنے دل کا آئینہ شفاف کیسے کیا۔“ اس کے سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے وہ اس کی گہری آنکھوں میں بھر پورا انداز سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ کئی روز کے تناؤ کے بعد اس کے تھکے تھکے چہرے پہ یہ مسکراہٹ مقدس کو بڑی ٹھہری ہوئی گئی۔

”میں نے تمہیں دیکھا اور دھند چھٹ گئی۔“

☆☆☆

”درباب، بچوں کو اطلاع بھجوائی؟“ افراسیاب خشک نے بچھلے ایک گھٹنے میں کوئی چوتھی بار دریافت کیا اور ٹیٹھی میں جواب ملنے پہ ہنسنے لگا۔

”میں کیا کر سکتا ہوں لالہ؟ ہاسٹل سے یہی جواب ملتا ہے کہ وہ دودن سے نہیں آئی البتہ کل اس نے فون پہ انتظامیہ سے بات کر کے مزید دودن کی غیر حاضری کی اجازت لے لی ہے۔“

”اوہو یہ وقت اس بحث کا نہیں۔ تم جلدی سے اسے کال کرو۔“ افراسیاب نے معاملہ ختم کیا۔

ہال کمرے میں بھیچا چاندنیوں پہ، کافور اور آگریوں کی مہک کے ساتھ وہ تمام لوگ اس وقت گنگلی باندھے فون پہ بات کرتی زبیدہ کو دیکھ رہے تھے۔

”اس وقت اطلاع کرو دیتے لیکن تم دونوں اپنے اپنے ہاسٹل میں تھیں ہی کب؟“

شادوار نے ناچا جان کی وفات کی خبر سننے ہی جو سوال کیا تھا، وہ اس کا جواب دے رہی تھیں۔ ”اچھا بیٹا صبر کرو، دعا کرو اپنے باچا جان کے لیے، اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہ لوٹ آئیں گے۔ شاہناش چپ ہو جاؤ اور مقدس کا بتاؤ وہ کہاں ہے۔ کیوں غائب ہے اتنے دنوں سے ہاسٹل سے اس کی غیر حاضری کا سن کے سب ہی فکر مند ہیں۔“ اسے

چپ کرانے کراتے انہوں نے پوچھا اور جواب میں جانے اس نے کیا کہا تھا کہ وہ حیرت کی زیادتی سے صوفے پہ سے اچھل کے کھڑی ہو گئیں۔

”کیا کہا تم نے۔۔۔ اپنی ماں کے پاس؟“

”کب؟ کیسے؟“

”کہاں ملی تھیں؟“

سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر قریب چلے آئے ماسوائے زریاب کے۔ وہ وہیں بیٹھا خود کو ایک نئی خبر کے لیے تیار کرنے لگا۔ زبیدہ نے فون کر ڈیل پر رکھا اپنی حیرت سے بھری نظریں سب پہ دوڑائیں۔

”مومن۔۔۔ زریاب کی بیوی مل گئی۔۔۔ مقدس اسی کے پاس ہے۔“ ان کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

”وہ شادوار یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ ہاسٹل میں ایڈمٹ ہے مقدس بھی اسی وجہ سے ہاسٹل سے غیر حاضر ہے۔“ انہوں نے مزید بتایا کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا سب کی نگاہیں زریاب کے چہرے پہ جمی تھیں، جہاں اس وقت زلزلے کے آثار نمایاں تھے۔ بی بی جان نے آگے بڑھنے کی ہمت کی۔

”زر، میرے بچے یہی وقت ہے، اس وقت کروک لاور نہ پھر کچھ باقی نہ بچے گا، عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا۔ خدا اسے زندگی دے، اتنی کہ ہم لوگ اس کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی تو کر سکیں اور کچھ نہیں تو اس سے معافی تو مانگ سکیں۔ انھو زر، جاؤ اس کے پاس۔ قسمت سے یہ موقع ملا ہے، اسے کھونا مت۔“

”اس کے ہاسٹل بھی فون کیا ہے وہ اس وقت وہاں موجود نہیں۔“

”اتنی صبح تو کالج بھی نہیں کھلا وہ کہاں چلی گئی۔“ اس سوال کا جواب تو دراب کے پاس بھی نہیں تھا۔ رات کے پہلے پہر باچا جان کی وفات ہوئی تھی، اس وقت انہوں نے کرلز ہاسٹل فون کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ رات سے ہی برادری کے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق باچا جان کو زیادہ دیر تک رکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اور صبح فجر سے لے کر اب تک وہ لاہور میں مقدس اور شادوار سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ آخر کار افراسیاب خشک نے فیصلہ سنا دیا۔

”رابطہ کی کوشش جاری رکھو۔ انہیں آج ہی اطلاع ملنا تو لاہی ہے البتہ ان کے انتظار میں باچا جان۔۔۔ میرا مطلب ہے اب ان کی روانگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔“

زریاب اور بی بی جان دونوں صدمے سے غر بھرا اس سارے مسئلے سے بے خبر تھے۔ بیس سال کی قید میں ایک سادہ و جاہل زندگی گزارنے کے بعد زریاب کے لیے

رہائی کے فوراً بعد ملنے والے پے در پے جھٹکے شدید عذاب تھے اس کا وہ بیان ہی اس طرف نہیں کیا البتہ تجھیز و تکلفیں کے بعد بی بی جان ذرا سنبھلیں تو ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

”کسی نے لاہور اطلاع نہیں بھیجی تھی کیوں کو؟“

زریاب بھی چونکا اور دراب کے تفصیلی جواب نے دونوں کو نئی فکر میں ڈال دیا۔

”کہاں جاسکتی ہے مقدس دو چار دنوں کے لیے۔ ایسا تو بھی نہیں ہوا اور شادوار وہ تو کالج سے چار بجے تک آ جاتی ہے میں عموماً اس وقت اسے فون کیا کرتی ہوں پھر اب شام کے سات بجتے والے ہیں اور وہ ابھی غائب ہے۔“ بی بی جان بوڑھا رہی تھیں۔

”اور کالج بھی نہیں گئی ہے وہ آج۔ یہ بھی پتا چلا ہے۔“ دراب نے کہا۔

”کہاں جاسکتی ہیں دونوں بغیر بتائے۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔

زریاب مضطرب سا ہو کے ٹپٹپٹ لگا۔ بڑی دیر سے ہاتھ سل کے کچھ کہنے کی ہمت جمع کرتی ہوئی زبیدہ پیگم فیصلہ کن انداز میں انھیں۔

”وہ دراصل میرے پاس۔۔۔ میرے پاس شادوار کا موبائل نمبر ہے۔“

”موبائل نمبر؟ اس سے موبائل فون کب سے رکھنا شروع کر دیا۔“ دراب نے ماتھے پہ بل ڈال کے پوچھا۔ اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی جس پہ بیرون ملک کی تعلیم اور طویل قیام بھی اثر نہ ڈال سکا تھا اور حقیقت میں شادوار نے اس پھونٹے ماموں سے خائف ہو کر ہی موبائل فون سب سے چھپا کر رکھے پر مجبور ہوئی تھی کہ یہ اس کی ضرورت تھی۔

”لیکن بی بی جان میں کیسے؟“ اس نے گھر کے افسردہ ماتمی ماحول پر اک نظر ڈالی۔ ”ابھی صبح بچا جان کی تدفین ہوئی ہے، گھر لوگوں سے بھرا پڑا ہے، کل اس کے قتل ہیں اور میں یہاں سے چلا جاؤں“

”جانے والے تو چلے گئے زریاب۔“ افراسیاب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”جو جا رہے ہیں انہیں روک لو۔ اسے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ سوچنے میں وقت ضائع مت کرو اور جانے کی تیاری کرو۔“ ☆☆☆

نکلتے پندے مینوں چکاں مارے
تے میرے روندے نیں نین نمائے
جنیاں تن میرے تے لگیاں
تینوں اک لگے تے توں جانے
غلام فریدا دل اوتھے دیے
جتھے اگلا قدر وی جانے

(جتنی میرے تن پہ لگی ہیں تمہیں ایک بھی لگے تو پتہ چلے۔ غلام فرید دل اسے دینا چاہیے جو اس کی قدر بھی جانے)

نیم بے ہوئی کے عالم میں اسے اپنے ابا کی رود میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

یہ گیت..... یہ گیت ابانے تنہی بار سے سنایا تھا اور وہ بغیر مطلب جانے سمجھے، خود بھی درد کے اک گہرے سمندر میں بہنے لگی تھی کچھ پتھرے دنوں بعد جب زریاب سے اس گیت کا مطلب سمجھا تب بھی دکھ کی ہلکی ہلکی سی کہرنے اسے ڈھانچا چا لیکن اس نے جھٹک کے اس دکھ بھرے احساس کو پرے کر دیا ان دنوں تو وہ صرف خوش رہنا چاہتی تھی اور جب اس کہرنے اس کے گرد اپنا جال بٹنا شروع کر دیا، اسے ہر طرف سے غم کی دھند میں لپیٹ دیا تب اس گیت کے بولوں نے نئے نئے راز کھولے۔ آج اب کی آواز اسے اوپری اوپری سی ننگ رہی تھی۔ آج اس کا ہر لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

”ابا!“ اس کے لبوں سے کراہی نکلی اور پھر سے ذہن بے ہوشی کی وادیوں میں کھو گیا۔

اسے میرے محبوب!

میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔

لوٹ آؤ۔

میں تمہاری جھکن اپنے ہاتھوں میں سولوں۔

ماں کی آواز میں ”بڑہ“ اسے سنائی دیا۔ ”ماں..... ماں!“ اس نے ذہن کے گھٹا ٹوپ اندر صرے میں ہاتھ مارتے ہوئے ماں کو تلاش کرنا چاہا۔ اس کی ”کوپچی“ پگلی سپیاں کھٹک اٹھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ماں کے ”پوشش“ کا دامن تھامنا چاہا۔

”ابھی نہیں میری ڈاؤلی، بس کچھ دیر اور.....“ ابھی انکے ہاتھوں میں تپلی۔ ☆☆☆

”ماموں!“ وہ دینے ہوئے پتے پہنچنے کے کچھ دیر کے لیے رکا۔ سر اٹھا کے اس سفید عمارت کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر ”وہ“ موجود تھی جب ایک اشتیاق بھری آواز پہنچا۔ ہنز کاٹن کے مسئلے ہوئے سولوں سے بھرے لباس میں بلبوس وہ کم عمری لڑکی اپنے سنہری چہرے پر بے پناہ اشتیاق لیے اس سے ہی مخاطب تھی۔

”کون.....؟ مقدس“ اس نے سوچنا چاہا لیکن اس کی زردی مائل ہنز آنکھوں کو دیکھ کے خود ہی تردید کی..... یہ آنکھیں تو کسی اور کی یاد دلا رہی تھیں۔ رحیم گل آفریدی کی..... وہ چونکا۔

”ماموں!“ اب اس نے پورے دھیان سے اسے سنا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے بازو پھیلادینے۔

”وہ اندر ہیں۔ دونوں۔“ اس کے سینے سے نکلتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔ زریاب کا راول رواں لرز نے لگا۔

”بس کچھ دیر اور..... چند لمحوں بعد..... وہ دونوں میرے سامنے ہوں گی۔“ اس کا دل یہ سوچتے ہی اچھل اچھل کے یہ چند قدموں کا فاصلہ ایک ہی قدم میں طے کرنے پر اکسائے لگا اور جب جی بچ ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ رک گیا۔

کورڈر میں مابل کے ہلر کے ساتھ ٹیک لگائے وہ بلاشبہ مقدس ہی تھی۔ اس نے نیلم کے کٹڑوں کے گرد ہیروں کی کنیاں دکھتی دیکھ لی تھیں۔ اگر اللہ ان آنکھوں میں نیلا نہیں اتارنے کے بجائے شہدرنگ جیسے ظہیر ادا تو کون پہچان پاتا یہ مومنہ ہے یا مقدس۔

”بابا جان“ اس نے زریاب کے پھیلے بازو دیکھے تو ابھڑی گئی۔ ذہن میں کہیں خوشنود کے الفاظ نے سہارا دیا۔

”سزا نہیں دینے کا عمل کب تک جاری رہے گا۔“ اس نے باب کی بیاسی آغوش میں جانے میں دیر نہ لگائی۔ ماں کی ممتا کو تسکین پہنچانے میں اس نے جو کچھ چاہا کھٹ کا مظاہرہ کیا تھا، اس کا خمیازہ وہ ایک کسک کی صورت بھگت رہی تھی۔ اس وقت اس کی ماں زندگی کی آخری بازی کھیل رہی تھی۔ اور وہ باہر کھڑی اللہ سے بس ایک لمحہ مانگ رہی تھی۔ بس

ہوئے شیشوں میں مسکراہٹ کا عکس جھلکایا۔ خوشی کی چمک نے اس کے زرد چہرے کو یکایک جگمگادیا۔ اس کے لبوں نے پھر پھڑکا کر اسے پکارتا چاہا لیکن وہ ہیں دوزانو بیٹھے اس کے پیچھے چھوئے گی۔

میری پیاری ماما..... میری ماما مجھے معاف کر دیں مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو کتنا دکھ دیا۔ آپ انہیں پھیلا پھیلا کر مجھے باقی رہیں اور میں بے شر حسابوں میں کھوئی رہی..... میں کتنی بد نصیب ہوں ماں کے سنے کے بعد بھی اس کی قدر نہ کی۔“

اس کے آنسوؤں نے مومنہ کے ہیرے بھگو دیے۔ وہ بولنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ بدقت ہاتھ اٹھا کر اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ یوں بکلی کی طرح اس کے بازوؤں میں گئی جیسے اس ملاقات کا ایک بل بھی ضائع نہ کرنا چاہتی ہو۔ مومنہ نے کپکپاتے ہاتھوں میں اس کا جھکا چہرہ تھام لیا اور لبوں سے اس کے ماتھے پر ایک دعا بحث کر دی۔

”میں جانتا چاہتی ہوں کپکپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پر سکون ہوگی جو ماں کی ہانہوں کی پناہ میں ہے۔“

آج اس کی دعا کا یہ آخری حصہ بھی پورا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دعا کا وہ آخری جملہ یاد آیا۔ ”بس تھوڑی سی چھاؤں..... یا اللہ ذرا سی گرمی۔ بس اک بوسہ..... یا اللہ بس اک دعا۔“ وہ کانٹ گئی۔

”کیوں میں نے بس ایک دعا کی طلب کی؟ کیوں میں نے بس ایک بوسے کی، ذرا سی گرمی کی خواہش کی۔

کہیں، کہیں..... بس ایک بوسہ تو نہیں۔“ وہ خوفزدہ ہو کر ماں کو پکارنے لگی۔

”ماما..... ماما آکھیں کھولیں آپ نے پھر سے آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ دیکھیں ماما ہر کون آیا ہے..... بابا جان آئے ہیں آپ کے پاس خود چل کے آئے ہیں اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے..... آپ کی ہر بات کی سچائی یہ ایمان لانے کے لیے.....

آنکھیں ماما..... پلے باز سہلے لیں۔ ایک باطل ہیں وہ شرمندہ ہیں، ہمارے ہوئے ہیں، انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ بھی ان کی سزا معاف کر دیں ماما۔“

”ماما خدا کے لیے..... میری خاطر اب تو اپنے دل کو نرم کر لیجئے۔ معاف کر دیں انہیں۔ خدا بھی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ انہیں آپ کی پاکیزگی کا یقین ہے۔ آپ کو اورد کیا چاہیے۔ بس کریں اپنے دل کو جلاتا..... بس کریں یہ نفرت کا کھیل، نکال پھینکیں اپنے دل سے یہ کالے پھول.....“ اس

ایک لمحہ جس میں وہ ماں کو جاتے جاتے اپنی محبت کا یقین دلا جائے۔ اندر خوشنود ڈاکٹر محمود کے ساتھ مل کے وہ ایک لمحہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مومنہ کی بے ہوشی طویل ہو چکی تھی۔

”میں ایک بار اپنے سر پر باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرتا چاہتی ہوں۔ میں جانتا چاہتی ہوں وہ شہنشاہ کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں سے پھیل جھاؤں میں ہے۔“

کچھ ہی روز قبل فجر کی نماز میں کی گئی دعا کے الفاظ اس کے چاروں طرف گونجنے لگے۔ سر پر بھی زرباب خشک کی پھیلی ہوئی شہنشاہ کی سی پوری پور میں اترنے لگی۔ اسے اپنی دعا کے پورا ہونے کا یقین ہو گیا۔ وہ ایمان لے آئی کہ اس دعا کا دوسرا حصہ بھی ضرور پورا ہوگا۔

اس نے ڈیڈ بائی آنکھوں سے باپ کے خدو خالی میں وہ عکس ڈھونڈنے چاہے جو بچپن کے گھر میں لگی قد آدم تصاویر میں دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے وجہ یہ سرائے پہ لٹنے کا کام نمایاں تھا۔ چہرے پہ پچھتاہوں کی گہری لکیریں تھیں، بھوری آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور چوڑے شانے ڈھلکے ہوئے تھے۔

”ماما تمہیں خراؤں کے خواہے کر کے بابا بھی اجڑے ہی رہے ہیں۔“

”مقدس!“ کمرے سے نرس کے ہمراہ نکلتے ڈاکٹر خوشنود نے آواز دی۔

”فیروز!“ زرباب کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ بے یقینی سے اس نو جوان کو دیکھنے لگا۔

”پچھو بھی جان، ہوش میں آگئی ہیں لیکن..... لیکن ابھی کوئی تسلی بخش بات نہیں کی جاسکتی، تم چاہو تو ان سے مل سکتی ہو۔“ اسے ایک دراز قامت گھرے تھکے انسان کا ہاتھ تھام کے اندر جاتے دیکھ کر اس نے روکا۔

”تم کہیں ان سے مل سکتی ہو مقدس۔ میں نے کہا ناں ان کی حالت بہت نازک ہے۔“ وہ کچھ کچھ بچپان رہا تھا۔

”بابا جان!“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہنا چاہا۔ جواباً زرباب نے ایک سرد آہ بھری۔

”کامیرے نصیب میں پچھتاہوں سے رہائی نہیں لکھی۔ مقدس..... میری بیٹی اپنی ماں سے مجھے معافی دلا دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کے قریب بانک اٹھا۔

”میں تو رہی نہیں سکوں گا اگر اس نے مجھے معاف نہ کیا.....

مومنہ کی آتی جاتی اکھڑی سانسیں دیکھ کے مقدس تڑپ گئی۔ اس نے ماں کے برف ہوئے ہیرے تھام لیے۔

”ماما..... مومنہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں کے دھندلے

کے مسلسل اصرار پہ مومنہ نے ہار مان لی۔ اس کے لبوں پہ ایک بے بس خاموشی تھی۔
 ”مومنہ!“ زرباب نے پکارا۔ اس کے چہرے کے بدلے نقوش دیکھ کے اس کے دل پہ گھونسا پڑا۔ پچھلے دنوں میں اس نے بڑی سے بڑی اندوہناک خبریں سنی تھیں مگر یہی حادثنے جھیل لیے تھے لیکن..... لیکن اس گلابی ریشمی چہرے کی جگہ ادھ جلا سا نولا پڑتا زرد چہرہ دیکھ کے اس کے دل پہ جو قیامت گزری تھی وہ سب سے اذیت ناک تھی۔

”اور کیا ان اندھیرے درپچوں کے پیچھے اب بھی شہد کی جھینل آباد ہے۔“
 ”مومنہ! ایک بار تم نے پوچھا تھا۔ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں۔ میں صحیح طرح بتا نہ پایا تھا، شاید تب میں جانتا ہی نہیں تھا۔ آج میں تمہارے سوال کا جواب دینے کے قابل ہوں۔ ستو مومنہ، پھولوں کے رنگ کالے نہیں ہوتے..... پھول بھی کالے نہیں ہوتے، کالک تو دلوں پہل دی جاتی ہے، سیاہی تو روح میں اتر جاتی ہے۔ اندھیرے تو نظروں پہ چھا جاتے ہیں، اتنی تاریکی میں جو بھی دیکھو کالا ہی لگتا ہے۔ ایسے ہی اندھیرے مجھے بھی چاٹ گئے تھے۔ میرے دل پہ، عقل پہ، بشور پہ، ہر جگہ سیاہی مل دی گئی اسی لیے مجھے تمہارا دامن کالا نظر آیا۔ لیکن تم میلی ترسے ہو سکتی تھیں۔ پھول بھی کالے نہیں ہوتے، بھی کالے نہیں ہوتے۔“ وہ جھپک کے اسے بتا رہا تھا لیکن اس بے حس و حرکت وجود میں اب کسی راز کو جان لینے کی خواہش رہی تھی نہ بہت۔

”مومنہ..... مومنہ“ وہ وحشت زدہ سا چلا اٹھا۔ مقدس اور خوشنود اس کی آواز کی گونج سے چونک کر اندر کی طرف لپکے۔

”مومنہ! تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ تم مجھے معاف کیے بغیر کیسے جا سکتی ہو۔ تم مجھے اتنی لمبی سزا کیسے سنا سکتی ہو۔ تم اتنی پتھر دل کیسے ہو سکتی ہو مومنہ، مومنہ! تمہیں خدا کا واسطہ لوث آؤ۔ مجھے اس قید سے نجات دلاؤ۔ اس سنگباری کو روکو اور۔“

وہ گر پڑا تھا اور اس کے بے جان وجود سے رحم کی جھپک مانگ رہا تھا۔ مقدس نے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ آگے بڑھ کے مال کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

”تمہارے اندر کی عورت جیت گئی ماں، تم مر گئیں، لیکن تم نے اپنی نفرت مرنے نہ دی۔ شاید یہی نفرت تمہاری زندگی تھی لیکن میں جانتی ہوں تم بزدل تھیں۔ تم خود کو جھٹتا مرضی کھٹور ثابت کر لو تم ایک بزدل عورت تھیں۔ اس بزدلی نے تمہیں مرنے پہ مجبور کیا۔ اگر زندہ دہیں تو نفرت مر جاتی۔ ہے ناں ماں؟ جج جج تاؤ تمہاری نفرت مرنے لگی تھی ناں؟“

ختم شد

سارے گلاب لے جانا

”میں نے سرخ گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔“

میرے ہاتھ میں کاہتے چلے گلابی کاغذ پہ لکھے چند بہم سے الفاظ نے مجھے کسی گہرے کنوئیں میں لا پھینکا، میں نے آنکھیں بند کر کے اس خط کو زور سے اپنی ٹھنڈی میں بھیجا اور پھر سہارے کے لیے دیوار سے ٹیک لگالی۔ میری بند آنکھوں کے آگے ایک ہی کس جھلکار رہا تھا۔

زینیا عمر!

زینیا!

جو مجھ سے محبت کرنے لگی تھی، اس وقت جب میں نے اس سے محبت کرنا چھوڑ دی تھی۔ لیکن میں نے اس سے محبت کرنا شروع کیا ہی نہیں۔

پتا نہیں میں محبت کرنا جانتا بھی ہوں یا نہیں۔ محبت تو ہاں..... میں نے بھلا کب محبت کی، ہاں اسے محسوس ضرور کیا تھا۔ ایک بار نہیں کئی بار..... اپنے بہت قریب..... بہت

ہی قریب اور جب محبت نے کسی آسب کی طرح میرے وجود کو جکڑنا چاہا تو میں ہی گھبرا کے بھاگ نکلا۔

بزدل ہوں نا.....

میری بزدلی نے مجھے یہ اعتراف تک نہ کرنے دیا کہ میں عاشق ملک اس عام سی لڑکی زینا عمر کا اسیر ہو چکا ہوں۔ میری خود پسندی اس حقیقت کو بھٹلاتی رہی کہ دو پرسکون سی آنکھیں میری بے چین فطرت کو گھیرے میں لے رہی ہیں۔

میں نے اس بے جان پرزے کو جب میں ڈالا اور سیف سے اپنا پاسپورٹ اور کیش نکال کر سامان پیک کرنے لگا۔ میں اڑکے اس سرزمین پہ پہنچنا چاہتا تھا، جہاں سے مجھے سرخ نگاہوں کا وعدہ یاد دلایا گیا تھا اور مجھے یہ وعدہ بھانا ہی تھا۔

”اچھا جب تم مرو گی ناں تو مجھے ضرور بتانا کم از کم تب تو یہ گلاب تم پہ چڑھا سکوں گا۔“ کبھی میں نے بے حد مل کر اس کے واپس کیے گلابوں بھرے کبکے کو اپنی ٹیبل پہ پینچ کر کہا تھا۔

”اس سے پہلے میں تمہیں اپنی شادی کی دعوت دوں گی۔ بڑے چوڑے اس سرخ تازہ گلابوں والے گلدستے کے ساتھ شرکت کر کے۔ تم نے سنا نہیں ٹھیک طرح سے کہ میں نے کیا کہا ہے ان پھولوں کے بارے میں، یہی کہ یہ وہ مومنوں پہ ہی بچتے ہیں یا تو میت پہ یا شادی پہ۔“ اس نے چڑایا ”آؤ گے ناں پھر پھول لے کر؟“

اور مجھے یہ وعدہ بھانا ہی تھا۔ زندگی کے کسی مقام پہ تو خود کو چاٹنا ثابت کرنا تھا۔ مگر کیا..... واقعی..... واقعی..... وہ کسی اور کی ہوئے جارہی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ میری ہمیشہ سے یہی تو خواہش رہی ہے کہ میں..... عاشق ملک..... کبھی نہ کبھی..... اسے زینا عمر کو ہر اکے دکھاؤں اور اب جب ایسا ہونے جا رہا ہے تو جیسے میرے دل کو کوئی ایڑیوں تلے چلکے جا رہا ہے اور میرا دل..... میرا فارغ خود پسند دل۔

آفس سے ایرپورٹ اور پھر پلین تک پہنچتے پہنچتے میرا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ لیکن سیٹ کی پشت سے سر نکال کے آنکھیں موندتے ہی جیسے ایک فلم کی چل پڑی۔ خود پہ کسی کو حاوی ہوتے دیکھنا میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

میں عاشق ملک..... دراز ذہن، وجہہ ذہن، حاضر جواب، خوش مزاج اور اعلا تعلیم یافتہ۔

میں ”کچھ۔“ ہوں، اس کا احساس مجھے قدم قدم پہ دلا یا گیا۔ نتیجتاً میں خود کو

”بہت کچھ۔“ سمجھنے لگا۔ گھر میں بھی اور باہر بھی۔ گھر میں افراد ہی کتنے تھے۔

ای، بھائی جان اور میں۔

ابو کی بھی وفات کے وقت میری عمر نو برس تھی اور اتنا ہی فرق میرے اور بھائی جان کی عمر میں بھی تھا۔ اس قدر تنہائی میں انہوں نے بڑا بھائی بن کے نہیں بلکہ باپ بن کے میری پرورش کا ذمہ اٹھایا۔ ابو کی کاروبار سنبھالنے کے لیے انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ الف۔ ایس سی کے دوران ہی منقطع کر دیا۔ حالانکہ انہیں میڈیکل لائن میں جانے کا کس قدر شوق تھا اسی جان نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنے پروں تلے چسپا کے بالا تھا۔ اب جب باقر بھائی جان کو یکدم باہر کی دنیا کے پیچھے رہنے سہنا پڑے تو بوکھلا گئے۔ پھر یہ بوکھا ہٹ جیسے ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی۔ انہوں نے خود کو بالکل ہی وقف کر دیا۔

بھائی جان تو بے چارے خیر کیا کرتے، البتہ میں نے خوب خوب اس نرزی کا فائدہ اٹھایا، اسی جان نے میری ہر جا بے جا ضد اور فضول سے فضول تر خواہش مان کر میرے اندر خود سری کے کیڑے کو برداں چڑھایا۔

مجھے اپنے آگے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میرے دل میں محبت نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ای، ابو بھائی جان دونوں سے ہی مجھے پیار تھا، ان کے بغیر میں اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں بس خرابی بھی میری سوچ میں۔ میں انہیں اپنے لیے ضروری قرار دیتا تھا، ان کا پیار، لاڈ و صولتا اپنا حق جانتا۔ لیکن بھی نہیں سوچا کہ میں ان کے لیے کیا ہوں۔ کیا انہوں نے بھی میری ذات سے کچھ امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

کے لیے کیا ہوں۔ کیا انہوں نے بھی میری ذات سے کچھ امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ بھائی جان مجھے میڈیکل لائن میں دیکھنا چاہتے تھے، جو خواب وہ خود پورا نہیں کر سکتے تھے، اسے میرے حوالے سے تکمیل پاتا دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے

صاف صاف سنا دیا۔

”بھائی جان پلیز ایسا سوچے گا کبھی مت، بات میری دلچسپی ہونے پانا ہونے کی نہیں ہے۔ شاید میں اس طرف اپنا رجحان کر بھی لیتا، لیکن آپ کے یہ کہنے کے بعد تو بالکل بھی نہیں کہ آپ اپنے اصورے خواہوں کی تکمیل کے لیے مجھے ڈاکٹر بنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ ایسا کر کے مجھے ہر بل پہ گئے گا کہ میں اپنی نہیں، آپ کی زندگی جی رہا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی مکمل اپنی جا چاہیے، اپنی مرضی کی، اپنی خوشی اور اپنے حوالے سے۔“

اپنی صاف گوئی کے ذمہ میں میں نے ان کا دھواں ہوتا چہرہ بھی نہ دیکھا۔ ان دنوں میں ایسا ہی تھا۔ یہ سوچنے کی محنت میں کم ہی کیا کرتا کہ میرے مخاطب بے جان درو دیوار نہیں، مجھ ہی سے وابستہ مکمل احساسات رکھنے والے جیسے جگائے لوگ ہیں۔ جن پہ

میرے الفاظ کو کوئی رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔

باقر بھائی جان کی طرف سے ملنے والی بھاری پاکٹ منی کے باعث میرے ارد گرد ایسے یاروں دوستوں کا ہجوم لگا رہتا جو میری خود پسند فطرت کی تسکین کرتے رہتے۔ یہ وہ دور تھا جب اپنا آپ منوانے کی تنہا، میری سرکش طبیعت میں دھیرے دھیرے سر اٹھانے لگی تھی۔

شرمین.....!

میری ماموں زاد، میری ہم عمر تھی۔ بچپن کا ساتھ تھا۔ شروع ہی سے اکٹھے بڑھتے، کھیلنے آتے تھے، اسے میں نے اپنے دیگر فریڈ زاد اور کزنز سے بھی الگ نہیں سمجھا تھا۔ مگر جب ہائی اسکول میں ہمارے ڈیپارٹمنٹس الگ الگ ہو گئے تو زندگی میں پہلی بار مجھے کسی کی کمی محسوس ہوئی۔ کالج پہنچتے ہی میں نے ضد کر کے موٹر بائیک خریدی، حالانکہ بھائی جان مجھے گاڑی تھے۔ میں دینا چاہتے تھے، مگر میں جانتا تھا شرمین کو بائیک کی سواری کا کس قدر شوق ہے۔ اور اب میں چھٹی کے بعد بائیک لے کر اس کے کالج کے گیٹ پہ کھڑا ہو جاتا۔

ہمارے گھر ایک ہی بلاک میں تھے۔ اس آٹھ دس منٹ کے روزانہ کے ساتھ نے مجھے اس کی جانب کھینچے پر مجبور کر دیا۔ وہ کس قدر حسین، معصوم اور دلکش تھی میں ہر روز اس کا اندازہ پہلے سے بڑھ کے لگتا۔ اس کے چہرے میں ہر روز اس کی کشش محسوس ہوتی۔ اس کی آنکھیں کتنی نیلگوں، کتنی گہری ہیں اور نیلم کے ان دیکھے ٹکڑوں کے گرد یہ باریک بھوری لائن اور گلابی ڈورے، ناف میں مدھوش ہو جاتا۔ پلکیں سمجھی تھیں تو گہری بھورے لکمان دار بروؤں کے نیچے اُبھرے ہوئے سفید چوٹوں پر چمکیں ہلکی ہلکی رنگوں میں ارتعاش سا برپا ہو جاتا۔ اور بے حد گھنی لائمی پلکیں، جن کا سا یہ اس کے زخاروں تک آتا تھا، گول گول بھرے بھرے سرخ اتار کی رنگت والے اس کے گال جن کے دونوں جانب بڑنے والے گہرے ہنور ان کا حسن اور بڑھادیتے۔ کتنے روپ بدلے تھے یہ ہنور، اس کے قل قل ہنسنے پر پہ پہرے ڈھیل جیسے سپدھے دل میں ہی کھب جاتے، ہسکرانے پر گدگد، آنے لگتے اور ناراضی میں لب سختی سے بچھ لینے پر بھی زخاروں پر ہولے ہولے جھانکنے لگتے۔ چھوٹا سا دہانہ، کھلے کھلے باقوتی لب، گلدایا بدن، گداز سر میں ہاتھ چیر، ٹھٹھکی آواز مہکتی باتیں۔

اسے دیکھ کے مجھے اردو شاعری میں پڑھے ہوئے تمام قصیدے اور تشبیہات یاد آ جاتیں جو میں اس سے بھی کہہ نہ سکا۔ وجہ ہمت کی کمی نہیں میری ازلی خود پسندی تھی۔

اسے بائیک پر اپنے پیچھے بٹھا کے میں سمجھتا رہا کہ میں نے اسے فتح کر لیا ہے۔

اسے اپنی ملکیت سمجھنے کی میری یہ خوش بھی اس وقت ریت کی دیوار کی طرح ڈھسے گئی جب اسی جان اسے باقر بھائی کے نام کی انگوٹھی پہنا آئیں۔ میں ہکا بکا رہ گیا کیا اس قدر حسین، اچھولی چیز میرے علاوہ بھی کسی کا حق ہو سکتا ہے، اور وہ بھی باقر بھائی جان جیسے انسان کا، کیا ہے ان میں۔ کون سی خوبی ہے جس کے ثلے بولتے یہ وہ شرمین کے حسن کا قلعہ فتح کرنے چلے تھے۔ شکل و صورت، تعلیم و ذہانت، عمر کی طرح بھی وہ میرے پلہ نہیں ٹھہرتے تھے۔ میں کینکری سے چٹا۔

میں چاہتا تو بڑی آسانی سے اپنی ضد منوا سکتا تھا، اسی جان مجھ پر قربان ہونے کو تیار اور بھائی جان میری دل دہی کا پناہ لینا فرض سمجھے بیٹھے تھے۔ مگر وہ جس کی ذات کے کسی اور نام کی مہر لگ چکی ہو، اسے اپنا نا بے حد محسن اور پھر اس کا حسن، اس کا سراپا دل و نظر کے لیے لاکھ پسندیدہ کیلین میری انا مجھے اس کی ذات کو یہ فخر سوچنے سے روکتی تھی کہ اسے میں نے..... نے زمانے سے لڑ کے حاصل کیا ہے۔ سو شرمین کو تو میں نے فوراً ہی دل کی مسند سے اتار دیا کہ ابھی تک وہ دل و نظر تک ہی پہنچی تھی۔ روح میں نہیں سہائی تھی مگر اس احساس شکست کو ذہن کی سلیٹ سے کھرچا نہ سکا۔

میرا تجربہ یہ درست تھا۔ شرمین اور باقر بھائی جان کسی بھی طرح ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں سترہ سالہ شرمین ”بھابھی“ وقت سے پہلے پھجور ہو جانے والے بزرگ نما جوان شوہر کی ہمراہی میں حواس باختہ نظر آنے لگی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ جس طرح باقر بھائی جان اپنی عمر سے کئی سال آگے تھے اسی طرح وہ اپنی عمر سے کئی سال پیچھے۔ کسی بات کی گہرائی تک اترنا تو دور کی بات وہ تو سرے سے سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی تھی۔ مجھے تو یقین تھا اس رشتے پر جب اس کی رضا مندی دریافت کی گئی ہوگی تو اس نے شخص کالج کی تعلیم سے فراغت، چمک دکھ کرتے زیورات، ملبوسات اور بڑی مومن وغیرہ کی حد تک اپنے تصور کے کھڑے دوڑائے ہوں گے اور جھٹ ہال کہہ دی ہوگی۔

گھر میں عورت کے آ جانے کا کوئی احساس اس کی آمد سے نہیں جاگا تھا۔ وہ در ساڑھے دس بجے جاگئی، جب کہ پورے نو بجے آؤں چلے جانا بھائی جان کا معمول تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پر ہم تینوں ماں بیٹے ہوتے اور دوپہر کے کھانے پر کبھی میں اور اسی جان اور کبھی صرف اسی جان۔ کیونکہ بارہ بجے ناشتا کرنے کے بعد وہ دو بجے کچا کرنے ضرورت محسوس نہ کرتی تھی۔

شام کو الگ ہی تماشا ہوتا۔ اسے ہر روز گھر کے کھانے پسند نہ تھے، وہ ہر دوسرے دن بھائی جان سے باہر ڈنر کرنے کی ضد کرتی۔ جب کہ بھائی جان سارے دن کی سر کمپانی کے بعد گھر سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ کبھی بکھا تو وہ اس کے بجور کرنے پر طوعاً کرنا طے بھی جاتے اور کبھی مجھے مدد طلب نظروں سے دیکھنے ملتے۔ جب کہ میں صاف انکار کر دیتا۔ اب جب کہ وہ محض ایک حسین و جمیل دو شیرہ نہیں، بلکہ کسی کی بیوی، بلکہ میرے اپنے ہی بھائی کی منکوحہ ہے، مجھے اسے سر پہ لا دے مارے مارے پھرنے کا کوئی شوق نہیں رہا تھا۔ وہ خود بھی میری بے زنجی کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔ جب کہ ہمارے درمیان خاصی بے تکلفانہ دوستی رہ چکی تھی۔ اب تو خیر میں اس کی بات کا جواب بھی رکھائی سے دیتا۔ بلکہ باقر بھائی جان کو اس کے آگے خادصانہ انداز کے ساتھ ہاتھ باندھے منمناتے دیکھ کے تو میری جان ہی جل جاتی۔

”شرین! میرا خیال ہے.....“ اس دن مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے نوک ہی دیا۔ اسی کے کہنے کے باوجود میں نے اسے بھابھی پکارنے اور آپ جناب والے تکلف سے پرہیز نہ کیا تھا۔

”اب تم بھی کچن کو روٹی بخش ہی دو، کب تک ہم ای کی پریڈ کروا رہے ہیں گے۔“

جو بات اسے بھائی جان اور ای جان کو کہنی چاہیے تھی وہ میں نے نہ کہہ دی۔ صبح ناشتے پہ بھی اسے اچانک ہی براٹھا کھانے کی سوچھی تھی۔ جب کہ اسنے دلوں میں اس نے نیم، کریم، بریڈ اور دلہ کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ای جان کو فوراً پراٹھا تیار کرنا پڑا۔ اور اب اسے چاول نہیں کھانا تھے۔ روٹی پکانے کے لیے اسی کو کھٹے دیکھ کے میں ضحک نہ کر سکا۔ ”ای جان رک کے مجھے تینتالیں نظروں سے گھورنے لگیں، شاید انہیں لاڈلی بھانجی اور خجری بھوکی ناراضی کا غدشہ تھا۔ بھائی جان بھی چادلوں سے بھرا چھوٹے من میں رکھ کے جیسے نکالنا ہی بھول گئے اور شرین کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ گئے۔ جب کہ میں اپنی کہہ دینے کے بعد اطمینان سے سانس ڈالنے لگا۔

”جب کہ میرا خیال ہے اب ہمیں کوئی لک رکھ ہی لینا چاہیے، آخر کب تک ہم ای کی پریڈ کروا رہے ہیں گے۔“ اس نے بڑے ہی سکون بھرے انداز میں میرا جملہ مجھے لونا دیا اور سلاڈ کے پتے کترنے لگی۔ اس کے بظاہر عام سے لہجہ میں پوشیدہ جناد دینے والی ہنک محسوس کر کے میں چونک گیا۔ (بہتر تو شرین بی بی کو بولنا اور وہ بھی سوچ سمجھ کے بولنا آئی گی)

”ہمارے گھر میں آج تک خانساماں نہیں رکھا گیا۔“ میں نے اسے اطلاع دی۔

”ہمارے گھر کا اصول ہے، کچن کا کام صرف گھر کی خواتین کرتی ہیں۔“
 ”خاموشی سے کھانا کھاؤ عاشر! کیا اصول بحث لگا رہی ہے۔“ ای جان نے متوقع بد مزگی بھانپ کر مدخلت کی۔

”آپ کچن میں مت بولیں۔“ میں اپنی عادت کے مطابق ہمیشہ کی طرح درشتی سے بولا۔
 ”واہ بڑے اصول اصول لگا رکھے ہیں۔ خود کو دیکھا ہے بھی، کیا طریقہ ہے ماں سے بات کرنے کا۔“ اس نے میری بات پکڑ لی۔

”تمہیں کوئی نوکے تو مزے سے کہہ دیتے ہو، مجھے ان گھسے پنے حدیوں پر اسنے اصولوں پہ چلانے کی کوشش کوئی نہ کرے اور خود دوسروں کو اصول پرستی کا درس دے رہے ہو۔“ اس کے چمک کے بولنے پر میں نے طیش میں آ کر زور سے میز پہ ہاتھ مارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی ہمت تو اس میں تب بھی نہ تھی جب ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ تھا۔ وہ دیوٹی لڑکی آج بڑھ بڑھ کے میرے مقابلے پہ بول رہی تھی۔ میرے.... میرے آگے..... جسے اپنی بات کے رد ہونے کا بھی تجربہ بھی نہ ہوا تھا۔

”آرام سے بات کرو شرین! کیوں چلا رہی ہو، بلا وجہ۔“ بھائی جان بالا آخر ہمت کر ہی پھنے۔

”بلا وجہ..... بلا وجہ چلا رہی ہوں میں۔ آپ دیکھ نہیں رہے عاشر کس طرح پیش آرہا ہے مجھ سے، اس کو کیا حق ہے مجھ سے اس طرح بات کرنے کا، یہ کون ہوتا ہے مجھ پہ ذمہ داریاں عائد کرنے والا اور مجھے یہ بتانے والا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ کیا گھر میں سب سے بڑا یہ ہے۔ کیوں اتنی چھوٹ دے رہی ہے آپ نے اسے، کہ یہ مجھ سے اس گھر کی بڑی بیوہ ہے۔ اپنی بڑی بھابھی سے یوں سوال جواب کر رہا ہے۔ کیا میں نے آپ سے کئی مرتبہ نہیں کہا کہ مجھے پھوپھو سے کام لینے سخت ممنوع کی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے تو میں آپ سے ڈنر باہر کرنے کے لیے کہتی رہتی ہوں، کیونکہ میں دن میں ایک ہی بار تو کھانا کھاتی ہوں اگر وہ بھی میری پسند کا نہ بنے تو، مجھے پٹن میں جا کے پھوپھو سے کہہ کے بنوانے میں جھج محسوس ہوتی ہے، آج سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں کہ ایک لک ہی رکھ دیں۔ کم از کم میں اسے آرزو دے کر اپنی مرضی کا کھانا تو بنا سکتی ہوں۔“

کمرے کے بند دروازے میں اس کے زور زور سے بولنے کی آوازیں لہر دیتی گئی جلی آ رہی تھیں۔ میرے اپنے کمرے میں طے آنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

”شرین! تم میری بیٹی ہو، بھونٹیں، مجھے تو بیٹی کے لاڈ اٹھانے کی حسرت ہی رہی، اب تم پہ ہی اپنے شوق پورے کروں گی۔ تم بلا تکلف مجھ سے کہہ دیا کرو، جہاں جو بھی دل

چاہے، میں بنادیا کروں گی اپنی بیٹی کو۔“
ای جان نے نرم روی سے معاملہ لکھانا چاہا۔ مگر وہ شرمین تھی، کروڑ پتی باپ کی ناز
نخرے والی بیٹی جس نے اپنی مرضی سے کم یہ راہی رہنا سیکھا ہی نہیں تھا۔
”تھک یو..... پھو پھو! میں جانتی ہوں آپ مجھ سے کس قدر پیار کرتی ہیں، لیکن
ان فیکٹ مجھے یہ آگوست، کوکے، قیصرہ کے لیے اور پلاؤ وغیرہ کچھ خاص پسند ہیں اور میری
پسند کی چیزیں، شاشلک، چاؤمن، اسٹیک وغیرہ آپ بنا نہیں سکتیں۔ آپ میرے لاڈ بے
شک مت اٹھائیے۔ مجھے ایک بلٹر رکھوا دیجئے مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔“ اس نے
ترش روی سے جواب دیا۔

اور ایک ہفتے کے اندر اندر بھائی جان نے گھر میں ایک لک رکھ لیا۔ بات کو معمولی
سی تھی لیکن ہمارے گھرانے کے مزاج کے خلاف، ماموں جان وغیرہ ان لوگوں میں شمار
ہوتے ہیں جنہیں چھپر پھاڑ کے دولت اچا کمل جاتی ہے، اتنی اچانک کہ وہ حواس باختہ
ہو جاتے ہیں، تن پھوٹتا جھلکتے ہیں، منہ میں چاندی بھر لیتے ہیں۔ اور سر پہ ہیرے، لیکن
چھپر پھانکا پھنسا ہی رہتا ہے۔ جب کہ میری امی بیابہ کے جس خاندان میں آئیں وہاں
چھپر کی سلاخی کا دھماکا سب سے پہلے رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہماری حیثیت تفصیل کے
مقابلے میں کچھ کم تھی لیکن ایسی گرگروں بھی نہ تھیں بس ہمیں دکھاوا نہیں آتا تھا۔ شادی کے
ابتدائی سال امی جان نے کچھ نکلے سے گزارے تھے اس لیے بیسے کی اہمیت اور قدر قیمت
کا احساس تھا ان کے دل میں، اب امی جان نے دن رات محنت کر کے یہ برنس سیٹ کیا تھا، اور
اب گھر میں خوشحالی و فراغت آ جانے کے بعد بھی ہمارا دن بہن سادہ ہی تھا۔ امی جان
اپنی بھابیوں کی طرح سوئے میں لدی نظر نہیں آتی تھیں۔ ایک عام گھریلو عورت کی طرح
ان میں مصروف نظر آتیں۔

انہیں گھر میں جوان خوبصورت بھوے ہوتے ہوئے مرد ملازموں کا دندناتا پھرتا
سخت گراں گزرتا۔ لیکن بیچور تھیں۔ بھو جس طرح کی لے آتی تھیں وہاں اینٹیں اسبل ہی
نو کروں گی، تعداد اور زیورات کی مقدار بھی۔ لیکن وہ چپ رہیں۔ بھائی جان بھی چپ تھے
اور وہ دونوں مجھ سے بھی اسی چپ کی توقع رکھ رہے تھے تاکہ گھر کا ماحول سازگار رہے، کسی
قسم کی کوئی بدعمری نہ پیدا ہو۔

لیکن میں..... حاضر ملک بھلا میں چپ رہ سکتا تھا۔ شرمین مجھے یوں بھی قبول نہ تھی
بحیثیت ایک بھابی کے اور جس طرح کے پھر اس نے اختیار کر رکھے تھے وہ مجھے اور بھی
تلملانے دیتے تھے میرا ذہن اس لڑکی کو وہ تعظیم و تکریم دینے سے قاصر تھا جس رشتے کے

حوالے سے وہ یقیناً اس عزت و احترام کی مستحق تھی۔ وہ میرے سامنے آتی، اس کی حیثیت
میرے برابر مل جلادیتا۔ وہ جس کے حسن سے میں محو رہتا تھا اب میرے لیے ایک بے
مکش، بد زبان، ست اور بے حسن عورت بن کے رہ گئی تھی۔
شاید وہ عمر ہی ایسی تھی ہر پرکشش چیز کی جانب دل بٹھکا چلا جاتا تھا۔ ریشم کے
معاملے میں بھی یہی ہوا۔
”ریشم..... شہودی کہہ بہن،

شہود میرا کلاس فیلو، میرا دوست تھا، وہ یہاں دوست چھپا کہ کالج لائف میں کسی بھی
یار باس خوش مزاج نوجوان کے دور دراز دوستوں میں سے ایک ہو کر رہا ہے۔
میرے کمرے کا میوزک سسٹم، کمپیوٹر، دی وی اور کالج میں شہود تو ہی، حبیب، ندیم
اور نجانے کتنے دوست..... یہ سب دل بھلانے اور وقت گزارنے کا ایک بہترین طریقہ
ہے۔

ایسے ہی کسی روز میں شہود کو اس کے گھر ڈراپ کرنے گیا۔ وہ ایک مڈل کلاس فمیلی
سے تعلق رکھتا ہے اس کا اندازہ تو مجھے تھا مگر اتنی زیادہ زبوں حالی کا میں نے تصور نہ کیا
تھا، گرمی شاہو کے اندر کہیں جا کے وہ مگھان آواؤ سناٹک جیس زرد گھوٹ والا گندہ سامعہ
تھا۔ جس میں اس کا ڈھاتی سر لے کر دو منزلہ مکان تھا۔ بھلی منزل پہ سینٹ کا لپ تھا لیکن
اوپری منزل پر بنے دو کک بنا کر لے اس تکلف سے بھی پاک تھے، سرخ اینٹیں دور سے
ہی تعمیر شدہ ہونے کا اشارہ دیتی تھیں میں سخت بدعمرہ سا ہو گیا۔

اس کے لاکھ اصرار کے باوجود میں نے اندر آ کے چائے پینے کی ہامی نہ بھری۔ میں
نے ساری زندگی کسی کے جذبات و احساسات کی پروا نہ کی تھی کیا کرتا۔ اس لیے
اپنے چہرے کے ناگوار تاثرات چھپانے کی ذرہ برابر کوشش نہ کرتے ہوئے میں گاڑی
ریوس کرنے لگا جس کی ایک پہ چنواہہ ٹنگے کالے پہلے مرمل سے بچے چوہنگ کی طرح
چپکے ہوئے تھے میں نے سر باہر نکال کر انہیں چند بھاری گالیوں سے نوازا چاہا کہ شہود کے
مکان کے سال خوردہ سبز قاشی والے لکڑی کے دروازے سے ایک نسوانی وجود کو جھانکتے
دیکھا۔ مکیموں سے بھرے تاریخی بوسیدہ پردے کو ذرا سا سر کا وہ کم سن، اٹھارہ سینہ بڑے
اشتیاق سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ (شاید یہ میری خوش فہمی ہو اور اس کی دلچسپی اور اشتیاق
کا مرکز میری نئی چم چم کرتی ہڈا اس کو جو بھائی جان نے مجھے چھلے مینے ہی لے کر دی
تھی)

کسی دوشیزہ کا میری طرف متوجہ ہونا میرے لیے نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات تو شاید

”آپ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ سانولی سلونی نمکین سی لڑکی نے بے باک سا قہقہہ لگاتے ہوئے اضافہ کیا۔

”اور یہ عشرت.... اسے پیار سے ایش کہا جاتا ہے۔“

میں نے بیک و بومر سے اس مہاسوں پھرے پھرے والی لمبے قد کی دہلی پتلی لڑکی کو ناقد انداز میں دیکھا۔ ”جوائش“ کا خطاب پائے خود کو ایوٹور یہ رائے ہی تو سمجھ بیٹھی تھی حالانکہ وہ جی جی ایش۔“ قہقہہ، ہنسی ہوئی اراکھ۔

”یہ پروین.... اسے سب پری کہتے ہیں۔“

فرخنی مائل ٹھٹھکے سے قد اور بیٹھے بیٹھے نقوش والی اس لڑکی کو دیکھ کے میں نے ان پری کہنے والوں کی عقل پہ ماتم کیا۔

”اور ایش! ساشا، یہ شہود بھائی کے کلوز فرینڈ عاشق ہیں۔“

اس کے باوجود انداز یہ میں نے بے ساختہ اس کی جانب دیکھا وہ مجھ پہ نظریں گاڑے مسکرا رہی تھی، ایسی مسکراہٹ جس میں صرف لب ہی نہیں مسکراتے، پورا جسم مسکرا اٹھتا ہے گنگنا اٹھتا ہے اور اس کی عمر کی گنگناہٹ نے وقتی طور پہ میرے حواس قفل کر دیے۔

”اور مجھے تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔“ اس کے دھوک پہ میں شرمندہ سا ہو گیا میری خاموشی بھانپ کے اس نے خود ہی بتایا۔

”شہود کی چھوٹی بہن.... ریشم۔“

”آپ کو تو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہوگی، صرف ”ریشم“ کہہ دینا ہی کافی ہے۔“ میرے ریمارکس پہ وہ کھٹکھٹا اٹھی۔ اس سے میری یہ پہلی ملاقات آئندہ ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، مجھے اس کی دیدہ بولی کی حیرت ہوئی تھی کیسے وہ بھائی کے دوست کے ساتھ شہر چھری خاک چھانا کرتی اس کی دوستیں اکثر و بیشتر اس کے ہمراہ ہوتیں مجھے کچھ یوں سی ساشک ہوا کہ ہونہ وہ وہی ان کے ساتھ ہوتی ہوگی جب وہ..... لیکن پھر میں سر جھٹک کے ان خیالات سے خود کو آزاد کر لیتا۔

”میری بلا سے جہاں مرضی خوار ہوتی پھرے۔“ مجھے کون سے اسے دل کے سنگھاس پہ بٹھانا ہے۔ وہ تو عادی لگ رہی ہے ان تفریحات اور عیاشیوں کی۔ جب اس کے بھائی کو نہ خبر ہے نہ فکر تو میں کون ہوتا ہوں سوچنے والا۔“

میں واقعی سنجیدہ نہ تھا اور یقیناً وہ بھی نہ تھی۔ وہ کس قماش کی لڑکی تھی۔ اس کا اندازہ تو مجھے اس سے پہلی ملاقات میں ہی ہو گیا تھا، کاج نام میں یونیفارم میں ملیوں، میک اپ

اس پسماندہ ترین محلے کے بدبودار مکان میں اس لڑکی کا ہونا تھا جو حیرت انگیز طور پر دلکش تھی۔

☆☆☆

فورٹریس اسٹیڈیم میں صنعتی نمائش ہو رہی تھی۔ بھائی جان نے ہماری کمپنی کی مصنوعات کے لیے ایک خاصا بڑا اسٹال خریدا تھا اس دن انہوں نے مجھے آرڈر دیا کہ میں کانج جانے سے پہلے ایک چکر وہاں کا لگا جاؤں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے اس اسٹال کی آرائش کا کام ان کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔

عابد جمید روڈ سے میں نے ٹرن لیا ہی تھا کہ ”برائٹ فوجر اکیڈمی“ کے آگے کھڑی چند لڑکیوں کو لفٹ کا اشارہ کرتے دیکھا۔ اگرچہ ان کا سفید یونیفارم، کاندھوں سے لٹکے بیگ اور سینے سے لگی فائلز انہیں اسٹوڈنٹس ظاہر کر رہی تھیں۔ لیکن اس طرح لفٹ مانگنے والی عورتوں کو ظاہر ہے بد نظیر ہی سمجھا جاتا ہے میں نے بھی یہی رائے قائم کی۔

”جان بوجھ کر بھی یہ طالبات والا حلیہ اختیار کر لیتی ہیں۔ تاکہ پولیس تنگ نہ کرے۔“

میں نے سوچا۔ قریب سے گزرتے ہوئے میری سرسری سی نظر دائیں جانب اٹھی۔ اور میں چونک اٹھا۔ سفید شلوار قمیص میں وہ سیاہ چنگدار بالوں کی دو چوٹیاں کیے ماتھے پہ چند لٹیں بکھرے ہوئے بلکے بلکے میک اپ اور مسکراتے لیوں کے ساتھ وہ سی عمر حسن کی لڑکی تھی جو میں نے اس دن شہود کے دروازے پہ دیکھی تھی۔

بلا ارادہ ہی میرے جبر بریک پہ جا پڑے اور کارایک چرچاہٹ کے ساتھ ان سے دوفٹ آگے روک گئی۔

ان چاروں لڑکیوں نے یکدم ہلکا کر دی۔ میں ہڑبڑا کے ان تینوں کو پیچھے گھستے دیکھ رہا تھا کہ میرے برابر کار دروازہ کھٹ سے بند ہوا۔ کوئی میں بیک رکھے۔ نچر دلی انگلیوں والے گلابی ہاتھ سے بال سنواری وہ میرے برابر بیٹھی مجھے مسکرا کر ہیلو کہہ رہی تھی۔

مڈل کلاس سے وابستہ ان لڑکیوں کی بے باکی، تنگی، بلکہ دیدہ دلیری واقعی قابل حیرت تھی۔

”اور... یہ....“ میں نے کن ہلکیوں سے اپنے برابر بیٹھی اسے دیکھا جو تعارف کا مرحلہ چھڑا رہی تھی۔

کے ہوئے ناز و ادا کے جلوے بکھیرتی کوئی العزول کی اگر سرکوں پہ کھڑی لفٹ باگنی نظر آئے تو آپ اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے تو قائم نہیں کر سکتے ناں۔

گھر کے وہی حالات تھے، فرق صرف یہ پڑا تھا کہ گھر کے روکھے پھیکے تھے ہوئے ماحول میں فہد کی ننھی ننھی قلقلاریاں گونجنے لگیں۔ ماں کے مرتبے پہ فائز ہو کے بھی شرمین کی فطرت میں شہراؤ پیدا نہ ہوا۔ گھر سے عدم دلچسپی، شوہر سے بے زاری اور گھر کے گھٹے ماحول (بقول اس کے) سے نفرت جون کی توں تھی۔ اب ایک ننھا سا بچہ اس کی لاپرواہیوں کا شکار ہونے کے لیے موجود تھا۔

☆☆☆

فہد چار ماہ کا تھا جب اس کے عقیقے کی تقریب منعقد ہوئی اور میں نے چیدہ چیدہ دوستوں کو انوائٹ کیا۔ چونکہ یہ گھر بلوغت کی تقریب تھی اس لیے میں نے انہیں ٹیلیز کے ساتھ مدعو کیا۔ شو کو بھی ”دو چلی“ ہی بلایا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ اپنی حرکت کی سنگینی کا اندازہ مجھے تب ہوا جب وہ ج بن کے اس فنکشن میں موجود تھی۔ وہ دیوانہ وار میرے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ اسے نہ اپنی ماں کی فکر تھی، نہ بھائی کا دھیان تھا۔ اسی التفات کا مظاہرہ وہ امی جان سے بھی کر رہی تھی۔ ”آئی جی، آئی جی“ کرتی وہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ اتنی سرگرم عمل تو میری کزنز تک نہ تھیں وہ جان بوجھ کر اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلانی لگی۔ فنکشن کے دوران ہی میرے عزیز و اقارب میں چہ میگوئی شروع ہو گئی۔ شرمین بھی کڑی نظروں سے اس کے تئیر بھانپ رہی تھی۔ بھائی جان بھی ایک دوبار اشاروں اشاروں میں اس کے بارے میں استفسار کر چکے تھے، وہ جتنی بار بھی میرے قریب ٹا رہو جانے کے انداز میں آئی۔ مجھے اپنے بے تکلف کزنز اور دوستوں کی چھیڑ چھا کر نشانہ بننا پڑا۔ یہ صورت حال میری برداشت سے باہر تھی۔ اس کا مجھ سے تعلق ایسا ہی تھا جیسا میرا اس سے، دونوں جانب ہی کوئی جذباتی وابستگی موجود نہ تھی۔ مجھے مخالف صنف کی کشش نے باندھ رکھا تھا تو وہ حسرتوں اور محرومیوں کے سائے میں بلے کے بڑی ہونے والی اچھی تربیت سے بیکر محروم ایک سطحی لڑکی تھی۔ جسے صرف میرے ساتھ گاڑی میں پھرنا، ہوٹلنگ کرنا پسند تھا یا کسی بھکاری کے پھلے پھینکے افس جیسے پل اسٹک، کیسٹ، ریڈی میڈ سوٹ، چاکلیٹ وغیرہ۔ میری میری طرح اور کتنے اسے نواز چکے ہوں گے۔ میں نے تو اس بارے میں سوچنا تک کسی گوارا نہ کیا تھا۔ لیکن ان میں اور مجھ میں ایک فرق تو یہ تھا کہ وہ بھی ان کے گھر تک نہیں پہنچ سکی ہوگی اور نہ ہی، بھی اس نے جانے کا خواب ہی دیکھا ہوگا لیکن شہد کی وجہ سے میں نے از خود

اسے اپنے گھر آئے، اپنی فیملی سے متعارف ہونے کا ایک شاندار موقع فراہم کر دیا۔ اس نے اس تقریب میں میری امی جان سے قریب تر ہونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے ہی روز وہ مجھ سے رشتہ کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھیں۔

”خدا کا واسطہ ہے امی! اسے طور پہ اندازے لگانے کی کوشش مت کیجئے۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ شو میرا دوست ہے اور وہ بس اس کی بہن، میں اسے ٹھیک طرح سے جانتا تک نہیں۔“

”لگتا تو نہیں وہ تو تم سے خاصی فریک لگ رہی تھی۔ بلکہ ہم سب کو ایسا لگا کہ تم نے اسے بطور خاص، ہم سب سے ملوانے کے لیے بلایا ہے۔“

”واٹ ریش۔“ بھائی جان کے کہنے پہ میں پھٹخٹا اٹھا۔ ”کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے بلاوجہ دوسروں کے سر پہ سوار رہنے کی یا ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی جھاڑنے کی۔“

”خیر جو بھی ہے، مجھے تو وہ بچی اچھی لگی۔“ امی نے سادگی سے بحث سمیٹنے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ فلنڈری اور خوش مزاجی اس کی عادت ہے تو اور بھی اچھی بات ہے اگر تم نے پہلے ایسا نہیں سوچا تو چلو اب سوچ لو۔“

”آپ سب کو ہو کیا گیا ہے۔“ میں جاننے سے قاصر تھا وہ سب یوں اس کے دیوانے کیوں ہو رہے تھے وہ واقعی خطرناک حد تک ذرا مہ باز لڑکی تھی۔

”پہلے تم بتاؤ، تمہیں کیا ہوا ہے۔ بلاوجہ اتنے کیوں چڑھے ہو۔ کہیں یہ چور کی داڑھی میں تنکا والی بات تو نہیں۔“ باقر بھائی جان نے چھیڑا۔ میں اپنے کلین شیو چہرے پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اب تک خاموشی سے بیٹھی فیشن بیگزین کا جائزہ لیتی شرمین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”میرے خیال میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ کم آن عاشر، ماں اب بھی جاؤ کہ وہ تمہارے دوست کی بہن نہیں۔ بلکہ وہ شوہر تمہاری دوست کا بھائی ہے۔ یہاں کون سا ظالم سامانہ میں حائل ہے جو تم جھجک رہے ہو۔“

”تم سچ میں مت بولو۔“ میں پہلے ہی چھلایا ہوا تھا۔ اس کی دخل اندازی نے مجھے حلق تک لڑا کر دیا۔ باقر بھائی جان ہمیشہ کی طرح میری بدتمیزی پہ تئیر یوں چڑھا کہ رہ گئے۔ میری اس کے ساتھ بدتمیزی سے ان کا موڈ ہمیشہ خراب ہو جاتا تھا۔

”کیوں..... کیوں نہ بولوں۔ باقر آپ مجھ سے گلہ کرتے ہیں کہ میں سب کے

درمیان نہیں بیٹھتی، ہنسی بولتی نہیں ہوں۔ امی کو بھی یہی شکایت رہتی ہے کہ میں ڈیڑھ سال کے عرصے میں مکمل لٹ نہیں سکی، تو بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ساری بات آپ کے سامنے ہے۔ ایسا کیا پرتل معاملہ دیکھس ہو رہا تھا۔ جس میں دخل اندازی کا مجھے حق نہیں، یامیں نے اسی کوئی سی عیوب بات کہہ دی جو عاشر بھڑک کے مجھے خاموش کر رہا ہے۔ میرا ہی دماغ خراب ہے جو یہاں چلی آئی ہوں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہی ٹھیک ہوں۔ مجھ سے اب گلہ مت کرنا، الگ تھلگ رہنے کا۔ میرے سب سے کٹ کے رہنے کی وجہ عاشر ہی ہے۔ یہ کب چاہتا ہے کہ.....“

حسب عادت لہا سا ہنجر جھڑنے کے بعد وہ ٹسوے بھانے لگی۔ امی کے پاس سوئے ہوئے فہد کو اس نے اٹھایا اور اپنے کمرے میں جانے لگی۔ بھائی جان بھاری شکل بنا کے امی جان کو مدد طلب لگا ہوں سے دیکھنے لگے۔ یہ ڈرامے تو اکثر و بیشتر ہوا کرتے تھے لیکن آج یہ سین ہونے پہ میں نے شکر کا سانس لیا کہ کم از کم شرمین کے غیظ و غضب کے آگے بند باندھنے میں مصروف امی جان وہ تکلف دہ ذکر تو بھول جائیں گی اور یہی ہوا کسی ریشم، کہاں کی ریشم..... وہ سب بھول بھال شرمین کو پکڑ کے بٹھانے لگیں۔

میں نے اپنی ماں کو ہمدردی سے دیکھا، ایک ہی بھونے ان کے سارے دم ختم کا خاتمہ کر دیا تھا اور وہ دوسری لانے کے پتھر میں ہیں..... اور وہ بھی ریشم جیسی پناہ..... خیر امی جان بھی کیا کرتیں، ریشم کا جو روہ تھا قہل رات کوئی بھی غلطی کا شکار ہو سکتا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت تھی۔ حسین تھی اور معصوم۔ ”نظر“ تھی۔ امی اس میں کوئی شک نہیں لیکن میں انہیں کیا بتاتا کہ ہر خوبصورت نظر آنے والی چیز ”اچھی“ نہیں ہوتی اور اگر وہ پوچھ لیتیں کہ وہ ”اچھی“ کیوں نہیں تو میں کس منہ سے انہیں اس کے کرتوتوں سے آگاہ کرتا۔ جب وہ مجھ سے ملی تو اس کے کھلے ڈالے انداز، بے باکی اور بے تکلفی نے مجھے بار کرادیا تھا کہ میں اس کا پہلا شکار نہیں۔

ریشم سے چھ سات ملاقاتوں کے بعد ہی جب اس کا حسن بے کشتی سا لگنے لگا تھا، میرا اپنا دل مجھے ہزار صلواتیں سنا رہا تھا اس قدر بددوئی کا مظاہرہ کرنے پر۔

”شرمین سے، کیوں اتنا سیدھا سوچتی ہو۔ یہ عاشر تو ہے ہی بڑ بولا۔ تمہیں کیا آج پتا چلا ہے، بچپن سے اسے جانتی ہو پھر بھی اس کی اوگی ہوگی باتیں دل سے لگتی ہیں۔ بھلا تم کیوں کمرے میں بند ہونے لگیں۔ تم تو میرے گھر کی پہلی پہلی روٹی ہو۔ تمہیں کیا میں کمرے میں بند رکھنے کے لیے لائی ہوں، میرے گھر کی خوش، میرے آٹکھن کا اجالا۔“

امی جان نے ستر کی دہائی میں بننے والی اردو فلموں میں بولے جانے والے

سارے ڈائلاگ اس بے حس اور اکھڑ لڑکی پہ لٹا دیے۔

”میں کوئی شو نہیں ہوں، ڈیکوریشن کی چیز ہوں، جسے آپ کو نے میں کھڑا کر کے روشنیاں نکھیریں گے۔ جہاں میری زبان بندی کے حکم ہوں وہاں جیسے کا کیا فائدہ، آپ کو تو ڈی چاہیے۔ اے آئیں وہی۔ اس کے دوست کی بہن۔ غریب خراب، بچی آبادی کے رہنے والی..... شمیم و مسکین سی لڑکی، شادی سے پہلے بھی آپ کے پیر وھو دھو کے پی رہی تھی۔“

ایسی ہی کثیر نما بھولانی تھی تو بڑے بیٹے کے لیے بھی کسی کچی آبادی سے چھائی کی ہوئی یادار الامان سے تنقید کی ہوئی۔ میں اپنے ماما پاپا کی لاڈوں پٹی ہوں، صاحب جانا یاد ہوں۔ میری بیک بھی مضبوط ہے اور بیک کراؤنڈ بھی..... کسی سے دب کے وہ رہیں جن کی چیزیں کمزور ہوں۔“

نچانے ایسی باتیں وہ کہاں سے سیکھ کے آتی تھی، جو سر سے پیر تک سلگ کے رکھ دیتیں۔ مجھے بھی یکدم آگ لگ گئی۔

”بھائی جان! اگر اس گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں دیکھنا چاہتے تو خدا کا واسطہ ہے اس ”لاڈوں پٹی“ اور ”صاحب جاناڈ“ کو اپنے کمرے میں لے جائیں، ورنہ..... مزید اپنی ماں کے بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”عاشر! اپنی ماں کے بے عزتی میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس ساری بوجھن کے ذمہ دار تم ہو۔ صرف تم، ہمیشہ تہمازی وجہ سے ہی گھر کا ماحول خراب ہوتا ہے۔“

”کیا.....؟ میری وجہ سے؟ میں اس گھر میں پچھلے تیس سال سے موجود ہوں اور ماحول کب سے خراب ہونا شروع ہوا ہے اس کے بارے میں آپ بہتر جانتے ہوں گے۔“ مجھے ان کا بیوی کے سامنے ڈانٹا پسند نہ آیا۔

”دیکھا آپ نے، یہ تو سونڈوں پہ بھاری ہے، ایسے تاک تاک کے طنز کرتا ہے۔“

”تم چپ رہو شرمین! بات بوھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ باقر بھائی نے اسے جھڑکنے کی ہمت کی وہ فوراً بھڑک اٹھی۔

”اپنی امی اور بھائی کے سامنے مجھ پر رعب جمانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں نصف صدی پہلے کے سڑے ہوئے سماجی ناول کی ہیروئن نہیں اور اپنے رعب و جلال کا مظاہرہ کرنے کا شوق ہو تو پھر بیویاں بھی ویسی پسند کرنی چاہئیں جیسے کہ آپ کے بھائی نے کی ہے۔“ وہ گھوم پھر کے پھر سے وہیں آگئی۔ ”ایسی فقیریاں جونی تلے دب کے رہتی

ہوں گی۔ مجھ سے اونچی آواز میں بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ وہ فن کرتی جانے کو تھی کہ میں نے آواز دی۔ اُمی کے باز رہنے کے اشارے کو میں خاطر میں نہ لایا۔
”ایک منٹ شرمین پہلے تو میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دوں کہ رشتم سے میرا کسی قسم کا کوئی تعلق ہے۔

ایسی کوئی بات ہے اور نہ ہونے کا امکان ہے، میرا ذوق اتنا گھٹیا نہیں، نہ ہی معیار اتنا گرا ہوا ہے۔ تم اپنا یہ نام نہاد فیملی بیک گراؤنڈ برائے نام ہی جائیداد، اور گھسا چٹا حسن جمال سنہال کے رکھو۔ جس فیملی بیک گراؤنڈ کا حوالہ تم دے رہی ہو، شاید یہ بھول رہی ہو کہ میری ماں بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ظاہری کشش کے علاوہ تم میں سے ہی کیا۔ میری پسند آتی جی نہیں، تم کیا زمانہ دیکھے گا کہ عاشق ملک کی شریک حیات ہر لحاظ سے بے مثال ہوگی۔“

میں نے چپقلچ کیا وہ سچ دیتی اندر چلی گئی۔

”حد کرتے ہو عاشر! واقعی عورتوں کی طرح لڑنے بیٹھ جاتے ہو۔“ امی جان نے بے چارگی سے کہا۔

☆☆☆

دو تین سال اور اُن گھستے سرکتے گزر گئے۔ میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ بھائی جان نے مجھے آفس جوائن کرنے کو کہا تو میں نے بغیر سوچے سمجھے انکار کر دیا۔

اگلے چند ماہ تک میں جاب کی تلاش میں مصروف رہا، میں نے گھر پہ وقت گزارنا اور بھی کم کر دیا۔ تنہا دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ شرمین نے مجھ سے اُلجھے اُلجھے اور امی جان کو تنگ کرتے کرتے اب ہند کے ساتھ بھی وہی سلوک شروع کر دیا۔ وہ تنہا سا بچہ، مضی اور اکھڑ ماں کے رویے کی بھیئت چڑھنے لگا۔ وہ نہ تو اسے امی کے پاس زیادہ

رہنے دیتی اور نہ ہی خود مناسب توجہ دیتی۔ اس کی ضد اس کے لیے کوئس رکھوانے کی تھی۔ جب کہ بھائی جان بھی امی جان کی طرح مخالف تھے، ان کے خیال میں اگر شرمین کو اس ذرا سی ذمہ داری سے بھی آزاد کر دیا گیا تو وہ گھر میں اتنی بھی دیکھیں نہ لے گی۔ جتنی کہ اب

بیٹے کی وجہ سے لینے پر مجبور ہے۔ حالانکہ میں ان کی غلط فہمی تھی۔ فہم تقریباً اسی طرح چل رہا تھا جیسے کہ عمو بائن ماں کے بچے پلا کر تے ہیں۔

پہلے ایک ڈیڑھ سال تک امی جان نے ہی اس کی ساری ذمہ داریاں پوری کیں، اسے نہلانا، دھلانا کھلانا، پلانا، نہلانا، پھر چاچا کے بجائے کیا خیال آیا کہ وہ اب اسے کم سے کم وادی کے پاس چھوڑنے لگی، دو سال کی عمر میں اس نے بھائی جان سے

لڑ بھگڑ کے اسے ڈے کیئر سنٹر میں ڈال دیا۔ اب وہ بچے گروپ میں تھا اور توپلی زبان میں اسے سی کی اور دن ٹوکے رہنے لگیا کرتا۔ رات کو بھائی جان کے گھر ہونے کی وجہ سے وہ بیچارہ بھی اپنے کھلونوں سے اُنے پڑے کمرے سے آزاد ہوتا۔

میں ایک گھنٹہ اس سے کھیل کر، باتیں کر کے گزارا کرتا ہوں۔ اب گھر میں خصوصاً شرمین کے ساتھ میری منہ ماری کم ہوتا شروع ہو گئی۔ یہ شوق اب وہ شوہر کے ساتھ پورے کیا کرتی۔ باقر بھائی جان بھی شاید ہی تو بلی دہن کے حشر سے آزاد ہو چکے تھے، آئے دن خوب معرکے ہوا کرتے۔ میں مطمئن اسے فہم کو پیٹ پٹھائے لیٹا رہتا۔

جاب تو ابھی تک نہ ملی تھی، فی الحال میرے کرن نوید نے مجھے ایک آفر دی۔ نوید اور میں اب بھی سن تک ایک ساتھ پڑھے، پھر وہ بوئسن یونیورسٹی چلا گیا۔ پچھلے ہی سال وہ واپس آیا۔ میرے تایا جان اور ابو جان کسی زمانے میں مشترکہ برنس کرتے تھے۔ پھر بدلتے وقت کے تقاضوں کے تحت دونوں نے الگ الگ قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور اس

میں خاصے کا مہاب بھی رہے۔ تایا جان کا کاروبار اب ان کے دونوں بڑے بیٹے سنہال کے ساتھ ہے۔ نوید کا مزاج کچھ میری طرح تجرباتی تھا اس نے بڑے بھائیوں کے اندر رہ کر کام کرنے کی بجائے خود کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ تایا جان نے اس کے حصے کا سرمایہ

اسے دے کر خوش دلی سے اجازت دے دی۔ نوید نے مجھے یہ پیش کش کی کہ اگر میں ہوں تو اس کا برنس پارٹنر بن سکتا ہوں مجھے بھی یہ آئیڈیا پسند آیا۔ بھائی جان کی زیر نگرانی کام کرنے کے خیال سے بدک کے میں جاب کرنے کا فیصلہ کر تو بیٹھا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ جاب میرے مزاج کے خلاف ہے۔ نوید کے ساتھ برنس شروع کرنے میں مشکل اس لیے بھی نہ ہوگی کہ تایا جان خود بھائی جان سے میری بات کریں گے اور حصہ مانگنے والا

تنازعہ بھی نہ کھڑا ہوگا۔ یہ کام تیزی سے شروع ہوا میں خاصا برعوض تھا اور نوید بھی ... نوید میری عادت و فطرت سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بات بھی میرے لیے سود مند تھی بلکہ اس کے لیے بھی، وہ جانتا تھا کہ اگر میری ”میں“ کو نہ پھینچا جائے تو میں ٹھیک ٹھاک کام کر سکتا ہوں۔ اس بات کا اس نے خاص خیال رکھا، میں مطمئن تھا۔ گن تھا ... خوش تھا ایک ہی ہندو روٹین انٹرف شروع ہونے جا رہی تھی، گھر کی ٹینشن اب میرے سر پہ کمرے کم سوار

ہوا کرتی۔ میرے مزاج پر بھی اس کا خوشگوار اثر ہوا۔ پہلے جو میں بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا، اب مقابل جی بات سن بھی لیتا تھا اور کچھ بھی لیتا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ امی جان

کے بھی میں اور قریب ہو گیا اور بھائی جان سے جاری سرد جنگ بھی کمزور پڑنے لگی۔
شرمین سے میں نے لافعلی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا بچپنا اور کم چلنی کی توں تھی
اب بھی وہ مجھ سے بلاوجہ الجھنے کی کوشش کرتی رہتی لیکن میری طرف سے کوئی جواب نہ پا
کے بھلا جاتی۔ میں اب بھی اسے دیکھ کر اداسے سن کر خاصی کوفت کا شکار ہوا کرتا لیکن
اب میں نے بقول اس کے زندوں والی طعنہ زنی بند کر دی تھی، بلکہ پہلے پہل اس سے کیے
گئے زبانی کلامی معرکے یاد آتے تو اتنی جذباتیت پہ ہنسی آ جاتی۔

نئے برس کی مصروفیات اپنے عروج پہ تھیں۔ ابھی تک تو ہمارا اسٹاف بھی مکمل نہیں
ہو پایا تھا۔ میں حسب عادت بہتر سے بہترین کی تلاش میں رہتا تھا۔ جیسے ہی کسی ورکر کی
طرف سے بے اطمینانی محسوس کرتا، اخبار میں اشتہار دے دیتا۔ اس دن بھی امیدواروں
کے انٹرویوز لے رہا تھا کہ میری ملاقات اس سے ہوئی۔

”زیٹا سے..... زینٹا مرے.....“

اسے دیکھ کے میں چونک اٹھا۔ حالانکہ اس میں چونکا دینے والی کوئی بات تو نہیں
تھی۔ وہ عام کی نہیں تھی۔ عام کا مطلب معمولی ہی ہوتا ہے ناں، با پھر دیکھی کسی بہت سے
لوگ ہوتے ہیں۔ تو اگر عام کے یہ مطلب نکلتے ہیں تو پھر وہ عام ہرگز نہیں تھی۔
وہ خاص بھی نہ تھی۔ خاص کا مطلب بہت الگ..... بہت منفرد یا پھر سب سے
نمایاں ہوتا ہے ناں۔ تو پھر وہ خاص بھی کیسے ہو سکتی ہے۔

اتھارہ بائی اتھارہ کل کر، باہر کے حدت آمیز ماحول..... تیز تر دھوپ، جان لیوا
گرمی سے محفوظ، اسے سی کی تنگی کی نعمت لگ رہا تھا، فضا میں ایر فریجنز کے ذریعے چیلنگ کی
ہلکی ہلکی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پہ دبیز ڈارک گرے کارپٹ، سفید یواریوں پہ صاف مین
اور کل جی کے نادر اور قیمتی فن پارے آرائش کے سن کو چار چاند لگانے کے ساتھ ساتھ
آفس کے مالک کے علاؤ ذوق اور اونچے بیگ بینس کی بھی نشاندہی کر رہے تھے۔ ایک
جانب بڑا بھاری گرے صوفہ سیٹ جس کی سینئر نیبل پہ پیش قیامت کرشل پوسر پڑے تھے۔
اونچے منشف چھت پہ لگے جدید آرائشی نقشے، ہشتی کی دیوار کے اس طرف بڑی سی آبنوی
نیمبل..... جس کی گلاس ٹاپ پہ فون سیٹ، کمپیوٹر، فائلز پڑی تھیں۔

ایک جانب تایا جان بیٹھے تھے، جو اتفاقاً ہی آج نوید سے ملنے اور آفس کا جائزہ
لینے آئے تھے اور پھر انٹرویو ہوتا دیکھ کے دلچسپی سے وہیں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ہی رشید
صاحب بیٹھے تھے جو موجودہ اسٹاف میں واحد تھے جن میں مکمل تجربہ اور اطمینان رکھتا
تھا۔ وہ انٹرویو میں میری معاونت کر رہے تھے۔ نوید کی سینگٹنگ کے سلسلے میں ہی کی گیا ہوا

تھا۔ میری بیکر ٹری رہیگا لارنس میری دائیں جانب بیٹھی تھی، ایک کے بعد ایک امیدوار آتا
یا آتی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی سب مرعوب سے ہو جاتے۔ ہمارا
برنس ابھی مکمل سیٹ نہیں ہوا تھا، ہماری ساکھ ابھی بنتا پاتی تھی، لیکن میں نے آفس کی جگہ
دعج اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے ایسی کرانچی تھی جیسے یہ ملک کے ٹاپ برنس میں کا ایما پار
ہو۔ سب میری ذاتی تسکین کے لیے تھا اور واقعی میری تسکین ہو بھی رہی تھی۔ جب میں
کسی کو گردن کھٹکا تھا اس کے آرائش کا جائزہ لینے دیکھتا لیکن..... وہ..... اندر آئی۔ بغیر ادھر
’ادھر دیکھے۔ بغیر میرے کہنے کا انتظار کیے کر سی بیٹھنے کے میرے مقابل بیٹھ گئی اور یوں
..... یوں بیٹھ گئی۔ جیسے کھڑ رہی ہو، ہو کیا ہوتا ہے..... میں کیا کہتا، میں سوچنا ہی رہا۔

”آخر کیوں..... کیا بات ہے اس میں۔ کیا وجہ ہے جو میں بار بار الجھ رہا ہوں، چونک
رہا ہوں، کیا کھوج رہا ہوں۔ میری عدم دلچسپی اور کھوئی ہوئی کیفیت کو رشید صاحب نے
میری تنکھن پہ محمول کیا۔ ویسے بھی اب تک میں کوئی بارہ امیدواروں سے اُلٹے سیدھے
سوالات کر چکا تھا۔ وہ خود ہی اس سے انٹرویو کرنے لگے۔ میں اس پوزیشن میں تو نہ تھا کہ
اس سے کچھ پوچھ پاتا لیکن حیرت انگیز طور پر میرا ذہن اس کے لفظ لفظ کو اندر آتا رہا تھا۔
اور میں نے یہ اعتراف کرنے میں دقت نہ لگایا کہ وہ واقعی ذہین اور قائل ہے۔ تایا جان
بھی اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔

”لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ کوئی واحد تو ذہین نہیں ہے۔ ذہانت ہی نہیں۔
کچھ اور بھی ہے اس میں..... کچھ اور..... جو چونکا رہا ہے۔“ میں ابھی انجمن میں گم رہا
اور وہ چلی گئی۔

”میرے خیال میں تو یہ مختصر مدتی سوٹ کرتی ہیں، بلکہ بیٹ ہیں اب جو عاشق کی
راے ہو۔“ رشید صاحب نے بات مجھ پہ چھوڑی۔ میں نے تایا جان کی جانب دیکھا۔
انہوں نے سر ہلایا۔

”میرا تجربہ تو اسی کے حق میں ووٹ دیتا ہے۔“

زینٹا عمری سب کی مختلف چٹاں سن گئی۔ نوید اس سے ملا نہیں تھا لیکن آفس آکر
اس کی سی دی دیکھنے کے بعد اس نے بھی اسی کے حق میں ووٹ دیا۔ اس نے اگلے ہی ہفتے
آفس جوآن کر لیا۔ اتفاق سے وہ جس پوسٹ پہنچی اس کا واسطہ زیادہ تر مجھ سے رہتا اس
طرح پر پیشگی جگہ پہ تو توں میں ہمارے درمیان ایڈر اسٹینڈنگ ہو گئی۔ وہ میرے
کام کی اپروچ کو سمجھنے کی ادراسی کے مطابق اپنی ڈیوٹی دینے لگی۔ لیکن میں ابھی تک سمجھنے
سے قاصر تھا..... وہ ایک بات.....

ایسے گہرے براؤن سیدھے بال بہت سی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ اس کی طرح اور بھی بہت سی لڑکیوں کی آنکھیں سیاہ ہوتی ہوں گی۔ آنکھوں، لبوں اور ناک کی بناوٹ میں بھی کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ مسکراہٹ بھی نہ گدگدانے والی تھی، نہ مونہ لہزا کے جیسی ڈوب کے ابھرنے والی، مدغم آواز میں گھٹٹیوں کا ردھم تھا، نہ آبشاروں کا ترنم..... ایسی کتنی ہی لڑکیاں ہوں گی۔ بہت سے لوگ اس سے زیادہ ذہین، اس سے زیادہ خوش لباس ہوں گے۔ پھر وہ خاص کیسے ہو سکتی ہے۔ منفرد کیسے ہو سکتی ہے۔

لیکن اسے عام بھی نہیں کہا جاسکتا، وہ عام کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی سادہ سی بے ریا آنکھوں کے آئینے کتنے شفاف تھے۔ اس میں کتنا رعب، کتنا تقدس تھا اور ساتھ ہی ساتھ کتنی معصومیت بھی۔ کبھی ایسا لگتا یہ کسی مفکر کی آنکھیں ہیں۔ کبھی یوں لگتا کہ جیسے کسی سادہو کی آنکھیں ہوں، گیان میں ڈوبی ہوئی۔ کبھی لگتا کوئی نوازیدہ بچہ دنیا میں آنے کے بعد اپنی معصوم حیران آنکھیں پوری کھولے نظر میں گھما گھما کے سب طرف دیکھ رہا ہو۔ جیسے ہر چیز اس نے پہلی بار دیکھی ہو۔ یہ حیرانی، یہ گیان، یہ سب عام نہیں تھا۔ بہت خاص تھا۔ بہت خاص۔

اس کے لبوں پہ مسکراہٹ ہر وقت تھی نہیں رہتی تھی۔ لیکن اتنی نایاب بھی نہ تھی۔ اس مسکراہٹ کے اندر کوئی ہمدید نہیں تھا، جسے کھوجنے میں عمریں بیت جائیں، اس مسکراہٹ میں اتنے رنگ نہیں تھے کہ ہر جانب پھول پھل جائیں، اور اس مسکراہٹ میں دل گدگدا دینے والی شوفی بھی نہ تھی کہ ایمان منہا لانا مشکل ہو جائے۔ لیکن اس مسکراہٹ میں ایک عجیب سا اپنا پن ضرور تھا۔ وہ صرف مسکرائی..... ہاں صرف مسکرائی، لیکن ایسا لگتا جیسے کسی بہت اپنے نے، بہت چاہنے والے نے ہاتھ تھام لیا ہو۔ آخر اس کے مسکرانے پہ میں چونک کے اپنا ہاتھ دیکھنے لگتا، مجھے یوں لگتا جیسے کوئی گدا لطف اس کے چھو کر گزرا ہو۔ کب یہ احساس اس دنیا میں کسی اور کی مسکراہٹ سے ہوتا ہے..... نہیں نا..... تو پھر یہ نیم عام کیسے ہو سکتا تھا۔

مجھے احساس ہی نہ رہا کہ اس طرح کسی دوسرے کے بارے میں بے مکان سوچے چلے جاتا تو کبھی میری عادت نہیں رہا۔ مجھے تو صرف خود پر توجہ دینے کی عادت تھی۔ میں تو صرف خود کو سوچتا تھا۔ زینا عمر رفتہ رفتہ میرے حواس پہ سوار ہوئی۔ پہلے پھل میں نے خود سے مونیق دیا، اپنے ذہن اور دل دونوں کو بالکل بے دست دیا کہ اس کے سامنے رکھ چھوڑا اور جب وہ پوری طرح مجھ پہ، میری سوچوں پہ حاوی ہو گئی تو اب مجھے مزاحمت

کرنے کا خیال آیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میرے دل نے اسے ”خاص“ تسلیم کر لیا تھا اور اب دماغ کی کسی تاویل کو وہ خاطر میں لانے پہ تیار نہ تھا۔

☆☆☆

”عاشق! آپ یہ اماؤنٹ چیک کر لیں۔ اگر ٹھیک ہے تو میں بل ”راوی اینڈ کمپنی“ کے لیے تیار کروا دیتی ہوں۔“

زینا نے میرے سامنے فائل رکھتے ہوئے کہا۔ ہمارے آفس میں باس، میڈم اور سر والا کوئی تکلف نہ تھا۔ دوستانہ ماحول میں کام ہوتا تھا۔

”اگر تم نے چیک کر لیا ہے تو ٹھیک ہے۔“ میں نے سائن کر دیے، وہ جانے لگی تو میں نے آواز دی۔

”زینا! میں بیچ کے لیے جا رہا ہوں، کہا تم میرے ساتھ چلو گی۔“

مجھے اکیلے جانے میں ہمیشہ آکسی آتی تھی۔ حالانکہ اسی روڈ پہ بہت سے ریسٹورنٹ تھے کہیں دور نہ جانا پڑتا لیکن توجہ نہ ہوتا تو میں یہیں آفس میں چائے یا کولڈ ڈرنکس کے ساتھ سینڈوچز منگوا لیتا۔ جو مجھے ذرا بھی پسند نہ تھے لیکن مجبوراً اور آج تو میں ناشتا بھی ڈھنگ سے نہ لے پایا تھا۔ اس لیے بیچ پھر پور لینا چاہتا تھا، ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آفس میں چلی آئی اور میں بے ارادہ ہی اس سے پوچھ بیٹھا۔ اس نے بغیر کسی تذبذب میں پڑے، بنا کسی تردد اور ہچکچاہٹ کے فوری جواب دیا۔

”ہی۔۔۔۔۔“

”کیوں.....؟“ میری تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ چاہتی تو کہہ سکتی تھی کہ مجھے یہ سب پسند نہیں..... آپ سے میرا رشتہ اس آفس تک ہے..... میں ہونگ کرنا اچھا نہیں سمجھتی۔ میری فیملی کنزرویٹو ہے۔ میں ایسی لڑکی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور ان متوقع اعتراضات کے جواب بھی میرے پاس تیار پڑے تھے۔

”میں کون سا آفس سے باہر رشتہ جوڑنے جا رہا ہوں۔ کو لیگ کی حیثیت سے ہی ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

”جب آفس میں مردوں کے ساتھ جاب کرنے میں برائی نہیں تو ہونگ کرنا ہونگ کرنے کیا برائی ہے۔“

”تمہاری فیملی کو تمہارے گھر سے نکل کے کمانے پر اعتراض نہیں تو پھر کیسی کنزرویٹو ہے۔“

”میں بھی کوئی ایسا ویسا انسان نہیں۔“ وغیرہ وغیرہ لیکن اس نے اپنی مخصوص

مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ پوچھا۔
 ”کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے۔ لُچ کے لیے۔“ میں ہلکا ہلکا سا ہوکے اپنا موبائل اٹھاتا ہوا اس کے ساتھ ہویا۔ مجھے اپنے سوالوں کا جواب بس ملنے ہی والا تھا اگر وہ بغیر کسی سوال کے میرے ساتھ چل پڑتی تو عام سی لڑکی کہلاتی..... اگر وہ سب اعتراضات دہرائی جن کی مجھے توقع تھی تو..... تو عام تو..... لیکن اس نے مجھے لُچ کی آفر کی تو اس کا مطلب ہے کہ وہ..... لیکن کیا واقعی اس سے اس کا خاص ہونا ثابت ہوتا ہے میں یقینی سے کچھ کہہ نہ سکا۔

اور تب میں حیران رہ گیا جب وہ مجھے لیے کاسن روم کی طرف چلی آئی۔ لُچ آور شروع ہو چکا تھا۔ اسلاف لمبی سی ٹیبل کے گرد اپنے لُچ باکسز کھولنے کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ گھر سے لائے تھے۔ کچھ نے آرزو دے کے منگوائے تھے۔ میں فوری طور پر کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔
 ”آج عاشر ہمارے کیسٹ ہیں۔“

سب نے تالیاں بجا کے میرا تجربہ مقدم کیا۔ میں بغیر کچھ کہے ایک چیز گھٹیت کے بیڑہ گیا۔ سب سے پہلے زینا نے اپنا لُچ باکس کھول کے میرے سامنے کیا۔ ٹیبل ٹیچن میں نیچے کے پراٹھے لینے ہوئے تھے۔ ٹیس سرور نے اپنے چکن سینڈویچ پیش کیے، سبز چلی نے بریانی۔ میں تھیک پو پھتا سب چکھتا رہا۔ زینا اور باقی سب لوگوں کی طرح بے تکلفی سے ہر باکس میں سے شیز کر رہی تھی۔ میں نے پراٹھے کا قہر توڑتے ہوئے اسے دیکھا۔

☆☆☆

آج میں معمول سے کچھ جلدی گھر آیا تھا، لاؤنچ خالی سناں پڑا تھا۔ میں نے ذرا دھیان دیا۔ ڈانگ ٹیبل پہ لگا کھانا بھی چوں کا تو پڑا تھا، بلکہ ایک دو بیٹوں میں تو سائن نکال بھی گیا تھا، میں حیران ہوتا آگے بڑھا، میز جھوں کے قریب کالج کی پلیٹ ٹوٹی پڑی تھی۔ میں سمجھ گیا، ہونہ ہوش زمین سے کوئی ہنگامہ کیا ہوگا۔ جب تک باقر بھائی جان اس کے آنسوؤں سے گھبراتے رہے وہ صرف رو پیٹ کر کام چلاتی رہی۔ لیکن جب ٹسوے بہانا بے کار جانے لگا تو اب رفتہ رفتہ وہ جاہل عورتوں کی طرح کھٹے کھٹے اور دنگ فساد برپا کرنے پر اتر آئی تھی۔ بلکہ جاہل عورتوں کی طرح کیا..... وہ خود بھی تو جاہل ہی تھی۔ صرف میٹرک پاس..... انڈر اسٹرا اور ویں جماعتیں بھی اس نے کیسے پاس کی تھیں یہ میں بھی جانتا تھا۔

ادھر ادھر دیکھتا میں فکر مندی سے امی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ایسا کبھی

نہ ہوا تھا کہ انہوں نے کھانا یوں پڑا رہے دیا ہو۔

امی جان بستر پہ دونوں ہاتھوں سے سر تھپتے بیٹھی تھیں۔

میری آواز پہ انہوں نے نظر اٹھا کے دیکھا، ان کی آنکھیں متورم اور بے حد سرنخ ہو رہی تھیں۔ گنگن تھا جیسے گھنٹوں روتی رہی ہوں۔

”کچھ نہیں، بس ذرا سر پکرا رہا ہے، کپشوں میں بھی شدید درد ہے۔“ میرے استفسار پہ کہنے لگیں۔

”اور اس سر پکرنے کی وجہ کیا ہے، وہ بھی جانتا ہوں، پلیمز ای! آخر کتنی بار آپ کو بتانا پڑے گا کہ خود کو ان لڑائی جھگڑوں سے الگ رکھا کیجئے۔ یہ دونوں ہرگز نہیں سدھرنے والے۔ وہ محض لڑ جھگڑ کے بہانے سے ہفتہ ہفتہ میکر رہنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں خوب تفریح اور مزے کر کے موڈ ٹھیک کیے جاتے ہیں۔ ادھر ہمارے بھائی صاحب کو موقع مل جاتا ہے ذرا کھل کے سانس لینے کا۔ وہ بھی جی بھر کے اس وقتی آزادی کو انجوائے کرتے ہیں اور جب بچے کی یاد سنا لگتی ہے۔ تو ناک رگڑتے سرال جاتے ہیں۔ بیوی کو مٹانے کے لیے جڑاوں لاکھوں شاپنگ یہ اڑائے جاتے ہیں۔ یہ ہر مہینے بعد ہونے والا ڈرامہ ہے، لیکن آپ ہیں کہ اپنا حشر کر لیتی ہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت بھی آپ کا بلڈ پریشر اشتباہ رہے گا باقی ہوگا چلیں آٹھیں ڈاکٹر کے پاس۔“

”نہیں بس ٹھیک ہوں، دوا لی ہے میں نے۔“

”اور بھائی جان خود کہاں ہیں؟“ میں نے شرمین کے بارے میں پوچھنا گوارا نہ کیا کہ ہر بڑے جھگڑے کے بعد وہ گھر سے بچے سمیت نکلنے میں دیر نہیں لگتی تھی۔

”کہاں ہوگا بے نصیب، بنگ آ کے نکل گیا۔ بیچارہ اتنی کوشش کرتا ہے اسے خوش رکھنے کی مگر..... یہ لڑکی نہ پیار سمجھتی ہے، نہ ڈانٹ۔ بنگ آ کے کئی بار کہہ چکی ہوں الگ رہنا چاہتی ہے تو بے شک ہو جاوے گا۔ لیکن باقر کہتا ہے یہ بات بھی نہیں، اسے تو خود بیوی کا علاج نہیں سمجھ رہا۔“ انہوں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”بس امی! رہنے دیجئے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔

”میں سب جانتا ہوں جو وقت بیوی کو رشتوں کی پیچان کرانے اور ذمہ داریوں سے روشناس کرانے کا تھا، وہ وقت بھائی جان نے دہن کے لاڈ اٹھانے میں گزار دیا۔ اب جب اپنی سمن مانی کرنے اور بیہودہ گوئی کی اس کی عادتیں پختہ ہو چکی ہیں، وہ بیوی کو سدھارنے چلے ہیں۔ اب تو صرف جنگیں ہی ہو سکتی ہیں، چلیں چھوڑیں، یہ سب باتیں.....“

”کیسے چھوڑ دوں، بیٹا تو وہ میرا ہی ہے، شرمین بھی غیر تو نہیں اور سب سے بڑھ کے فہد، وہ اب بڑا ہو رہا ہے۔ ماں باپ کے جھگڑوں سے سہم جاتا ہے، راتوں کو ڈر کے جاگتا ہے، کانپتا رہتا ہے۔ ان دونوں کو ذرا خیال نہیں۔“ اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں انہیں یہ کبھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کی فکر بھی نہ کریں۔ آخر فہد مجھے بھی بہت پیارا تھا۔

”اب تو تم سے ہی امیدیں ہیں۔ اللہ کرے تمہاری دلہن اتنی نصیبوں والی ہو کہ گھر میں پھر سے خوشیاں ہی خوشیاں بھر جائیں۔“ انہوں نے وہ ذکر پھیر دیا جو کہ آج کل ان کا ہیورٹ تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح چڑا نہیں، میری خاموشی سے حوصلہ پا کے انہوں نے پوچھا۔

”تم ماشاء اللہ خود سمجھ دار ہو تمہاری پسند خود بھی قابل اعتبار ہوگی۔ اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے بیٹا تو بتاؤ۔“

”نہیں..... مجھے.....“ میں شمت سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن آنکھوں کے آگے دو سادہ سی بناوٹ والے لب مسکرانے لگے اور میرا ہاتھ..... میرا ہاتھ کوئی بڑے پیار سے سہلانا لگا۔

”بولو ناں۔“ امی جان نے پھر پوچھا۔

”ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا، میرا مطلب ہے میں نے اس بارے میں کبھی سوچا نہیں۔“

”تو کب سوچو گے؟“ انہوں نے پیار سے میرے بالوں کو باگڑا کر مسکرا کر رہ گیا۔

”بہت جلد۔“

☆☆☆

میں نے واقعی سوچنا شروع کر دیا۔ محبت سوچ سمجھ کے نہیں کی جاتی، لیکن میں محبت کب کر رہا تھا میں تو اپنے لیے ”بہترین“ کا انتخاب کر رہا تھا۔ سالوں تک مجھے ایسی کوئی ہستی نظر نہ آئی جس پر مجھے کم از کم بہتر ہونے کا شائبہ ہی ہوتا۔ اب یہ دنیا عمر واحد ایسی تھی جس پہ چند ”بہتر“ ٹک لگے ہوئے تھے۔ وہ ذہن تھی، پرکشش تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، باوقار تھی، باکردار تھی، اعلیٰ ظرف تھی، خوش لباس، خوش مزاج اور خوش شکل بھی، پھر ابھی ابھی اور بہت کچھ چاہنا پڑھنا باقی تھا۔

”اے بہت رئیس! ان رئیس نہ سہی مگر ہمارا ہم پلہ تو ہونا چاہیے۔“ میں نے نمبر ایک پوائنٹ سوچا۔

”شرمین کے مقابلے میں اس کی خوبصورتی کو زیادہ نمبر نہیں مل سکتے، لیکن خیر ہے

تعلیم کے معاملے میں تو دنیا کے ہی پونٹیں زیادہ ہیں۔“ دوسرا نکتہ اٹھایا گیا۔ حساب کتاب برابر ہوا

”بس اس کے فیملی بیک گراؤ کا اندازہ ہو جائے اتنا تو مجھے پتا ہے کہ اس کے والد ریشازو میجر ہیں، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ آج کل تو پیسے کی دلیو ہے..... عہدے اور پوزیشن کی اہمیت ہے۔“

میں سارے حساب کتاب کر رہا تھا۔ میرا شاطر اور محتاط دماغ میری معاونت کر رہا تھا اور میرا دل.....

میرا دل دور کھڑا قہقہہ لگا رہا تھا۔

دور کھڑ..... ہاں بہت دور..... دنیا کے قریب.....

☆☆☆

”اب آپ ریٹیکس کیجئے، باقی کام میں کروں گی۔“ اس نے فائلز اٹھاتے ہوئے مجھے مشورہ دیا، شاید میرے بار بار ہاتھ سہلانے سے اس نے اندازہ لگالیا ہو کہ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

”کیوں کیا تمہیں ریٹیکس نہیں کرنا چاہیے۔ آخر تم بھی تو پچھلے دو گھنٹے سے میرے ساتھ ہی اس پراجیکٹ کو ڈسکس کر رہی ہو۔“ وہ صرف نظریں نیچی کیے مسکرا دی۔ میں نے بات آگے بڑھائی۔

”کیوں نہ کچھ دیر ہم برنس کی بورڈ سکھن کو بھول کر ہلکی پھلکی باتیں کر لیں۔ ذہن بھی ہلکا پھلکا ہو جائے گا اور ماحول بھی۔“

”شہیو.....“ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل ایک طرف رکھ دی۔

”تم نے بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”میں نے انٹرویو میں سب ہی کچھ تو بتا دیا تھا۔ اس دن تو آپ کا رویہ ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ کچھ جانتا ہی نہیں چاہتے ہوں۔“

”بھئی میں اس قسم کے جاننے کے متعلق نہیں کہہ رہا۔ میرا مطلب ہے تمہاری فیملی تمہاری پسند، ناپسند وغیرہ وغیرہ۔“

”میں کوئی فلم اشار ہوں، جو آپ یہ سب جانتا چاہتے ہیں۔“ اس کے بار بار بات گھما دینے پہ میں تنگ آ گیا۔

”دوست ہو تو۔ اور دوستوں کو دوستوں کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔“

”دوست.....“ وہ جیسے مجھ سے نہیں خود سے پوچھ رہی تھی اور شاید خود سے بھی کوئی

جواب سننے کے بعد اس نے سر ہلایا اور مجھے دیکھ کے کہنے لگی۔

”ہاں دوست..... اور دوست..... کو دوست کے متعلق واقعی علم ہونا چاہیے۔“ اسے راستے پہ آنا دیکھ کے میں اپنے ذہن میں سوال مرتب کرنے لگا کہ وہ بول پڑی۔

”چلیے پھر بتائیے اپنے متعلق..... آخر دوستی کے پہلے دعوے دار بھی تو آپ ہیں۔“ اس نے بڑی ہوشیاری سے بال میرے کورٹ میں ڈال دی۔

”کیا بتاؤں؟“ گھر میں بس میں ہوں، امی جان ہیں۔ بھائی جان اور شرمین۔“

”شرمین!“

”بھائی جان کی بیوی..... میں نے مختصر“ بتایا۔

”یعنی آپ کی بھابی.....“ اس نے ٹٹولے والی نظروں سے دیکھا میں شانے اچکا کر رہ گیا۔

”اور فہدہ۔“

”فہدہ!“ میں نے اس کی آواز میں واضح لرزش محسوس کی۔

”جتنیجا میرا..... بڑا پیارا سا، گھلسا.....“ میرے لہجے میں خود بخود ہی حلاوت سی آگئی، اسے دیکھا تو اس کی پراشٹیاق آنکھوں میں بھی وحی حلاوت تھی۔

”لگتا ہے تمہیں بچے بہت پسند ہیں۔“

”بہت..... بہت زیادہ اور فہدہ تو..... میرا مطلب ہے فہدہ بھی بہت پیارا ہوگا ناں..... دوسرے تو سب ہی بچے بہت پیارے ہوتے ہیں۔“

”ہوئے ہوں گے، مجھے تو صرف فہدہ اچھا لگتا ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”اس سے پہلے میں نے بھی بچوں میں دلچسپی نہیں لی تھی، بلکہ اب بھی نہیں لیتا البتہ فہدہ کی بات اور ہے وہ تو جان ہے میری۔“

”مجھے تو لگتا ہے آپ اور سب میں بھی بس واجبی دلچسپی ہی رکھتے ہیں۔“ اس کے قیاس پہ میں نے چونک کے دیکھا۔

”ماں کے بارے میں تو بتانے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے اور آپ نے بس دو لفظوں میں نمٹا دیا، اور آپ کی بھابھی..... یعنی شرمین، اس سے تو آپ اچھے خاصے کبیدہ خاطر لگ رہے ہیں۔ اگر میرے اندازے ذاتیات پر حملے کے مترادف ہوں تو معذرت

چاہوں گی۔ بس یونہی مجھے لگا تو میں نے کہہ دیا۔“

”نہیں نہیں معذرت کیسی، اور ذاتیات کیسی۔ دوستی میں اتنی چھوٹ تو دے دینی چاہیے۔“ میں نے دانستہ ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا ورنہ اس کی غضب کی قافیہ شناسی پہ

میں دنگ رہ گیا تھا۔

”شرمین سے میں کیا، گھر کا ہر فرد دنگ ہے۔“

”ہر فرد..... یعنی آپ، آپ کے بھائی اور والدہ..... اور کیا فہدہ بھی؟“ اس کے سوال پہ میں الجھ گیا۔

”فہدہ کیا ذکر؟ وہ تو ابھی بچہ ہے، لیکن سچ پوچھو تو ماں کی حیثیت سے اس کا رویہ بیٹے کے ساتھ بھی انتہائی ناروا ہے۔ وہ ایک غیر ذمہ دار ماں، لا پرواہ بیوی، بد تمیز بہو

اور.....“

”بیوی اور بہو کے آگے جو مرضی لگا لیں، لیکن پلیز ماں کا لفظ داغ دار نہ کریں، ماں صرف ماں ہوتی ہے۔“ میری بات کاٹ کے وہ بولی۔

”دیکھو بیٹا جس طرح سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں، سب مرد ایک سے نہیں ہوتے، اسی طرح رشتے بھی سب ایک سے نہیں ہوتے۔ میں جانتا ہوں تم عورت ہونے کے ناطے اسے ایڈوائس دے رہی ہو لیکن میں نے یہ رواجی سوچ کبھی نہیں رکھی۔“

یار ساری بات ہوتی ہے جذبات کی، احساس کی اور اس سے بھی بڑھ کے فطرت کی، تم نے اخباروں میں بار بار پڑھا ہوگا، چار بچوں کی ماں آتشا کے ساتھ فرار..... نامعلوم

ماں ایک نوزائیدہ بچی کو کھنڈی سڑک پہ پھنسر کر مرنے کے لیے چھوڑ گئی۔ بیوی نے شوہر کو زہر دے دیا۔ بے شک ایسی خبریں ہزاروں میں ایک کے متعلق ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتی

تو ہیں۔ اگر میں شرمین کے خلاف کچھ کہہ رہا ہوں تو اسے تم ”ماں۔“ کے خلاف بیان مت سمجھو۔ زینیا ماں ویسی بھی ہوتی ہے، جیسی میری ہے اور ماں ویسی بھی ہوتی ہے جیسی

فہدہ کی ہے۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں چونک سا گیا۔ وہ روانی میں مجھے ”آپ“ کے بجائے ”تم“ کہہ کے پکار رہی ہے۔ میں خوشی کے نامعلوم

سے احساس کے تحت ہلک گیا۔ لیکن اسے جتانے کے بجائے بات جاری رکھی۔

”ابو جان کی وفات کے بعد امی جان نے اپنے طور پہ ہمیں پالا۔ بڑی خود داری، بڑی محنت کے ساتھ..... لیکن اپنے صاحب حیثیت بھائیوں سے کسی قسم کی کوئی

مدد نہ لینے کے باوجود جاننے کے لیے وہ ہمیشہ ان سے مرعوب رہیں۔ امی، ماموں کی شبی شرمین کو ایسے پیار کر لائیں جسے کسی بہت بڑے احسان کا بوجھ سمیٹا ہو۔ بس اس دن سے

ہمارے گھر کا ماحول خراب ہے۔ ہر کوئی دوسرے سے اکڑا اکڑا، نالاں، شام کی میرا تو دل نہیں چاہتا گھر جانے کو، یہ نہیں امی کیسے سارا دن گزارتی ہیں۔

اور زینا! مجھے تو اس بچے کے نصیبوں کا خیال آتا ہے جو ماں باپ کے جھگڑوں کی بدولت وقت سے پہلے بڑا ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پہ سو سال کی سنجیدگی اور مالِ نقشب ہو گیا ہے۔“

میں سانس لینے کو رکھا، اس کے اپنے چہرے پہ لال اور گناہ صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے خود بہ حیرت ہوئی میں کس طرح اس کے سامنے کھل گیا۔ کیسے وہ اسے تم دونوں میں اتنے قریب آگئی کہ میں..... عاشق ملک، خود کو سینت سینت کر رکھنے کا عادی، اپنی ساری بریتیں اس کے سامنے کھولنے لگا۔ میں تو اس کی ذات کی ہر گہرائی بٹھا تھا اور وہ باتوں باتوں میں مجھے کھول گئی۔

”لو..... میں نے..... تو سب بتا دیا اس کے علاوہ اور بتانے کو ہے بھی کچھ نہیں، دوست، بس نوید ہے اور اب تم..... وہ کالج، اسکول کی دوستیاں کالج کے ساتھ ہی ختم..... میں زیادہ دوست بنانے کا قائل بھی نہیں، اب تم تاؤ اپنے حلق“ میں..... زینا عمر..... بابا عمر فاروق جھنگلی دینا زور بھرتے..... چھ سال پہلے ان کی وفات ہوئی۔ ماما کو گزرتے نو سال ہو چکے ہیں، میں نے ایم بی اے کیا ہے۔ عمر چھبیس سال، قد پانچ فٹ چار انچ۔ پسندیدہ رنگ سفید، پسندیدہ پھول موتیا اور پینیکل، کھانے میں سبزیاں پسند ہیں، آکس کریم اور جات بھی اچھی لگتی ہے۔ دالوں سے کچی پکی دشنی ہے۔ فیورٹ ایکسٹر بریڈ پٹ، ایکسٹرس گیمرون ڈیاز، ہنگر.....“

”اشاب اٹ..... جٹ اشاب اٹ.....“ میں نے پیروٹ اٹھا کے اسے دھکی دی۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہونگی، بلیکس جھک گئیں۔ جب وہ کھل کے مسکرائی تو دنگا ہیں خود بخود ہی جھک جاتیں۔ اور وہ یوں سر ہلاتی جیسے اپنی مسکراہٹ سے خود محفوظ ہو رہی ہو۔ ”تم کسی فلمی کا ڈانٹ ڈاؤن، میں اپنے فیز کے سوالوں کے جواب نہیں دے رہی میں نے تم سے یہ سب نہیں پوچھا تھا۔“

”کیا کروں، میری لائف میں بتانے لائق کچھ ہے ہی نہیں۔“ ”یوں کہو، میں اس لائق نہیں۔“ میں نے دانستہ لٹکی جتائی کہ شاید اس پہ میری ناراضگی بھرے جھلکے کا کچھ اثر ہو، لیکن وہ خاموش رہی تو میں نے ہار کے صرف اتنا کہا۔

”یعنی میں دوستی کا صرف پہلا ہی نہیں، واحد اور آخری دعوے دار بھی ہوں۔“ ”جو مرضی سمجھ لو،“ وہ بے پروائی سے کہتی اپنی فائل اٹھا کے چل پڑی تو میں بچو و تاپ کما کر رہ گیا۔

”عجیب کھنی لڑکی ہے۔ پہلے اپنائیت جتا کے مجھ سے سب اگلو الیا اور اب اپنی باری

میں کیسے جبر سمیٹ کے چل گئی۔ ایسا کیا ہو سکتا ہے اس کی زندگی میں جو وہ بتانے سے کترا رہی ہے۔ کچھ تو ایسا ہوگا، جس پہ پردے ڈالے جا رہے ہیں، ٹھیک ہے، باپ فوجی بندہ تھا لیکن کیا تاکسی سنگین جرم کے سلسلے میں کورٹ مارشل ہو چکا ہو..... چاب کرتی ہے تو پھر ضرور مالی حالت مندوش ہوگی۔ لیکن وہ نئے ماڈل کی کار، رکھ رکھاؤ، وہ اعلیٰ طور اطوار..... پھر ضرور کوئی اور مجبوری ہوگی..... ہو سکتا ہے کوئی نہ کوئی بھائی نشے کا عادی ہو۔ جرائم پیشہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے اس کی بیٹی مقروض ہو۔ اور..... اور..... ممکن ہے وہ کسی ناکام شادی کا بچہ بچہ رہتی ہو اسے ایم بی اے کیسے ڈھائی تین سال ہو رہے ہیں۔ اگر شوقیہ چاب کرنا ہو تو تب بھی کر لیتی۔“

اپنے تصور کے کھوڑے ہر طرف دوڑانے اور ہر امکان کو سامنے رکھنے کے بعد میں نے خود سے سوال کیا۔

”کیا میں اس اپنانے کی ہمت کر پاؤں گا۔ اگر ان میں سے میرا ایک وہم بھی حقیقت نکلا.....“

”ہرگز نہیں۔“ میرا فوری رد عمل تھا۔ ”اپنانا تو ایک طرف، میں ایسا سوچنے کی ہمت بھی نہ کر پاؤں گا۔“

میرا دل پھر سے قہقہہ لگا رہا تھا۔

☆☆☆

اس دن وہ جیسے مجھے غچ دے کر نکل گئی تھی، میں بعد میں کافی دیر تک شیٹاتا رہا۔ اپنی عادت کے خلاف میں خود کسی کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے پہ مجبور ہوا اور پھر روانی میں ہی سہی، انجانے پن میں ہی سہی چچ چچ دوستی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس سے اپنی انتہائی پرسنل باتیں بھی کر گیا۔ لیکن جب میں نے اس سے پوچھا تو..... کیسے وہ صاف پہلو تھپی کر گئی۔ میں کئی دن اس سے کچھ پچھتا سارا بہ شاید اس نے میرے گریز کو محسوس بھی کیا تھا یا نہیں، میں اندازہ نہ لگا سکا۔ اس کا انداز نارمل ہی رہا۔ میں سخت الجھن محسوس کرتا رہا۔ ایک طرف دل کی بے چینی تھی، دوسری طرف دماغ کے پے در پے کریدتے ہوئے سوالات اس کا محاط طرز عمل اور ان سب سے سوا میری اپنی خود پسند فطرت..... میرے لیے یہی بہت تھا کہ میں دوستی میں پہل کر بیٹھا تھا، اب مسلسل اس کے بارے میں دیکھی کا اظہار کر کے اسے یہ جتنا نہ چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے اتنی اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ لیکن شاید میرا روٹھا روٹھا سارو یہ بھی یہ بات جتانے کا ایک انجانا سطر لیتے تھے جس میں خود پہ بھی ظاہر نہ کر رہا تھا، کچھ ہی دن بعد اس نے پھر سے وہ ذکر

خود ہی چھیڑ دیا۔
”عاشر! اگر آپ اپنے اس دعوے پر اب تک قائم ہوں تو کیا میں آپ سے ایک سوال کر سکتی ہوں؟“

میٹنگ برخواست ہونے کے بعد سب ہی کبین سے نکل گئے۔ لیکن زینا وہیں موجود تھی۔ اس کے پوچھنے پہ میں نے پچھلے آدھ گھنٹے کے دوران چوتھی بار سلگایا ہوا سگریٹ ایک طرف رکھ کے کہا۔

”اول تو میں دعوے کرتا ہی نہیں اور اگر کروں تو دستبردار نہیں ہوتا۔“
”اس کا مطلب ہے میں سوال کر سکتی ہوں۔“

”نہیں اس کا مطلب ہے فی الحال تم صرف جواب دہی کر سکتی ہو۔“
”اوہ یعنی جوانی کا ردوائی؟“ پھر وہی جھکی نظروں کے ساتھ گہری ہوئی مسکراہٹ۔
”میں دعوے نہیں کرتی عاشر! یقین ضرور دلائی ہوں۔“ اچانک اس نے نظریں

اٹھاتے ہوئے کہا۔
”اسوکنگ تو خیر آپ کرتے ہی ہیں، لیکن آج کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے۔ اب پلیز یہ مت کہنا کہ پریشانی کی وجہ سے.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کے پہلے ہی واضح کر دیا اور میں جو جج جج یہ ہی کہنے جا رہا تھا، کل ساہو کے سگریٹ الٹیرٹے میں منسلک لگا۔

”اور اگر روایتی ایسا ہے تو کیا تم مجھ سے اپنی پریشانی شیئر نہیں کر دے گے؟“ وہ پھر سے ”آپ“ سے ”تم“ پر آگئی۔ میں ایک بار پھر ٹریپ ہو گیا اور بتانے لگا۔

”امی کی طبیعت کل سے کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ رات کو ہاسٹل ایڈمٹ کرانا پڑا۔ بی بی خاصا ہلکی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے فاج کا خطرہ ہے۔ اس لیے ایک دو دن کے لیے آہر رویشن رکھا ہے۔ صبح بھی میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ میٹنگ کے دوران بھی دھیان امی کی جانب ہی لگا رہا۔“

”کون سے ہاسٹل میں ہیں؟“
”ڈاکٹر ز ہاسٹل.....“ میں نے مختصر آنا بتایا اور مجھے بالکل گمان نہ تھا کہ وہ شام کو واقعی انہیں دیکھنے آ جائے گی۔

میں آٹھسے جلدی اٹھ گیا تھا اور پچھلے چار گھنٹوں سے امی جان کے ساتھ تھا۔ باقر بھائی جان بس صبح آدھ گھنٹے کے لیے کھڑے کھڑے آئے تھے۔ ان کی چپٹی بیوی کو تو کل سے اتنی توجہ بھی نہ ہوئی تھی، میں شاید افس نہ بھی جانتا یا اگر تا جان کی ٹیمپل انہیں دیکھنے نہ جانی، بتائی امی اپنی بڑی بہو کے ساتھ وہیں رک گئیں اور میرے آنے تک انہوں نے

امی جان کا خاصا دھیان رکھا۔ جاتے جاتے وہ بھی شرمین کی لا پرواہی اور بے بسی پہ سو باتیں سناتی گئیں۔ میرا جی مکدر ہو گیا۔

”ادنبہ، چند گھنٹے یہاں بیٹھنا کیا پڑ گیا۔ جیسے ہمارے گھر پہ تنقید کرنے کا حق ہی حاصل ہو گیا ہے انہیں۔“

”بھابھی نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔“ امی نے صفائی پیش کی۔
”اور وہ جو کہا جا رہا تھا کہ رخصت تم نے ہو کو سر پڑھا رکھا ہے۔ باقر کی لگا میں کھینچ کر رکھو۔ کیوں کی طریقہ ہے وغیرہ۔ انہیں کیا حق ہے ہمارے پرسنل معاملات ڈسکس کرنے کا۔“

”ہمارا کوئی پرسنل معاملہ ان سے الگ ہے، نا ان کا ہم سے عاشر بچے زندگی یوں سب سے کٹ کے نہیں گزرتی تو امر باقر کل کو میرے بعد کیا پوئی ایک دوسرے سے کٹ جاؤ گے۔ کیا تمہارا ادنبہ یا باقر کا تمہاری زندگی کو کوئی حق نہیں رہ جائے گا۔ وہ بھی تمہارے مرحوم والد کے بھائی کا گھر ہے۔ دیکھ لو وقت پر اپنے ہی کام آتے ہیں۔ پھلے گھر الگ الگ ہیں۔ میں اپنے گھر اور بچوں میں مصروف، بھابھی اپنے کنبے کے بکھیروں میں لگے ہوئی، ہفتوں ملاقات نہیں ہو پاتی لیکن دکھ درد تکلیف میں بھی رشتے ناتے کام آتے ہیں۔“

امی جان نے ہمیشہ کی طرح مجھے رشتوں اور ان کی اہمیت کا افادیت کے بارے میں لیکچر دینا چاہا۔ میں نے بور ہو کے ان کے لیے سبب کا فائز شروع کر دیا۔

”پلیز امی اس وقت تو خاموشی سے لپٹ جائیے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“
”اچانک میری نظر دروازے پہ پڑی۔ آدھ کھلے بے آواز دروازے میں وہ زینا تھی، جو بڑے دھیان سے امی کے ”غفر مودات“ ڈی ہن نشین کر رہی تھی۔

”ارے زینا! تم! آؤ.....“ میں پر جوش ساہو کے کھڑا ہو گیا۔

واقعی اس کا کیا ان نا میرے لیے غیر متوقع تھا، لیکن مجھے اتنی زیادہ اور بے ساختہ خوشی ہوگی، یہ خود میرے لیے زیادہ غیر متوقع تھا شاید میرے چہرے پہ، میرے لہجے میں خوشی کے رنگ اتنے واضح تھے کہ چھلک چھلک کے ان دونوں پہ جا گرے۔ ناشائسی نظروں سے اسے دیکھتی امی جان بھی میرے چہرے کو کھینچنے لگیں اور خود زینا بھی اس صورتحال سے عجیب بنو کے پزل ہو گئی۔ میں نے جلد ہی خود پہ کنٹرول کیا۔

”امی! یہ زینا نہیں، میرے ساتھ آٹھسے ہوئی ہیں۔ بہت ذہین، بہت قابل اور بہت.....“

”اچھی دوست ہیں۔“ اس نے میرا جملہ مکمل کر کے مجھے یوں دیکھا۔ جیسے جتنا رہی ہو ”لو اب دھوی مکمل ہوا۔“

”آؤ بیٹی! یہاں بیٹھو“ اسی نے فوراً اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ اسی سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے انہیں مے سے جانتی ہو۔ اسی نے اپنی عادت کے مطابق سب سے پہلے گفتگو کا رخ اپنے سیکے کی جانب موڑا۔

”کشمیری خاندان سے تعلق ہے میرا۔ میری امی تو اللہ بخشے اصلی کشمیری خاتون تھیں۔ بعد میں والد صاحب لاہور آئے کس گئے۔“

”ارے آنٹی! عجیب اتفاق ہے کہ میرے ماما پاپا بھی کشمیری فیملی سے ہیں، لیکن لاہور رہتے آئے ہیں۔“

”اچھا تب ہی میں کہوں اپنی اپنی لگ رہی ہو۔ وہ لہجہ، وہی دل چال۔“ امی کو اپنی ہم ذات، ہم نسل خواتین سے مل کے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ میں یوں تو اس ذات بات و جبرہ پہ ذرا یقین نہیں رکھتا۔ لیکن اس وقت اس کے بارے میں یہ حقیقت جان کے دل کو طمانیت ہی محسوس ہوئی۔

”تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“

”جی ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ویسے وہ ہجر تھے۔ اور ماما تو بہت پہلے وفات پا گئی تھیں۔“

”اوہ..... بہت افسوس ہوا۔ دیکھو ذرا، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور ماں باپ دونوں کے سائے سے محرومی، خیر اللہ بڑے نیاز ہے۔ تمہارے کیا کیا لے کر کیا کیا نواز دیتا ہے۔ اور تمہارے بہن بھائی کتنے ہیں اور کسے ہیں؟“ میرا مطلب ہے شادی شدہ ہیں یا انہی پر بھروسہ ہیں۔“ امی نے باقاعدہ انٹرویو شروع کر دیا۔

”جی میرے دونوں بھائی بڑے ہیں مجھ سے۔ میرڈ ہیں، ایک کینیڈا میں ہوتے ہیں۔“

”اچھا اچھا، اور کرتے کیا ہیں دونوں؟“ میں نے کوفت سے اسی جان کو دیکھا جو طبیعت کی خرابی وغیرہ سب بھولے مے سے سوال پہ سوال کر رہی تھیں۔ زینیا کے چہرے سے ذرا نہ لگ رہا تھا کہ سوالوں سے تنگ آ رہی ہے، اس کے لبوں پہ وہی پرس زندہ سی مسکراہٹ تھی۔

”بڑے بھیا بیورو کریٹ ہیں انہیں گریڈ کے آفیسر اور دوسرے کینیڈا میں پاکستانی ایجنسی میں ہوتے ہیں۔“

اس کے بتانے پہ میں ایک بار پھر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسی طرح پرسکون انداز میں اپنے متعلق بتا رہی تھی۔ اس نے پہلے کسی ہلکا سا اشارہ نہ دیا تھا کہ اس کے دونوں بھائی

اتنے اونچے عہدوں پہ فائز ہیں۔ ایک بیورو کریسی میں اعلیٰ گریڈ آفیسر تھا، دوسرا فارن منسٹری میں تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ بلیک اینڈ وائٹ کنٹراسٹ کے کاشن کے شلوار قمیض میں ملیں، بلیک شال اوڑھے، بیورو میں بلیک کینوس شوز، کانوں میں ہلکے سے گولڈ کے ٹائیس، ناک میں چمکتی سفید لوگ، سادہ مانگ کے ساتھ کھینچ کے بنائی ہوئی، بغیر کسی میک اپ کے گھریلو سے چلے کے ساتھ وہ اس وقت میرا پھوڑا ہوا سیب پھیل رہی تھی۔ اس نے نفاست سے قاشیں کاٹ کے امی کے آگے رکھیں۔ صفائی سے ترشے مصنوعی روغن سے پاک ناخنوں اور لمبی انگلیوں والا ہاتھ..... وہ کہیں سے بھی اس کلاس کی نہیں لگ رہی تھی جس نے اسے کہہ ہوتا چاہیے تھا، ایسے اونچے عہدوں پہ فائز بھائیوں کی وجہ سے۔

”میں تنگ آ گئی ہوں پھل کھا کھا کے۔“ انہوں نے شکایت کیا۔

”سوپ پینے پہ آپ تیار ہیں، دلہ کھانے سے آپ کو اُپکائی آتی ہے۔ پھل کھا کھا کے آپ تنگ آ چکی ہیں۔ آخر آپ کی خدمت میں کیا چپیں کیا جائے؟“ میں نے تنگ آ کے کہا پتھاری کے درد ان امی کھانے پینے پہ ایسے ہی خیرے کیا کرتی تھیں۔

”آپ آنٹی کو ان کی پسند کی چیزیں لا دیجئے ناں۔“ زینیا کی سفارش پر میں نے اسے مطلع کرنا ضروری تاجا۔

”ان کی پسند کی چیزیں، کڑھی، بیٹکن کے پکڑے، قیدہ بھرے کر لیے۔ ماش کی وال، مولیٰ کا راتھا..... ان کی پسند دیکھو اور ایک نظریہ ای سی جی کی پورٹس پہ ڈالو۔“

”واقعی آنٹی! تو اچھی بات نہیں۔ اپنا خیال سب سے پہلے خود رکھنا چاہیے۔ عاشر کل سے اتنے پریشان ہیں آپ کے بارے میں، اپنے پیاروں کو پریشان تو نہیں کرنا چاہیے۔ جب یہ چھوٹے تھے تو آپ نے بھی ہزاروں بار انہیں بد پرہیزی پہ ٹوکا ہوگا، جتنی سے منصفحت چیزوں سے دور رکھا ہوگا۔ گا خراب ہے، آکس کریم نہیں کھائی، زکام ہے کولڈ ڈرکس نہیں پینا۔ امی گندی چیز سے، سوئس سے دانتوں میں کیڑا لگ جاتا ہے۔ زیادہ چنے کھانے سے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ.....“ اس کے یوں گنوانے پہ امی ہنس پڑیں۔

”تو اب میری باری ہے۔“

”بالکل، پر ہیئر تو کرنا ہوگا۔“

”پر ہیئر تو تمہک ہے، لیکن یہ بزرگ سوپ اور دلے طلق سے نہیں اترتے، ڈاکٹر نے زیادہ مہرج سالا اور لکھی بند کیا ہے۔ تمک کم کرنے کو کہا ہے، یہ تو تمہیں کہا کہ دنیا کی ہر

نعت حرام ہوگئی ہے مجھ پہ۔“

”پلیں آج رات کا کھانا میں بھیجتی ہوں آپ کے لیے اوکل تک تو شاید آپ
دسپارچ ہو جائیں گی۔ کیوں عاشر؟“

”انشاء اللہ، بس ابھی ڈاکٹر آئی ہیں تو پتا چل جائے گا، لیکن تم پلیز کھانا بھیجے کی
تکلیف مت کرنا۔ اسی کا کھانا پچھلے میس سے آتا ہے۔“

”تکلیف کیسی۔“ واکنگ ڈسٹنس پہ میرا گھر ہے، بالکل قریب ہی میں تو یونہی ٹہلنے
ٹہلنے آگئی، اچھا آئی اب اجازت دیجئے۔ میں چلی ہوں۔“

”چلو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں نہیں، آئی اکیلی ہیں، میں چلی جاؤں گی۔“

اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ کھانے سمیت موجود تھی۔ اس نے ہاٹ پاٹ کھول کر انی
کے سامنے رکھا۔

”یہ دیکھی مرغی کی بخٹی میں کھجوری پکائی ہے۔ سالے بالکل نہیں، اور تیل بالکل کم
ہے۔ مرغی کے پی بالکل ذرا ذرا سے پیس کر کے کس کر دیے ہیں۔ اور یہ کس بڑی بالکل
مرچ کے بغیر ہے، انیم کی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ یہ پھلکا بھی ہے۔“ اس نے ایک ایک
چیز نکال کے پیش کی۔

”اور میرے لیے کچھ نہیں لائیں؟“ مجھے سخت ہموک محسوس ہو رہی تھی۔

”سوری، اگر میں کچھ اور لانی تو پھر لانی ہی سے یہ کھانا مشکل ہو جاتا۔“

”کھجوری تو واقعی بہت لذیذ ہے۔“ ابی نے رغبت سے کھانا شروع کیا۔

اسنے میں باقر بھائی اچانک اندر داخل ہوئے، وہ حیرت سے اسی کے قریب ہی بیٹھ
پہے تکلفی سے نیٹھی زینٹا کو دیکھ رہے تھے۔ تو میں ان کے عقب میں ہونٹھا سچاٹے کھڑی
شرٹیں کو دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے آئے ان کیسے گوارا کر لیا تھا۔ مارے بندھے اس نے

ساس کو سلام بھی کر ڈالا۔ میں نے زینٹا کا تعارف ان دونوں سے کرایا وہ بچپنی سے ان
دونوں کے پیچھے کسی کو ڈھونڈنے لگی پھر مایوسی ہو کے پوچھ بیٹھی۔

”فہد نہیں آئی۔“

سب کے ساتھ ساتھ میں بھی متعجب ہو گیا۔ شرٹیں کی تو باقاعدہ تہریاں چڑھ
گئیں وہ بیٹاری خود شرمندہ ہو گئی۔ سب کے تاثرات دیکھ کے پھر اپنی جھینپ منانے کے
لیے کہنے لگی۔

”دراصل عاشر اکثر ذکر کرتے رہتے ہیں اس کا اور ابھی آئی نے بھی اس کی اتنی

بیاری بیاری باتیں بتائیں کہ میرا دل اسے دیکھنے کو چاہنے لگا۔“

”بچوں کا ہاسٹل میں کیا کام، ہزاروں طرح کے جرائم ہوتے ہیں، اسے کیا ساتھ
لا کے پیار کرنا تھا میں نے۔“

شرمین تنک کے بولی، تن فن کرنے اور چاہا کے بولنے کی اسے ایسی بڑی بیاری
ہو گئی تھی کہ اب وہ نازل لہجے میں تو بات کر رہی نہیں سکتی تھی۔ ہم سب تو عادی تھے لیکن کسی

انجان کے سامنے اس کا ایسا چھتا لہجہ بڑا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے بھی زینٹا کی گھبراہٹ
محسوس کر کے اسے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

”ای کو کوئی چھوت کی بیاری تو نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ وہ ابی کی جانب بھیجی تو ایک ٹائپے کو وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں۔ پھر
جیسے نہال ہو کے اس کا تھا چوم لیا۔ اس کا پیار لینے کا یہ انداز شرٹیں کو اور سلکا گیا۔ خود وہ

ان کی ہوا اور ہانچ ہونے کے باوجود بھی قریب تک بیٹھنا گوارا نہ کرتی تھی۔ اس کے
آنے کے بعد مجھے ہاسٹل کے اس کمرے میں محسوس ہونے لگی میں زینٹا کو گھر

چھوڑنے کے بہانے دیاں سے نکل آ یا۔

وہ ٹھیک کمرے ہی تھی، صرف بائچ منٹ کی واک پہ، جی دن میں اس کا گھر تھا۔ چھوٹا
سا جھنجر سا سنگل اسٹوری مکان۔ بمشکل دو بیڈرومز پہ مشتمل ہوگا، میں ایک بار پھر انجمن کا

شکار ہو گیا تھا۔ اسنے آئے اچھے ترہوں والے بھائی کو بہن اس بائچ مرنے کے، چند لا لاکہ کی
مالیت والے مکان میں رہتی ہے۔ اتنا یقین تو مجھے تھا کہ کم از کم اس کے بھائی وہاں نہ

رہتے ہوں گے۔ مکان کے باہر تو کسی سرکاری افسر کے نام کی پٹی تھی نہ ہی سفارت
کار کی پورچ میں سرکاری نمبر پلیٹ والی مرشد بڑا عجیبو کے بجائے زینٹا کی اپنی حرذا

کھڑی تھی۔ اسے کی ہوں میں چالی گھماتے دیکھ کے میں نے پوچھا۔

”تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟“

”نہیں بھو بھوسو گئی ہوں گی، اس لیے میں ڈپلی کیٹ چاہی لے آئی۔“ اس نے
کیٹ کھولا اور اندر جانے سے پہلے مکر کے مجھے دیکھا۔

”او کے عاشر! گڈ نائٹ، آئی کا خیال رکھنا۔“ وہ فوراً اندر چلی گئی اور دھڑ سے
کیٹ بند ہوا۔ لاک کی آواز سے لاک لگا اور میری کنپشیاں کھج گئیں۔

”دیری روڈ، کم از کم مجھے ایک کپ کافی تو آفر کر سکتی تھی۔“ میں نے اس کی بے
نیازی سے تمللاتے ہوئے سوچا۔ مجھے کافی کی اتنی طلب نہ تھی۔ جتنا کہ میں اس کے بارے

میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش رکھتا تھا۔ میں سب جانتا چاہتا تھا، سب کچھ، مجھے

اپنے تمام سوالوں کے جواب چاہیے تھے۔ میں اپنے ہر دم کی تسلی کرانا چاہتا تھا۔
 شاید میں اندر سے اب تک وہی آنچور، جذباتی سا عاشر تھا۔ جس نے ایک بار
 شرین کے تاؤ دلانے پہ بڑے چلیچلے مجھے انداز میں کہا تھا۔
 ”میری پسند کی ہوا تک نہیں لگ سکتی تھیں۔“
 ”تم کیا۔ زمانہ دیکھو گا عاشر ملک کی شریک حیات۔ ہر گھار سے بے مثال ہوگی۔“
 ”میں صرف ”بہترین۔“ کے لیے بہا ہوں۔“

اس بات کو عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن میرے کہیں اندر یہ چلیچلے اب تک کسمار رہا تھا اپنا
 آپ منوانے کے لیے اس دور کی باتوں کو بچپنا کہہ کر جھٹلا دینے والا میں اب تک اسی
 جذبہ باتیت کے زیر اثر تھا۔ شرین سے قطع تعلق اور ہر طرح کی لاپرواہی کر رہنے کا دعویٰ
 کرنے والا میں دانستہ اور نادانستہ ہر بات میں اب بھی اس کا مقابلہ کرتا۔ اس نے کسی
 زمانے میں ریشم کے حوالے سے مجھ سے جو طفرے ہائیں کہیں تھیں میں لاشعوری طور پر اب
 تک ان کے زیر اثر تھا اور دوبارہ کبھی یہ طفرہ نہ سننے کی پیش بندی کر رہا تھا۔

میں زینیا سے متاثر تھا، اسے پسند کرنے لگا تھا، اسے اپنانا بھی چاہتا تھا، لیکن ہر
 طرح سے مطمئن ہونے کے بعد.... اس کے ہر طرح سے عمل اور ”بہترین۔“ ہونے
 کے یقین کے ساتھ ابھی تک بہت سی ایسی باتیں تھیں جو جاننا پاتی تھیں، میں اس کی ظاہری
 عادات و رکھ رکھاؤ، قابلیت و ذہانت کا قائل تھا۔ اس کے فیملی بیک گراؤڈ سے واقف
 ہو چکا تھا لیکن اس کا اپنے بھائیوں سے کٹ کر رہنا مجھے شک و شبہات میں مبتلا کر گیا
 ۔ مجھے اور کئی طرح کے وہم متانے لگے۔ اسی بے چینی کے زیر اثر میں اگلے ہی روز آفس
 میں پھر اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تم نے مجھی بتایا نہیں کہ تم ہاشاء اللہ سے اتنے مگڑے قسم کے بھائیوں کی اکلوتی
 بہن ہو۔“

”اس بات کا نہ تو میری جاب سے تعلق ہے اور نہ ہی ہماری دوستی سے.... پھر میں
 ذکر کیوں کرتی....؟ بلکہ عاشر صاف بات تو یہ ہے کہ ان کا مجھ سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس
 لیے اس تکلیف دہ ذکر کو روکنے دیں۔“

وہ اس موضوع سے فوراً ”گھبرا اٹھی۔“ اس کی آنکھوں کی جوت مدہم پڑ گئی۔ اب
 وہ آنکھیں کسی جوگی کی آنکھیں تھیں۔ سب کچھ تباہ دینے والے جوگی کی۔ میں نے کہا
 تھا تا یہ آنکھیں، یہ آنکھیں عام آنکھیں نہیں تھیں۔ پل پل رنگ بدلنے والی۔ تیر
 بدلنے والی۔

”کیا وہ تمہارے گئے بھائی نہیں؟“ میں نے قیاس کیا۔ ہوسکتا ہے زینیا میر
 صاحب کی دوسری بیوی کی اولاد ہو۔“

”گئے.....“ وہ استہزائیے ہنسی۔ ”وہ دونوں گئے ہیں.... گئے.....“
 ”تو پھر تمہارا اس طرح ان سے الگ، اکیلے رہنا، مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔“ میں نے
 کریدنا جاری رکھا۔

”مجھے بھی نہیں.....“ اب وہ آنکھیں کسی میٹے میں کھوئی ہر اسماں بچی کی آنکھیں
 تھیں۔ شاید میں اور بھی کچھ پوچھتا۔ شاید وہ اور بھی کچھ بتاتی۔ لیکن اتنے میں نوید کی آمد
 نے ہم دونوں کو یہ موضوع بدلنے پہ مجبور کر دیا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی بے چینی اور
 اضطراب پر قابو نہیں پا رہی۔ مجھے کسی غیر معمولی بات کے ہونے کا اندیشہ خردوار کرنے لگا۔
 اسی اب پہلے سے کافی بہتر تھیں۔ ہاسٹل میں قابل ڈاکٹر زکی دوروز تک ٹریٹمنٹ
 نے انہیں بھلا چکا کر دیا تھا۔ کچھ وہ بھی اپنا دھیان رکھنے لگی تھیں۔ پر میری کھانا کھایا
 جاتا، شام کو لان میں واک بھی کرتیں، سب زینیا کے اس روز کے بچکر کا اثر تھا اس شام
 انہیں کسلندی سے بستر پہ بڑے دیکھ کے میں ٹھٹھا کا۔

”کہاں کا بلڈ پریشر اور کیسی بیماری۔ میری جان کو تو ایک ہی روگ لگا ہوا ہے
 ۔ شرین اور باقر کی ناچانی اور کل کل.....“ وہ جل کے بولیں۔

”آپ نے پھر سے ان کی نیشن کو سر پہ سوار کرنا شروع کر دیا۔“
 لگتا ہے زینیا کے بچکر کے اثرات کم ہونے لگے ہیں۔ اس سے کہوں گا ایک ڈوز اور
 دے جائے۔“ اس کے ذکر پہ امی کا بھی دھیان اسی طرف چلا گیا۔

”ہاں کسی بھانے وہ آئے تو سہی۔ جی بڑی اپنی اپنی گلی وہ بچی مجھے، لگتا نہ تھا
 کہ پہلی بار ملی۔ نہ کوئی ملاوٹ، نہ بناوٹ، اس دنیا کی تو لگتی ہی نہیں۔“
 ”اچھا میں بتاؤں گا، آپ اسے مرخ کی مخلوق کہہ رہی تھیں۔“

”چل بہت..... مگر اسے یہ ضرور کہنا میں اسے یاد کر رہی تھی۔ تاکہ نہ کرنا کسی روز
 بہت سارے وقت کے لیے مجھ سے ملنے گھر پہ آئے۔ کاش.... کاش میری کوئی اس جیسی
 بیٹی ہوتی۔“ بڑے عرصے کے بعد امی جان کو اپنی بھولی بری خواہش یاد آئی۔ میں کہتے
 کہتے رہ گیا کہ ”آپ چاہیں تو آپ کی بیٹی میں بھی سکتی ہے۔“

”ایسی بابرکت، سعادت مند بچیاں ہی تو گھر کی رونق ہوتی ہیں۔ ایسی بچیوں کا
 وجود نعمت ہوتا ہے۔“ وہ حسرت زدہ لہجے میں کہتی رہیں اور میں سوچتا رہا۔ ”یہ رونق، یہ
 نعمت اب بھی ہمارا نصیب بن سکتا ہے۔“ میں غنظر رہ رہا کر شاید وہ باتوں باتوں میں کوئی

ایسا اشارہ دیں، اس کے حوالے سے مجھ سے کوئی رائے طلب کریں۔ اسے اپنی بہو کے روپ میں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کریں۔ لیکن وہ صرف اس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہیں، پورہ کوکے میں اٹھ گیا۔ یہ سب تو میں پہلے سے جانتا تھا۔ بہر حال اگلے ہی روز میں نے امی کی خواہش ضرور زینیا کے سامنے دہرا دی۔ وہ کچھ نہ بولی صرف لگا جس جھکائے بہر کو ہلکی ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے مسکرائی رہی۔ مسکرائی رہی اور میں.... میرا ہاتھ.... وہ کس.... وہ اپنائیت.... وہ خضنک۔

”عاشرا! تم نے زینیا کو کہا نہیں کہ گھر آئے۔“ امی نے پوچھا۔

”کہا تھا امی!۔“ میں نے فہد کو گود میں ہاتھ سے ہونے کہا۔

”تو پھر وہ آئی کیوں نہیں۔ آج اتوار ہے۔ آج ہی آ جانی۔ تم نے ڈھنک سے کہا بھی نہیں ہوگا۔“

”اب اور کس ڈھنک سے کہتا۔“ میں زج ہو کے بولا۔

”گڑ گڑاتے ہوئے، ہاتھ جوڑتے ہوئے، اللہ کے واسطے دیتے ہوئے۔“

شرمین نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنی کڑوی زبان کے جوہر اگلے، میرا حلق تک کڑوا رہا ہو گیا، گڑ گڑانے، ہاتھ جوڑنے اور اللہ کے واسطے دینے کے مشورے وہ مجھے دے رہی تھی۔ عاشرا ملک کو، میں طیش کے مارے فہد کو ایک طرف اتار کے اس کی طرف بڑھا۔ وہ بہم کے دو قدم پیچھے سر کی۔ امی نے دہل کے مجھے آواز دی۔

”عاشرا! خدا کے لیے بیٹا۔۔۔!“ وہ میرے تہوروں سے ڈر گئی تھیں۔

اور شاید شرمین بھی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ میری خاموشی اور سرخ چہرے سے لیکن ذرا سنبل کے اس نے پھر سے مجھے بھڑکانا چاہا۔

”اتنا عرصہ ہو گیا، باقر کے آفس سے کوئی درگزر تک نہیں آیا۔ یہ تیار و اج نکلا ہے ملازموں کو تک بلانے کے ساتھ، بھٹا کے لاؤ جتانے کا۔“

”وہ ملازم نہیں ہے۔ بہتر ہو گا اپنی یہ سربابہ دار اور زمیندار قسم کی سوچ بدل لو۔ تعلیم تم حاصل کر بھی لیتیں تو تمہارا کچھ نہ بگڑتا۔ لیکن بدلنے والے وقت کے تقاضے تک تمہارے ذہن کو ہوا نہیں لگا رہے۔ وہ بچہ کوالی فائیز اور جیمس سے تم اس کا اندازہ تک نہیں لگا سکتیں۔“ میں نے دانستہ اس پر زینیا کا تعلیم یافتہ ہونا بتلایا تھا۔ اصل میں اس کا اسے معمولی درکار اور ملازمہ کہہ کے بلانا مجھے تاؤ دلا گیا تھا۔

”ہونہر، جنبش ہوگی تو اسے گھر ہوگی۔“ وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی۔ ”میں تو صرف اتنا جاننا چاہ رہی تھی اس طرح ایک غیر لڑکی کے لیے اتنی بے تابی دکھانے کا کیا

مطلب ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے، امی کے پاس اور کوئی ٹاپک ہی نہیں۔ زینیا، زینیا ہو رہا ہے۔“

”اس بات کا تم سے کیا تعلق؟ کیوں بے کار میں الجھنا شروع کر دیتی ہو۔ عادت ہو گئی ہے تمہیں تماشے لگانے کی۔“ باقر بھائی جان بھی کمرے سے نکل آئے۔ ”وہ زینیا کو یاد کریں یا کسی کو بھی، تمہیں کیا تکلیف ہے۔“

”مجھے تکلیف اس بات کی ہے کہ یہ سب مجھے سنانے کے لئے کہا جاتا ہے، مجھ پہ یہ جتانے کے لیے کہ، ایک میرے سوا اور سب کی اہمیت ہے اور اب مجھے ہیں صرف میں ہی بری ہوں۔“

وہ چچی، فہد بہم کے میری ناگوں سے لپٹ گیا۔ میں اس کے بال سہلا کے دھیرے سے اسے الگ کر کے امی کے حوالے کرنے کے بعد گھر سے نکل گیا۔ گھنٹوں بے مقصد گاڑی سڑکوں پہ دوڑانے کے بعد میں تھکے ہوئے وجود اور دل ہونے دماغ کے ساتھ گھر لوٹا تو پورچ میں زینیا کی مردا کھڑی دیکھی۔ بے تابی سے اسے اندر کی طرف بڑھا، وہ جانے کے لیے ننگے ہی والی تھی۔

”بس تم گئے تھے کہ زینیا آ گئی میں نے کہا بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔“

امی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور یہ ذکر کیا تھا، اگر زینیا جان لیتی تو اسے قدموں لوٹ جاتی۔ میں نے سچ کا واقعہ یاد دلانے کی بجائے بے بسی سے محسوس کیا۔ اسی ہر جگہ کے بعد وہ بڑوں کا حال رہتیں، لیکن یہ شاید زینیا کی آمد کا اعجاز تھا۔ میں نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔

”اب میں آیا ہوں، تو تم چل پڑی ہو، کچھ در بیٹھو تو سہی۔“

”نہیں.... پھر کبھی، کافی در ہو گئی ہے۔ پچھو پچھا کیلی ہوں گی۔“ اس نے حتیٰ لچھے میں کہا۔ فہد نے آگے بڑھ کے اس کی انگلی تھام لی۔

”رگ جاکیں نا آئی!۔ اتنا مزہ آ رہا ہے۔“

”مزہ!“ میں نے ادھر ادھر شرمین کو ڈھونڈنا چاہا۔ بھلا اس کے ہوتے ہوئے کیا مزہ آ سکتا تھا۔ وہ تو صرف ”مزہ کھانا۔“ جانتی ہے۔

”باقر اور شرمین کو عید بھائی کی طرف جانا تھا۔ آج ارمین کے دن رکھنے ہیں۔“ چھوٹے ماموں کی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو نا تھی، جو نہ صرف شرمین کی چچا زاد بلکہ خالہ زاد بھی تھی اس لیے خراب موڈ کے باوجود وہ تقریب میں نہ کر سکی۔ فہد کو فلو تھا۔ شاید

اسی لیے وہ گھر پہ تھا۔ اور اب زینبا سے یوں چپکا کھڑا تھا جیسے برسوں پرانی دوستی ہو۔
 ”لگتا ہے خوب گھڑ ہو گیا ہے۔“

”نہد ہے ہی بہت اچھا، بڑا پیارا.....“ اس نے جبکہ کہ فہد کا گل چوما۔
 ”میں پھر آؤں گی، نہد سے ملنے۔“

اس نے بچے کو وعدہ سے بہلایا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں گھر سے نکلا ہی کیوں۔ اگر مجھے ذرا بھی یاد ہوتا کہ شرمین کو تقریب میں جانا تھا تو میں اس پر لعنت بھیجتا ہوا چھٹی کا دن گھر پہ انجوائے کرتا۔ لیکن اس وقت اس سے فرار کے علاوہ اور کچھ سوچا بھی نہیں۔

”نہد تو یوں کھل ل گیا جیسے وہ اس کی گئی ہو۔ سچ ہے، بچہ محبت کا ہوتا ہے۔ جہاں پیارا نظر آئے وہیں کھپتا ہے۔ ان معصوموں سے زیادہ محبت کی پہچان اور کسے ہوئی اور زینبا تو ہے ہی سر سے ہر تک محبت سے گندھی ہوئی۔“ امی نے پھر سے اس کے تعصیہ پر پڑنا شروع کر دیے۔

”لیجئے ابھی ایک ملاقات کا نشانہ نہیں تھا کہ اب وہ پھر سے آپ کو اشارت کر گئی۔“ میں نے ظاہر اُکٹائے ہوئے لہجے میں کہا، لیکن اندر سے میرا دل خوشی سے بھر رہا تھا۔

”خوشی..... کیسی خوشی..... کسی اپنے کی، دل سے بہت قریب۔ حتیٰ کی، تعریف خوشی دیتی ہے۔ شاید اس لیے.... نہیں بلکہ اس لیے کہ اسی کا زینبا کی تعریف کرنا مجھے اپنی تعریف لگتا تھا، مجھے ایسے لگتا تھا جیسے وہ مجھے سہرا رہی ہوں کہ میں نے زینبا کو ڈھونڈ نکالا۔ واقعی..... قابل تعریف تو میں ہوں، جو ان کے لیے ہر لحاظ سے مکمل بہو تلاشتا جاتا ہوں۔ ایک پرفیکٹ لیڈی، آئیڈیل بیوی اور پسندیدہ بہو۔ اگر میں زینبا کو ایسا ہی پانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو سارا کریڈٹ مجھے ہی ملنا چاہیے۔“

”پاپا! کل جو آئی آئی تھیں، انہوں نے مجھے دس اس طرح لگائی کہ میری ناک ایک دم سے کھل گئی۔“

مٹی دنوں سے سینے میں جکڑن اور بند ناک کی تکلیف میں مبتلا فہد کی طبیعت عجیب دیکھ کے باقر بھائی نے ناشے کی ٹیمپل پر اس سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا۔ شرمین سلاکس پہ جام لگاتے لگاتے رُک کے اسے دیکھنے لگی، پھر اس کی سوالیہ نظر میں مجھ سے ہوئی امی یہ جارکیں۔ امی کل کی بدترکی سے خائف تھیں، بوکھلا کے انہوں نے موضوع بدلتا چاہا، لیکن میں نے شرمین کو چڑانے کے لیے فہد سے پوچھا۔

”ارے کہیں مجھے پھر کے کھلا تو نہیں ڈھلی۔“

”چاچو.....! آپ بھی بس.....“ وہ کھلکھلانے لگا ”بھلا دس بھی کوئی کھاتا ہے۔ آئی نے گرم پانی میں دس گھولی۔ میرا منہ اس پہ کر کے زور زور سے سانس لینے کو کہا اور میں ٹھیک ہو گیا۔“

”اور اگر یہ گر جاتا گرم پانی میں، کون سی نیم حکیم آئی آئی تھی، میرے بچے پہ تجربے کرنے کے لیے۔“

”کوئی نہیں شرمین.....! وہ تو زینبا آئی تھی۔ میری خیریت دریافت کرنے فہد کو سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی اس لیے اس نے دس کی بھاپ دی۔“ امی نے وضاحت کی۔

”اوہ تو آخر منت ساجت کر کے عاشر اسے لے ہی آیا۔ ویسے سوچنے کی بات ہے، عاشر نے کبھی کھائے کا سودا کیا تو نہیں۔ پھر اس لڑکی سے ایسا کیا مفاد وابستہ ہے جو یوں سر آنکھوں پہ بٹھایا جا رہا ہے۔“

”کم از کم صحیح تو اپنی کھواس بند رکھا کرو۔“ باقر بھائی جان نے زور سے کپ میز پر ٹپا۔ ”تم کیوں دوسروں کے معاملات میں دخل دیتی ہو۔ جب کہ خود تمہیں اپنے کسی معاملے میں دوسرے کی دخل اندازی پسند نہیں۔ یہ صرف تمہارا گھر نہیں۔ یہاں کون کس سے ملنے آتا ہے۔ کون کس کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ سب تم سے اجازت لینے کے بعد نہیں ملے ہوگا۔“ اب بھائی جان خود ہی کافی تھے۔ کچھ اس لیے بھی میں خاموش رہتا تھا۔

”اگر تم یوں میری بے عزتی نہ کرو تو شاید میری بھی کوئی حیثیت بن پائے، اس گھر میں لیکن میں بیوی ہوں تمہاری اور تم.... تم مجھے بھی ذلیل کرنے پہ تے ہوئے ہو۔“

”تمہاری حرکتیں ہی ذلیل کروانے والی ہوتی ہیں۔ تم خود دوسروں کو ذلیل کرو گی تو بدلے میں ذلت ہی حاصل کرو گی۔“ وہ ناشے سے اٹھ گئے۔

شرمین نے نی پات تاجھ کے دھکے سے ٹیمپل پہ الٹا گرم گرم چائے اچھل کے فہد تک مٹی وہ جج کے پیچھے ہوا اور کرسی الٹ جانے سے نیچے جا گرا۔ میں اور امی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کی طرف لپکے۔ کمرے کی طرف جاتے بھائی جان بھی پلٹ آئے۔ شرمین قہقہے ہوتے چہرے کے ساتھ ابھی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائی بھاگ مٹی۔ فہد حلق چھڑ کے رو رہا تھا۔ میں نے اس کا ریشمی بالوں سے ڈھکا سر ٹٹولا، کسی چوٹ یا زخم کا نشان نہیں تھا۔ کارپٹ ویسے بھی خاصا دبیز تھا وہ امی سے لپٹ کر دھاڑیں مار رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں جان گیا وہ کیوں رو رہا تھا، اسے گرنے سے چوٹ نہیں آئی۔ اس کے اندر کچھ گرا تھا۔

اس روز سارا وقت میرا موڈ خراب رہا۔ وہ کہ فہد کی سسکیاں یاد آئیں۔ میں مضحک سمجھ کر رہ جاتا۔ دل کر رہا تھا، ابھی گھر جاؤں اور فہد کے ایک ایک آنسو کا بدلہ اس سے لوں، اس سے.... فہد کی ماں سے.... اور یہ خیال مجھے ست کر دیتا۔ جو بھی تھا بہر حال اس کی ماں بھی اور میں محض چاچو ہوں، وہ میری نسبت اس پر زیادہ حق رکھتی ہے۔ ”تم آپ کچھ زیادہ ہی اُٹھے اُٹھے سے رہنے لگے ہو؟“ میرے مسلسل عدم دلچسپی کے اظہار پر زمینیا نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اور کوئی کام نہیں میرے بارے میں اندازے لگانے کے علاوہ۔“ میں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ ہمیشہ میرے اندر سے بات اگلوانے میں کامیاب ہو جاتی تھی اور جب بھی میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا وہ جتنی ”درست اندازے“ اس نے بڑے سکون سے سمجھ کی۔ ”تمہاری الجھن کا سبب ضد ہے۔ اس نے پوچھا نہیں، بتایا اس کے کچھ کچھ کے درست اندازے پر میں حیران ضرور ہوا لیکن تسلیم کر کے اسے مغرور ہونے کا موقع دینے کے بجائے میں نے جھٹلانا چاہا۔

”فہد، فہد کیوں۔ وہ ننھا سا بچہ کیسے میری پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔ تم زیادہ سائیکا ٹرسٹ بننے کی کوشش مت کرو۔“
”یعنی تم کہنا چاہتے ہو کہ تم سائیکلک ہو۔“
”واٹ ڈیو یمن۔“ میں چاڑھانے والے انداز میں بولا۔
”میں تم سے صرف بات کر رہی ہوں اور تم مجھے نوک رہے ہو کہ میں ایسا نہ کروں، کیونکہ میں سائیکا ٹرسٹ نہیں ہوں اس کا مطلب تو یہی ہوا ناں کہ تمہیں سائیکا ٹرسٹ کی ضرورت ہے۔“

”میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میرے بارے میں جو اندازے لگاتی رہتی ہو۔ وہ درست نہیں۔ عاشر ملک کو سمجھنا آتا آسان نہیں۔“
”او کم آن، تم کوئی بھجوات نہیں، ایک سیدھے سادے کھلی کتاب کے جیسے نارل سے فرد ہو۔“

”سیدھا سادا، ہلکا ہلکا کتاب ہا ہا ہا.....“ میں دل ہی دل میں خوب ہنسنے لگا تھا تو اس کھلی کتاب میں کیا لکھا ہے۔“

”پہلا نام تو تمہارا اپنا ہے، یعنی سب سے زیادہ محبت تم خود سے کرتے ہو۔“ میں نے پوری کوشش کی کہ میرے تاثرات چہرے پر ظاہر نہ ہوں۔

”دوسرا نام ”امی“ ہیں، اور تیسرا نام فہد کا ہے۔“ اتنا کہہ کے وہ رکی مسکرائی۔ میرے تنے سے اعصاب کو اس غم کا کلس پر سکون کرنے لگا۔ کیا بھی کسی نے کسی مسکراہٹ کا کلس محسوس کیا ہے۔ میں نے کیا ہے۔ ہزار بار کیا ہے۔ ہزار بار جب وہ مسکراتی ہے۔

”تم ان دونوں کی وجہ سے پریشان ہو سکتے ہو۔ لیکن چونکہ امی کی اکثر پریشانیوں کا حل تمہارے پاس ہے یا یوں کہہ لو کہ تم ان کو کم کرنے کا اختیار رکھتے ہو اس لیے میں فہد کا نام لے رہی ہوں کیونکہ تمہاری پریشانی میں ایک طرح کی بے بسی چل رہی ہے جیسے تم چاہتے ہوئے کچھ نہیں کر پا رہے۔“

”لیکن میں کروں گا ضرور۔۔۔۔۔“ میں نے تسلیم بے شک نہ کیا، لیکن انکار بھی نہ کر سکا۔ اس کی قیافہ شناسی کا میں ایک بار پھر قائل ہو چکا تھا۔

واقعی فہد کے وجود سے شرمین کا منسلک ہونا مجھے تکلیف دیتا تھا، وہ مجھے پیارا لگتا تھا۔ دل خود بخود اس کی جانب کھینچتا تھا لیکن اس کی ماں، وہ عورت مجھے اس کی ماں کی حیثیت سے ہرگز قبول نہیں تھی۔ فہد میرے لیے ایک ایسا پھول تھا جو شرمین جیسے کانٹے کی جڑ، وجہ سے میری دسترس سے دور تھا۔ میں اکثر سوچتا..... کیا تھا جو شرمین نہ ہوئی مگر فہد ہوتا..... اور پھر خود بھی اسے خیال پہنس پڑتا۔

”کچھ نہ کچھ تو گھر چاہیے زمینیا۔ میں آج تک باقر بھائی جان اور زمینیا کے تعلق کو سمجھ نہیں پایا۔ دونوں ایک دوسرے سے ہزار ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں پتا نہیں وہ دونوں الگ کیوں نہیں ہو جاتے۔“

”تم اس انتخاب کیوں سوچتے ہو، کیا اس بات کا فہد پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔“
”نہیں وہ بہت سے بڑے اثرات سے دور ہو جائے گا۔ میری بے بسی اور غصے کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب سے وہ پیدا ہوا، امی باپ کیسے مددگس ہیں اس کا دھیان رکھ رہا ہوں وہ دونوں اس کے ماں باپ ہیں مگر صرف کیسے کی حد تک میں پوچھتا ہوں کیا حق ہے انہیں اس بچے کو اپنے پر اپنی جھنڈے کا۔“

”پر اپنی تو تم اسے بنارہے ہو عاشر تمہیں اس سے پیار ہے، تم اس کا خیال رکھتے ہو۔ یہ ایک فطری ہی بات ہے، تمہارا اس سے خون کا رشتہ ہے۔ تم اس کے چچا ہو۔ لیکن تم اس رشتے سے بھی تو اس کے لیے کچھ کر سکتے ہو، تم اس کا سب کچھ کیوں بٹنا چاہتے ہو۔ کیوں یہ چاہتے ہو کہ وہ اپنے ماں باپ کا نہ رہے صرف تمہارا بن کے رہے۔“

وہ کوئی چیز نہیں، انسان ہے۔ انسان کسی کی بھی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ تمہارا اپنا بچہ..... عاشر..... تمہارا اپنا بچہ بھی صرف تمہارا نہیں ہو سکتا۔ اس میں بھی کوئی دوسری ہستی تمہاری حصے دار ہوگی۔ تو فہد تو پھر تمہارے بھائی کا بچہ ہے۔ شرع میں تمہارے لیے کتنی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اسے فہد کی ماں خدا نے بنایا ہے۔ تم اعتراض کرنے والے کون ہو۔“ مجھے اعتراض ہے۔۔۔۔۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”میں اس کے لیے سب اچھا چاہتا ہوں۔ بہترین۔“

”تمہارا مسئلہ پتہ ہے کیا ہے عاشر....! تم ہر چیز صرف بہترین ہی نہیں چاہتے، مکمل اپنی بھی چاہتے ہو۔ بلکہ اپنی دسترس میں۔ اپنی مرضی میں۔ ماں صرف تمہاری، بھائی صرف تمہارا.... یہ کیسے ہو سکتا ہے ماں صرف تمہاری تب ہوتی جب تم اکلوتے ہوتے۔ جب خدا نے ایسا نامعلوم کیا تو تم بھی اس قسم کو کھل دے ماں کو۔ رہی شرع میں..... تو تمہارے تسلط پسند رویے کو کچھ کچھ جانتے ہوئے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کے بجائے کوئی اور عورت بھی تمہارے بھائی کی بیوی ہوتی تم اسے ناپسند ہی کرتے۔“

”کیواس، ہزی کیواس۔“ اس کی ہر بات گچی تھی۔ میرے دل کا چور دیک کے سنتا رہا لیکن آخر میں اس کے اندازے غلط جگہ پڑ گئے۔ مجھے احتجاج کرنے کا موقع مل گیا۔ ”تم دور بھیجیں بس اندازے لگانی رہنا۔ تم یقین کرو۔ وہ اس بچے کو تباہ کر رہے ہیں۔ اگر شرع میں کسی قابل ہوتی، بھائی جان اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن اور خوش ہوتے تو وہ فہد کو بھی توجہ دیتے۔ پیار دیتے، لیکن اس شادی نے انہیں سوائے ٹینشن کے کچھ نہیں دیا، نتیجتاً وہ فہد سے بھی پیڑا ہو گئے۔ ماں اور شرع میں، اسے نہ شوہر سے دلچسپی ہے، نہ اولاد سے، نہ گھر سے۔ مجھے تو لگتا ہے اسے خود سے بھی دلچسپی نہیں۔ اگر اسے کم از کم خود سے ہی محبت ہوتی تو وہ اپنی زندگی خوشگوار بنانے رکھنے کے لیے اور کچھ نہیں تو سمجھو یہی کر لیتی یا پھر..... طلاق لے لیتی۔ بھائی جان کا مسئلہ یہ ہے وہ بنیادی طور پر شریف انسان ہیں۔ یہ رشتہ الٹی کا بنایا ہوا ہے۔ وہ سارے نتائج بھٹکنے کے لیے اس کو آگے کر کے خود ایک طرف ہو گئے ہیں۔ تاکہ کسی دن وہ خود ہی تنگ آ کے اس رشتے کو ختم کرنے کا حکم دے دیں اور وہ تابعداری کا ثبوت دیتے ہوئے یہ حکم بنالائیں کہ جیسی آپ کی مرضی.... آپ نے ہی پہلے باندھی، آپ کی خوشی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ اسی کا بھی ایک مسئلہ ہے وہ وہی صدیوں پرانے مشرقی میکہ نواز وراثت پر مشتمل کا شکار ہیں۔ شرع میں ان کے چسپیتے بھائی کی جیتنی بیٹی ہے۔ لیکن شرع میں کا مسئلہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ وہ چاہے تو آسانی سے آزادی

حاصل کر سکتی ہے۔ بارہوا کہہ چکی ہے کہ یہ شادی اس کے لیے قید ہے، سزائے عمر کی۔ کیوں نہیں اپنے کروڑ بیٹی باپ کے ذریعے اس قید سے چھٹکارا پا جیتی، آئے دن شوہر کو اپنے باپ کے ہاتھوں ذلیل کروا سکتی ہے، تو طلاق بھی لے سکتی ہے۔ لیکن میں نے کہا ناں کہ اسے خود تک سے دلچسپی نہیں وہ اپنے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتی۔“

”دیے اس کی وجہ یہی تو ہو سکتی ہے کہ شرع میں تمہارے بھائی سے بچ مجھ محبت کرتی ہو اس لیے ہزار اختلافات اور تکیوں کے باوجود ساتھ رہنے پر مجبور ہو۔“

”محبت..... اور شرع اور وہ بھی باہر بھائی جان سے۔“ میں دل کھول کے ہنسا۔

”سنئے سالوں میں، میں نے آج تک اس کے چہرے پر محبت کی ہلکی سی رتھ نک نہیں دیکھی ان کے لیے شروع دنوں میں بھائی جان ضرور اس کے دیوانے تھے، آگے پیچھے پھرا کرتے۔ اس کی بے نیازیاں، کج ادائیگیوں کو ادائیں جان کے شمار ہوا کرتے۔ ہر گستاخی بدتمیزی پر دے ڈالا کرتے۔ لیکن وہ اول زور سے ایسی ہے۔ شاید اسی لیے رفتہ رفتہ بھائی جان کی محبت یا کشش، جو بھی کہہ لو۔ مایوس ہوتے ہوتے بالآخر نفرت ہو گئی۔ میں تو اکثر اسی سے کہتا ہوں لوگ اپنی ویڈیو گاہ دوسری مناتے ہیں، انہیں برسی منانا چاہیے۔“ تم سہ سے کہتے کہتے میں نے اسے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

آکھیں اب کسی دشت زدہ رہتی کی آکھیں تھیں۔

”ہیلو.....“ میں نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا ”تم سن رہی ہو۔۔۔“

”آں..... ہاں..... تم کہہ رہے تھے۔ برسی.....“ وہ ہر بزدلی۔

”مجھے یاد ہی نہ رہا۔“

”کیا۔۔۔“

”تم سے ایک بات کرنی تھی۔ اچھا ہوا وقت یہ یاد آگئی۔ پرسوں منڈے کو میں آفس نہیں آ پاؤں گی۔ ایک ضروری کام ہے۔“

”سیدم منڈے کو اسٹر ایک ہے۔ ویسے بھی آفس بند ہوگا۔“ میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

اکٹھی دو چھٹیاں، مجھے بورر کر رہی تھیں۔ منڈے کو تو میں فہد اور امی کو لے کر آؤنگ ہوئے پہ نکل گیا، لیکن منڈے کو شرع میں اپنے سینکے چلنے کی ہمہ فہد کے، اور ایسے ہی موقع ہوتے جب مجھے یہی کا احساس ہوتا۔ کیوں کیوں مجھ سے زیادہ حق کوئی اس پہ جمانے، جس سے میں محبت کرتا ہوں۔

چا کے بعد میں صوفے پہ پڑا جیمل پہ چیلن چیلنج کر رہا تھا، جب میری نظر لاؤنج کی

کھڑکی سے باہر گئی۔ ایک ٹیکسی اندر آ کے رُک تھی۔ میں اُنھ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی میں کون آ سکتا ہے۔ اور زینا کو ٹیکسی سے نکلے دیکھ کے تو میں حیران ہی رہ گیا۔ وہ اندر آئی تو واضح طور پر ڈسٹر بلگ رہی تھی۔ ٹیکسی ٹھہری سی۔

”زینا تم..... ٹیکسی میں.....“ میں اس کے آنے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

”ہاں وہ..... میری گاڑی کل سے درکشاپ میں ہے۔“ اُمی بھی اس کی خبر ملتے ہی کمرے سے نکل آئیں۔ وہ ان سے ملنے کیلئے میں انجی تک الٹا ہوا تھا۔

”خیریت تو ہے زینا، کوئی ایرجی بھی کیا۔ کیسے آنا ہوا۔“

”پاکل ہوئے ہو عاشر، کیا ہمارے گھر آنے کے لیے کسی ایرجی کا ہونا ضروری ہے۔“ اُمی نے ٹوکا۔

”نہیں! ای! دراصل زینا کی گاڑی خراب ہے۔ میرا مطلب یہ تھا اگر کوئی ضروری کام تھا تو مجھے فون کرنی، میں لینے آ جاتا۔“

”کام تو کوئی نہیں تھا۔ بس یونی آپ سب سے ملنے کو دل چاہا اس لیے چلی آئی۔“ شاید میرے ردعمل سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی میں نے اس کے آپ

سب۔“ سے کوئی خوش کن مضمون نکالنا چاہا، مگر اس کے متعلق چہرے نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

”فہد کہاں ہے۔ بہت خاموشی ہے گھر میں۔“ اس نے پوچھا۔

”فہد تو اپنے نانا نانی سے ملنے گیا ہے۔ اسی لیے ہاں بیٹا یوں منہ سے بیٹھے ہیں۔ اچھا ہوا، تم چلی آئیں۔ میرا دل بہل جائے گا۔“

”اور میرا.....“ اس کے لبوں نے نامحسوس حرکت کی۔ ”میں تو فہد سے ملنے آئی تھی۔“

”وہ تو خود جنہیں یاد کرتا رہتا ہے۔ گھر ہوتا تو بہت خوش ہوتا، ارے تم اب تک کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھو.....“ اُمی نے اس کا ہاتھ تھما چاہا۔

”نہیں آئی، میں چلتی ہوں۔ بس میں تو فہد..... فہد سے اچھا خدا حافظ.....“ وہ

ٹوٹے الفاظ ادا کر کے چلی۔ اُمی بھی ہکا بکا گھیس اور میں بھی۔ وہ تو حیرت کی شدت سے اسے روک تک نہ کیں۔ میں ہی پکار بیٹھا۔

”رکو، زینا! میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“ میں نے چاہیاں اٹھائیں۔

”زینا بیٹا! کچھ دور رک جائیں۔“

”میں پھر آؤں گی آئی، ابھی نہیں، ابھی میں۔“ وہ لب کاٹنے لگی۔

سارے راستے وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے ڈرامائیگ کے دوران کئی بار کن اٹھیں۔ اسے اسے دیکھا۔ جگہ بزرگ کا سوٹ ٹکٹوں سے بڑھا۔ دوپٹے کا ایک پلو پیچھے تک جا رہا تھا۔ سوکے لب گیلی پکلیں..... ایسی تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”لو، تمہارا گھر آ گیا۔“ میں نے بریک لگائی اس نے میرا کئی انداز میں لاک کھول کے قدم باہر نکالا، میں اُتر کے تیل دینے لگا۔ ایک سالوئی سی لڑکی نے دروازہ کھولا جو شاید ملازمہ تھی۔

”نہی کھتے چلے گئے سی باجی، خالہ ہوراں بڑے پریشان سی۔“ آپ کدھر چلی گئی تھیں باجی خالہ جی بہت پریشان تھیں! اس نے ہاتھ سے ملازمہ کو پیچھے بنایا اور اندر

بڑھی۔ وہ لڑکی مجھے دیکھ کے منہ کھولے کھڑی رہی۔

”زینا کیا کھیں تھیں؟“ ایک عمر رسیدہ پریشان صورت خاتون آگے بڑھیں اور مجھے دیکھ کے رُک گئیں۔ مجھے اپنے اب تک دروازے پہ ڈھٹائی سے جے رہنے پر سخت خفت محسوس ہوئی۔ میں سلام کر کے کھٹکے کو تھا کر انہوں نے پوچھا۔

”آپ عاشر بیٹا ہو؟“ پتا نہیں وہ مجھے کیسے جانتی تھیں۔ خیر میرے اثبات میں سر ہلانے پہ انہوں نے مجھے اندر آنے کا کہا۔ بظاہر ان کے پر زور اصرار یہ میں اندر

داخل ہو گیا۔

”بیٹا! تم بیٹھو، معاف کرنا۔ میں نماز پڑھ رہی تھی۔ دو قفل رہتے ہیں۔“

انہوں نے چہرے کے گرد بیٹنی چادر اور درست کی۔ ان کے اشارے پہ میں پہلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ سفید اور پیلے رنگ کی آرائش سے آراستہ اس کمرے کی

فضائے حدافردہ تھی۔

گلخانہ میں پہلے رنگ کے گلاب سوکھ رہے تھے اور بیڈ کے کراؤن پہ بڑا سا سن فلار نقش تھا۔ سفید پردوں پہ بھی پہلے گلابوں کے نقش تھے۔ اچانک ہاتھ روم کا دروازہ کھلا

اور سگیلے چہرے کو حقیقتی زینا باہر نکلی آپ وہ قدرے بہتر لگ رہی تھی۔

”ہاں اب بتاؤ، کیوں فرار ہوئیں وہاں سے؟“ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس سے پہلے وہ مجھے کھانگاتی آئی تھی۔ اب میری باری تھی۔

”میں تمہارے گھر سے فرار ہو کر نہیں آئی، بلکہ فرار ہو کر وہاں گئی تھی۔ مگر پناہ نہ ملی۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی میں فہد سے ملتی گئی تھی۔ وہ نہیں تھا اس لیے واپس آ گئی۔“ اس کے کچپکپاتے لہجے سے صاف لگ رہا تھا وہ زبردستی کی یہ بشتاشت پیدا کرنے کے لیے کتنا زور لگا رہی ہے۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں تھا، امی بھی تھیں۔ انہوں نے تمہیں اتنے پیار سے رُکنے کے لیے کہا اور تم باہر نکلتی چلی گئیں۔“

”میں ان سے سواری کہہ دوں گی۔“ وہ مسکرائی۔ میرے ہاتھ سے کسی کا کچپکپاتا نام ہاتھ مس ہوا۔

”لیکن پھر بھی کوئی توجہ ہوگی جو تم بغیر گاڑی کے اتنی پریشان سی حالت میں اور.....“

”تمہیں میرا گھر کیسا لگا..... ارے پھوپھو نے تم سے چائے، کافی کا پوچھا۔“ لہجہ تو کیا ہے ناں تم نے؟“ اس نے میری بات ماننے کے لیے اکتھنے میں چار سوالات الٹ دیئے۔

”میں تمہاری پھوپھو کا نہیں تمہارا مہمان ہوں، لہجہ میں کر کے آیا ہوں۔ کافی کا موڈ نہیں۔ چائے اگر اچھی بنائی ہو تو ضرور پیوں گا۔ اور تمہارا گھر مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔

ہر شے سے اداسی اور یاسیت چپک رہی ہے۔ سفید رنگ پاکیزگی، امن اور سکون کی علامت ہے لیکن تم نے اس میں جا بجا زرد رنگ کی آمیزش کر کے اسے وحشت زدہ سا بنا رکھا ہے۔

میرا بالکل خیال نہیں تھا کہ تم اتنی بد ذوق قسم کی خاتون ثابت ہوگی۔ آفس میں تو.....“

”میں چائے بالکل اچھی نہیں بناتی۔ پھوپھو سے کہتی ہوں۔“ میری بات کا تکی وہ کر کے سے نکل گئی۔ میں بچہ و تاب کھا کر رہ گیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا، آج اس کی شخصیت سے سارے پردے نوج کے رہوں گا، آریا پارا..... کچھ تو فیصلہ ہو۔

اندرونی اندر میرا دل ایک بار سکڑ سا گیا
”اور اگر تمہارا ایک بھی امکان حقیقت نکل آ یا تو.....“

”تو کیا؟“ ”بہتر“ سے بہترین کی تلاش۔“

”اور یہ عامی لڑکی..... جو کسی بھی خاص رنگ کی ہے۔“

”اے اپنا آپ خاص ثابت کرنا پڑے گا۔“

”تم نے بتایا نہیں، اتنا ڈپر قسم کا ماحول کیوں طاری کر رکھا ہے تم نے اپنے گھر پر۔“ اس کے دوبارہ کمرے میں آنے پر میں نے پوچھا۔

”تمہیں یونہی لگ رہا ہے، ظاہر ہے اپنے بچنے کے آگے تمہیں یہ غریبانہ سامکان ڈپریشن کا شکار بنی گئے گا اور میری مسکین سی متاع، بد ذوقی، کا شاہکار۔“ اس نے کھوکھلا قہقہہ لگایا۔

”غریبانہ..... مسکین.....“ میں طنز پر انداز میں چبا چبا کے بولا۔

”جو لڑکی اتنے نامی گرامی بھائیوں کی اکلوتی بہن ہو، ایسی زندگی اس کی اپنی پسند ہو تو ہو، اللہ نے تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔“

”اب تم خدا کی کاموں میں تو دخل اندازی مت کرو۔“ میرے ذوق اور معیار میں جتنے کپڑے نگانے ہیں نکال لو۔“

”تمہارے ذوق اور معیار کا تو میں شروع سے قائل ہوں۔ اسی لیے گھر یہ تمہارا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کے دھچکا سا لگا ہے۔“

خود کو جان بوجھ کر قوطیت پسند بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ جا بجا زرد رنگ، یہ سر ہانے رکھے سوکھے پیلے گلاب، یہ غروب آفتاب کے منظر کی پیٹنگ۔“ میں کھڑا ہو کے جائزہ لینے لگا اور ایک ایک چیز کی نشاندہی کرنے لگا۔

”فیض، ناصر کا لگی اور جون الیسا کے شعری مجموعے، یہ بھیسے شاہ کی کافیاں، یہ نظام علی کی غزلیں اور یہ..... یہ کون ہے۔“

ڈرائنگ ٹیبل پر سلور فریم میں جی ہنٹے مسکراتے بچے کی تصویر دیکھ کے میں نے پوچھا۔

”یہ فہد ہے میرا فہد۔“ وہ یوں ہار مان کے بولی جیسے اب بتا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

”یہ فہد ہے، میرا فہد۔“

میں نے یقین سا ہو کے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے بارے میں سوچ کے رکھے وہ تمام امکان مبرا نہ چرانے لگے۔ کسی حقیقت پسندی سے وہ سب سوچتے ہوئے میں نے

یہ فیصلہ سنایا تھا کہ اگر ان میں سے میرا ایک وہم بھی حقیقت نکلا تو میں زینیا کو اپنے ذہن سے جھٹکنے میں ایک سینڈ کی دیر بھی نہیں لگاؤں گا اور اب بغیر ہلکے جھٹکے میں اس کے جھٹکے سر

اور لرزائی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے اپنی جڑیں ہی میرے اندر بھیلایا رکھی ہوں گی تو بھلا مجھے کتنی دیر اور لگے گی اپنے وجود سے اسے کاٹ پھینکنے کی..... اچانک

اس نے اپنا سر اٹھایا اور تصویر کو دیکھنے لگی وہ شفاف پوتر آنسو..... اور ان سے وضو کرتی چکی چکی آنکھیں..... جڑیں اور تیزی سے پھیلنے لگیں۔ میرے دل میں، دماغ میں، سوچوں میں

ہر طرف ایک جنگل پل ہی پل میں کھڑا ہو گیا۔ میں اس جنگل کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔ جڑیں جلادینا چاہتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بچے کی ماں، طلاق یافتہ یا پھر شاید بیوہ عورت کو میں.....

”میں..... اس کی.....“ کتنی دیر بعد اس کی آواز آئی۔ میں چونک اٹھا۔

”وہ میرا فہد تھا، عاشر.... میرا اپنا.... میرا سب کچھ۔“ وہ بتانے لگی اور میں پورے دھیان سے سننے لگا۔

”میں نے ابھی ابھی بچپن سے دامن چھڑا دیا تھا کہ میری ماما مجھے چھوڑ کے چلی گئیں۔ اس عمر میں میں نے زندگی میں پہلی بار خود کو تنہا محسوس کیا، حالانکہ گھر میں صرف میں نہ تھی، پاپا تھے۔ بڑے بھیا زید فاروق اور چچو نے بھیا زین فاروق تھے۔ میری بیوہ چچو پھوپھی ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہتی چلی آئی تھیں۔ وہ بے اولاد تھیں اور مجھے ہمیشہ سے انہوں نے اپنی بیٹی بنا جانا، کیونکہ جب وہ شوہر کی وفات کے بعد اس گھر میں آئیں تو میں صرف وہ ماہ کی تھی۔

میرا بچپن ویسا ہی گزرا جیسا کہ کسی بھی آسودہ حال مکمل فیملی میں رہنے والے بچے کا گزرتا ہے۔ سمجھا ہوا ماحول، دولت کی فراوانی، محبت کرنے والے ماں باپ، دو قابل فخر بھائی، عمدہ اسکولنگ.... زندگی ایک سیدھے ٹریک پر رواں رواں تھی کہ ماما کی اچانک ڈسٹنڈ ہونا کے رکھ دیا میں تب فرسٹ ایئر میں تھی۔

بھائیوں نے جلد ہی خود کو مستحیال پایا۔ زید بھیا نے سی ایس ایس نمایاں کامیابی کے ساتھ کیئر کر لیا تھا۔ ماما ان کی معنکی اپنی بھانجی سے اپنی زندگی میں گر گئی تھیں۔ زین بھیا کی تعلیم بھی آخری مراحل میں تھی۔

ماما کو گزرے سال بھی نہ ہوا تھا کہ آنٹی نے زویا کی شخصیت کا ایٹو کھڑا کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاپا ان سے، بھیا سے، مجھ سے، چچو چچو سے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے۔ ہم سبھی سمجھتے رہے کہ شاید وہ ماما کے خورا ”بعد گھر میں شادی نہیں رکھونا چاہتے۔ خیر پورے خاندان کے مشورے سے ماما کی پہلی بری کے دو ماہ بعد شادی مقرر ہوئی۔ پاپا حیرت انگیز طور پر سکون نظر آنے لگے۔ اکثر ان کی چچو چچو سے لمبی لمبی میٹنگز چلا کرتیں۔ وہ عموماً انہیں آہستہ آہستہ آواز میں کچھ سمجھا کر تیں وہ بھی تو بے زاری سے اثبات میں سر ہلاتے رہتے۔ کبھی شدت سے نفی میں سر ہلانے لگتے۔ مجھے اس سے زیادہ غور کرنے کا وقت نہ ملا۔ گھر کی پہلی شادی تھی۔

بھیا بھی کو گھر آئے دو ماہ ہوئے تھے۔ اس دن زید بھیا ایک عجیب سی خبر لے کے آئے۔

”زینی! میں مکمل تصدیق کے بعد ہی یہ راز تمہارے سامنے سکھول رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ بابا نے تمہیک گیارہ ماہ پہلے یعنی ماما کی ڈسٹنڈ کے صرف چھ ماہ بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ دوسری بیوی انہوں نے مری والے کا بیٹا میں رکھی ہوئی ہے اور ان کا ہر ویک اینڈ وہیں گزر رہا ہے۔“

”اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ ماما کے بعد ان کا دل گھر میں نہیں لگتا، دوستوں میں وقت گزارتے ہیں۔“

”یہ تو بتا نہیں تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ نہیں، ایک عورت کے پاس دل بہلاتے ہیں۔“ زین بھیا بھی تھلا رہے تھے۔

زویا بھائی کیوں پیچھے رہیں۔

”اور جب میری ماما نے شادی کا مسئلہ اٹھایا تو سب کہنے لگے، ابھی تو آنٹی کو گئے سال ہوا ہے۔ بری کے فوراً بعد شادی رکھ لی..... جب کہ انکل نے تو بری تک کا انتظار نہ کیا۔“

میں اگرچہ صدمے کی کیفیت میں تھی، لیکن زویا بھیا بھی کے منہ سے پاپا کے بارے میں ایسے تحقیر آمیز کھلے اچھے نہ لگے۔ چچو چچو بول پڑیں۔

”میں کس روز آیا! تمہیں اسے سر کے معاملے میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔“

”چچو چچو، وہ بھی اسی گھر کی فرد ہے، وہ بھی اسی صدمے سے گزر رہی ہے۔“ زید بھیا سے بیوی کی بچاری سی شکل دیکھی نہ گئی۔

”اور کیا، کیا مجھے غم نہیں کہ انکل نے آنٹی کی قبر کی مٹی بھی خشک نہ ہونے دی۔ اتنے سالوں کے ساتھ کو آنٹی جلدی بھلا دیا۔“

”دیکھو زویا! عمر نے کوئی غیر شرعی فعل نہیں کیا، نہ ہی کسی کا حق غصب کیا ہے۔ ہاں جوان بچوں کو لاپرواہی کے غلط ضرور ہوئی ہے اس سے اور میں تو اس سے کہتی ہی رہی کہ یہ باتیں بھلا بچپانے سے چھٹی ہیں، خوبی بیٹوں کو اعتماد میں لے لو۔“

”چچو چچو! آپ جانتی نہیں۔“ دونوں بھائی ان سے بھی شاک کی ہو گئے بھیا بھی کو اور موقع مل گیا۔

”اُمی عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ چچو چچو آپ کو اپنی اس بھیا بھی کا ذرا خیال! آہ انکل نے تو خیر بیوی کی وفا میں بھلا ہی دی تھیں۔“

”زویا زیادہ بڑھ چڑھ کے مت بولو۔ ورنہ میں نے کچھ کہہ دیا تو منہ چھپاتی پھرو گی۔ میری بھابی کو خدا جنت نصیب کرے۔ وہ واقعی ایک بہترین عورت تھی۔“

وہ اب اس دنیا میں نہیں اور عمر کو اللہ نے اور مذہب نے حق دیا۔ جس کا اس نے استعمال کرنے کے بعد مجھے صرف مطلع کیا، اس میں کس عورت پر ظلم ہوا۔ اور ہیں وفا میں بھلائے کی بات..... تو وہ جب ہوتا اگر عمر پہلی بیوی کے ہوتے دوسری شادی کرتا جیسا کہ تمہارے بھائی نے کی۔“

”دیکھیں..... دیکھیں.... زید! آپ دیکھیں ذرا پھوپھو کو۔“ وہ شپٹا گئیں۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بڑھ چڑھ کے مت بولو ورنہ، اب تم عورت پر عورت کے ظلم کی بات کرتی ہو، تمہاری بیوی بہن سارہ بھی تو کمال عمر کی پہلی بیوی کو طلاق دلوانے کے بعد بیاہتی گئی ہے۔“

پھوپھو ایسی ہی تھیں، کھری کھری سناتے والی۔

یہ مسئلہ تو پھوپھو کی مداخلت کے باعث دب گیا، اب مرحلہ پایا سے بات کرنے کا، پھوپھو نے اس موقع پر بھی مکمل تعاون کیا۔

پاپا آئے شرمندہ شرمندہ سے، چھپنے چھپنے سے۔ کچھ گلے شکوے ہوئے، کچھ صفائیاں پیش ہوئیں۔ زندگی پھر سنے سرے سے شروع ہو گئی۔ پاپا پہلے کی طرح ہنسنے میں دو تین دن مری گزارنے لگے۔ جب ہم اسلام آباد میں رہا کرتے تھے۔

پاپا کی شرمندگی بھی رفتہ رفتہ زائل ہو گئی۔ لیکن ان میں اور اولاد میں ایک پردہ سا حائل ہو چکا تھا۔ اسی طرح دوڑ خانی سال اور گزر گئے۔ میں نے اپنے بی بی کام کے انگریز امز دے رکھے تھے۔ اور گھر پر وقت گزار رہی تھی۔ زید بیاہتے تھے لیکن زین بھی کی پوسٹنگ آئرلینڈ ہو چکی تھی۔ زویا بھابی کے دو بچے تھے ابھی پھوپھو کے ذریعے اطلاع ملی کہ پاپا کے ہاں ایک اور بیٹا ہوا ہے۔ مجھے بہت عجیب سمجھیں ہوا۔ بھیسا بیٹا یہ فقرے سنا کے رہ گئے۔ زویا بھابی اب پھوپھو کے رعب میں نہ آئی تھیں۔ جود ل چاہتا کر جائیں کہہ جاتیں۔ پھوپھو کا سارا دم اورد بد یہ بھی ہوا ہو چکا تھا۔

جب بھائی نے اپنا ہی احترام اولاد کے آگے کھویا تو وہ اولاد انہیں کیا احترام دیتی۔

پاپا نے فیصلہ سنا دیا کہ اب وہ روہینہ (ان کی دوسری بیوی) اور بچے کومری میں نہیں رکھیں گئے۔ وہ اسی گھر میں رہیں گے، اس فیصلے نے تین سال سے طاری جھجھک اور بھجھوتے کی فضا کو تیس تیس کر کے رکھ دیا۔ دونوں بھائی بھڑک گئے۔ زین بھیا فون پر مسلسل رابطے پر تھے۔ دونوں نے اپنا جوابی فیصلہ سنا دیا کہ یا تو اس گھر میں وہ عورت رہے گی یا پھر ان

کے بیٹے۔

یہ فیصلہ فون پر پاپا کو سنا دیا گیا، انہوں نے کوئی تبصرہ نہ کیا، صرف یہ کہا کہ ہم پرسوں آرہے ہیں۔ زویا بھابی بھی نے اپنا سارا میکہ اکٹھا کر لیا گھر میں اس دن ہمارا سارا خاندان پاپا کو کٹن طعن کرنے کے لیے بیٹھ تھا، زید بھیا بھجھوتے بیٹھے تھے۔

اور پھر وہی ہوا جو پاپا نے کہا تھا اور وہ بھی جو بھیا نے کہا تھا۔

پاپا نے کہا تھا اب وہ روہینہ کے ساتھ رہیں گے۔ وہ دونوں اب ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ ایک کارا ایکسٹنٹ نے دونوں کو موقوف پر ہی ہلاک کر دیا تھا۔

بھیا نے کہا تھا انہیں اس گھر میں جگہ نہیں ملے گی، نہ ان کا ٹھکانہ کہیں اور ہوگا۔ اس گھر میں تو وہ رہیں گے پاپا.... اور پاپا کو واقعی اس گھر میں اب جگہ نہیں مل پائی ان کا ٹھکانا تو اب قبرستان تھا۔

اس عورت کی آخری رسومات کا انتظام دونوں بھائیوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسی گھر میں کیا، وہ پاپا کے ساتھ ہی رخصت ہوئی۔

اس کا باپ، بہن اور دیگر رشتہ دار ہمارے گھر جمع تھے جو شکل سے اور عادات سے بھی اپنا ہلکا پن ظاہر کر رہے تھے۔ یقیناً پاپا ان فریبی لوگوں کے ہاتھ بری طرح ٹریپ ہوئے تھے۔ جب سوئم کے بعد بھیا نے ان لوگوں کو یہاں سے جانے کے لیے کہا تو کچھ عجیب سے حساب کتاب کھلنے لگے۔ بھیا نے دونوں الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اس عمر کی امید مت رکھیں۔ پاپا کی وصیت میں صرف ان تین بہن بھائیوں کا ذکر ہے۔ کسی کو پھوپھو کو زنی تک نہ ملے گی۔ شاید پاپا کو خود زندگی نہ ملے تھی اس لیے وفا کی امید نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ دوسری شادی کے بعد انہوں نے وصیت میں تیریہ کی فی الحال ضرورت نہ سمجھی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تو بھیا کو عدالتی کارروائی کی دھمکی دے سکتے تھے، آخر وہ وصیت تب کی تھی جب انہوں نے ان کی بیٹی سے شادی نہیں کی تھی۔

میرے بھائیوں کے مرتے اور ویشیت سے مرعوب ہو کے وہ دب گئے، لیکن جاتے جاتے ایک ننھا سچندن کا بچہ آگے رکھ گئے۔ بلکہ رکھ کر لٹائے، پھینک گئے یہ کہتے ہوئے۔ ”ہم نے بھی پرانی اولاد میں سچنے کا خشک نہیں لے رکھا۔ اس کا باپ تمہارا بھی باپ تھا، اس کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے جو تمہاری رگوں میں ہے۔ اس لیے تم ہی اسے سنبھالو۔“

بھیا خوب گرے، لیکن وہ کان لپیٹے اس بوجھ کو اتار کر چلتے بنے۔ زویا بھی، زین

بھیانے سوچا، مرتو وہ رہا ہے، یوں ایزیاں رگڑ رگڑ کر لاوارث مرا تو بڑی بدنامی ہوگی۔

مگر وہ بیچ گیا۔ ادھر وادہ مرا سا۔ ایک گردہ ناکارہ ہونے کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا، کمزوری نے اسے تنکے برابر کو چھوڑا تھا، اس میں دوسرے بچوں کی طرح چلا کروانے کی ہمت تک نہ رہی تھی۔ ڈاکٹر ز نے دیے بھی تھے کہ کہا تھا کہ اسے رونے سے ہر ممکن بچانا ہے۔ وہ مرل سا بچہ چھو پھو سینے سے لگائے گھر لوٹیں تو سب شیشا کے رہ گئے۔ چھو پھو نے صاف کہہ دیا۔

”یہ بچہ اللہ نے میرے لیے بنایا ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کو تمہاری ماں سمجھ کے اپنی ممتا کی تسکین کی تھی، ہم لوگوں نے مجھے ماں سمجھنے سے انکار کر دیا تو میرے رب نے مجھے پھر سے ماں بنادیا۔“

کوئی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اماور پاپا دونوں نے ساری عمر چھو پھو کا اتنا احترام کیا تھا کہ ہم لوگ ان سے گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یوں بھی پاپا نے وصیت میں اپنی بڑی بہنوں کے لیے کافی کچھ چھوڑا تھا۔ اگر بھیا انہیں یہاں سے نکل جانے پہ مجبور کر بھی دیتے تو اٹا اٹا ہی کی جگہ بنائی ہوتی، چھو پھو کا کیا نقصان ہوتا۔ زویا بھانجی البتہ ضرور بڑبڑائیں۔

”میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور یہ تو پیدائشی یرقان کا مارا ہوا ہے۔ سارے گھر میں اب ہائپاسیا کے چراغ پھیلیں گے۔“

چھو پھو چپ چاپ آنکسی میں شغف ہو گئیں۔ اماور پاپا کے بعد وہی میرا جذباتی سہارا اور انگلی تھیں، بھیا تو اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔

بھائی نے بھی قریب آئے ہی نہیں دیا ایسے میں چھو پھو بھی جب فہم میں گم ہو کے رہ گئیں تو میں اور اکیلی ہو گئی، میں چھو پھو سے شاک بھی تھی اور فہم سے نالاں بھی۔ ہاں فہم۔ وہ فہم تھا۔ چھو پھو نے اس کا نام فہم رکھا تھا۔ فہم عمر بچہ بچہ اتفاق تھا۔ پاپا نے اپنے نام عمر فاروق مرتضیٰ کے نام کا ایک حصہ فاروق دونوں بیٹوں کے نام کے آگے لگایا تھا اور دوسرا حصہ عمر اپنی بیٹی کے نام کے آگے لگایا تھا اور اب چھو پھو نے بھی اس کے نام کے آگے عمر لگایا۔ پتا نہیں کیوں؟

میں رزالت آنے کے بعد اپنی اسٹڈیز میں بڑی ہو گئی۔ چھو پھو سے انسیت اب بھی وہی کی وہی تھی اگرچہ وہ گھر کے اندرونی حصے سے ذرا دور آنکسی میں رہتی تھیں لیکن گھر کے کینوں سے زیادہ میرا خیال رہتیں۔

بھیا، زید، بھیا سب کا تھلا ہٹ کے مارے برا حال تھا۔ خود میں کوفت اور بیزاری کے طے جلتے جذبات کے ساتھ کارپٹ پر بڑے ننھے سے کپڑے کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے ناگھیں چلا چلا کے خود سے لپٹا لپٹا بیچ کر اپنا تھاب اس کی سوکھی سوکھی زرد ناگھیں ہوا میں چل رہی تھیں۔ اس کے کپڑے حد سے زیادہ لمبے اور بدبودار تھے۔ شاید پچھلے دو تین دن سے انہیں بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔ اس کا پچکا ہوا پیٹ ہر سانس کے ساتھ جلیلوں سے الگ ہو کے بالکل کمر سے جالٹا اس کے نیچے پڑتے ہونٹ اور حلق سے رونے کی کوشش میں عجیب سی خرخراہٹ نکل رہی تھی۔

تمنی ٹھٹھیاں اس زور سے پتی ہوئی تھیں کہ انگلیاں ہر سی سفید ہو رہی تھیں۔ بھائیوں کے عیض و غضب کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف چھو پھو کی نظر چاکاں اس پر پڑی تو تڑپ کے آگے بڑھیں۔ ایک شکایت آمیز سی نظر بھہ پہ ڈالی جو قریب ہی بیٹھی اسے سانس لینے کی جدوجہد میں مصروف دیکھ رہی تھی۔

”غضب خدا کا، اتنے سے بچے کو ٹھنڈی زمین پہ ڈال گئے۔ خون سفید ہو گیا ہے خود خدا تک نہیں رہا، بچے تو معصوم فرشتے ہوتے ہیں ان سے کیا نفرت.....“

مجھے ایسے لگا جیسے چھو پھو پر وہ مجھے سنار ہی ہوں۔ میں پیر پختی اندر چلی گئی۔ بعد میں کسی رشتہ دار خاتون کے تعاون سے چھو پھو سے ہا چال لے کر لیں۔ اس بچے پر یرقان اور نمونے نے اکٹھا حملہ کیا تھا۔ چھو پھو نے ایک بار پھر بھائیوں کے آگے دوہائی دی۔

”کیوں باپ کی کروح کو دکھی کرتے ہو۔ اللہ کا ڈر خوف بھی نہیں ہے، لیکن اس دنیا کا تو خوف کرلو جس میں رہ رہے ہو۔ کل تک تمہارے ساتھ بڑھ چڑھ کے عمر کی دوسری شادی کے خلاف بولنے والے لوگ اب تمہاری بے بسی اور تنگ دلی پہ بھروسہ کر رہے ہیں کیوں خود کو تباہ بنا رہے ہو۔“

اور پھر شاید خوف خدا سے لرز کے، باپ بھیا پاپا کی روح کی تسکین کے لیے یا شاید بیچ بچ دینا کے اعتراضات سے ڈر کے۔ انہوں نے اس کے علاج معالجہ میں خاطر خواہ دلچسپی لے لی۔

اس بچے کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق نمونے نے اس کے پھیپھڑوں پہ اثر ڈالا تھا۔ ساتھ ہی وارد ہونے والے یرقان نے جگر اور گردے تباہ کر دیے تھے۔

لیکن میں نے کبھی ان سے یہ نہ پوچھا کہ انہیں ایک بیمار، چھوٹے سے بچے کو سنبھالنے میں کوئی مشکل تو نہیں پیش آ رہی، فہد کا ذکر ہمارے درمیان آتا مگر یہ کیلطف وہ ہی بتاتیں۔ کل اس نے ساری رات چگا کیا۔ صبح وہ مسکرایا۔ آج اس کی طبیعت بہتر تھی۔ میں چپ چاپ سوتی رہتی۔

رفتہ رفتہ میں اس کے ذکر میں دلچسپی لینے لگی، لیکن میں نے کبھی وہ دلچسپی ظاہر نہ کی۔ رات کو انہی سے آتی تھی مگر کسی سیسیاں مجھے اٹھ کے کھڑکی تک آنے پر مجبور کرتیں اور میں اپنی کھڑکی سے انہی کی کھڑکی کے اس طرف پھوپھو کو گود میں پیراٹھائے تھکیاں دیتے یہاں سے وہاں ٹپٹے دیکھتی۔ اس عمر میں پھوپھو کے یہ رت جگے۔ یہ مشقتیں مجھے بے چین کر دیتے۔

انہوں نے ایک بار بڑے جھکے سے ٹھکھو کیا تھا۔

”رینیا! تم سے، زین اور زید سے میرا رشتہ عمر کی وجہ سے ہے، میں تمہاری پھوپھو ہوں۔ یعنی باپ کی بہن، اور جاتی ہو فہد کی میں کیالٹی ہوں، پھوپھو یعنی اس کے بھی باپ کی بہن ہوں۔ اگر میں نے اپنا بہن ہونے کا فرض ادا نہ کیا تو میں عمر کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ مجھے میرے فرض کی ادائیگی پر مت ٹوکو۔ آخر عمر کے پاس جانے میں وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔“

پھوپھو فہد کو کبھی اپنے ساتھ نہ لاتیں عموماً اسے سلانے کے بعد مجھ سے ملنے آتیں۔ دو دن تک جب وہ نہ آئیں تو میں بے چین ہو گئی۔ مجھے یہی گمان کرنا کہ ضرور اس بچے کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، اس لیے وہ آ نہ گئیں۔ کیونکہ کچھ دن پہلے انہوں نے اس کی بیماری کا ذکر کیا تھا، اسے کوئی دودھ بھی تو سوس نہیں کرتا تھا۔ ایک دو دن میں نے ضبط کیا پھر تیسرے دن اس خیال کی تحت چلی آئی کہ بعد میں پھوپھو یہ نہ کہیں کہ میں ان کا پتہ کرنے بھی نہ آئی۔

یہ تو مجھے خیال تک نہ آ تھا کہ پھوپھو خود بھی بیمار ہو سکتی ہیں۔ ان کی دگرگوں حالت دیکھ کے میں دنگ رہ گئی۔ فہد، ہماری ملازمہ پروین کی گود میں سو رہا تھا اور پھوپھو، نڈھال وجود، متورم سرخ آنکھوں کے ساتھ چارواڑے سے نہیں جانے کی تیاری میں تھیں۔

”بیمار ہو رہا ہے پچھلے چار دن سے۔ ساتھ میں بلڈ پریشر بھی بانی رہا ہے۔ فہد کی بیماری نے مجھے تھکا ڈالا۔ شکر ہے اب وہ کچھ بہتر ہے، لیکن میرا حال برا ہو گیا تم نے بھی.....“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہیں میں نے فوراً صفائی پیش کی۔

”پھوپھو! میرے ٹیٹ ہو رہے تھے، لیکن مجھے یہ گمان بھی تو نہ تھا کہ آپ بیمار ہو گئی۔ دو دن ٹیٹ ہوتے ہی تو میں آ جاتی۔ آپ ڈاکٹر کی طرف جا رہی ہیں، آئیے میں لے چلوں۔“

ڈاکٹر کے پاس تو پچھلے ایک ہفتے سے پتھر لگا رہی ہوں، مگر فہد کے لیے..... اپنی خاطر دیکھ کھانے کی ہمت نہیں، پہلے زید پوچھ لیتا تھا۔ اس کی آنکھ میں لحاظ تھا، اب تو مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے، اس کے سامنے کسی کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہوں، مریب سے گاڑی لے کر گزر جاتا ہے۔

ان کے درد بھرے لہجے پر میں شرمندہ ہو گئی۔

”نی! الجال تو میں چپک جا رہی تھی۔ کچھ پیے نکھائے ہیں۔ فہد کو عام ڈے کا دودھ موافق نہیں۔ ڈاکٹر نے کوئی اور دودھ لکھ کے دیا ہے۔ اچھا خاصا مریب کا ڈے ہے۔ میں آنکھ سے لے کر کھ لیتی ہوں، لیکن اس نے پچھلے دو ہفتے بہت دودھ لیا اس کا معدہ اتنا کمزور ہے کہ اب تک ٹھوس غذا ہضم نہیں کرتا۔ حالانکہ مجھ مریب کا ہو چکا ہے۔ کل پروین سے میں نے سوردے ادھار لے کر ڈے منگوا یا۔ میرا بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار تھا۔ پتھر آیا اور ڈے نیچے گر گیا۔ تقریباً ”آدھے سے زیادہ دودھ ضائع ہو گیا۔ اب سوچا، ہمت کر کے باہر نکلوں، بچے کو بھوکا تو نہیں مارا۔“

میں لرز کے رہ گئی۔ پھوپھو تکلف میں ہیں اس کا اندازہ مجھے تھا، لیکن پھوپھو سے ہمدردی کر کے میں زید بھیا کی ڈانٹ نہیں کھانا چاہتی تھی۔ لیکن اس وقت میں خود کو نرم پڑنے سے روک نہ پائی۔

میں پھوپھو کو پہلے ڈاکٹر کے پاس اور پھر بینک لے کر گئی۔ ڈاکٹر کے مطابق پھوپھو جسمانی کمزوری کے ساتھ ساتھ ذہنی تھکان، نیند کی کمی اور ڈپریشن کا شکار تھیں۔

راستے میں اسٹور بے رک کے صرف پھوپھو کی کھلی اور خوشی کے لیے فہد کی بے شمار چیزیں خریدیں۔ ڈائیزائنڈ بیک، دودھ کے ڈبے، سیر بایک کے فلیور بے بی نوشن، فیڈر، کھلونے وغیرہ۔

میں نے انہیں آرام زیادہ سے زیادہ کرنے کی تلقین کی جو اب وہ فہد کو دیکھنے لگیں، میں نظریں چرا گئی۔ پروین چلی گئی تو پھوپھو کو اپنے سامنے کھانا کھانے کے، دوا پلانے کے بعد میں آہستہ سے وہاں سے نکلی۔ ابھی دوا دے بند ہی کیا تھا کہ فہد کے رونے کی آواز آنی شاید بھوک سے بے تاب ہو کہ وہ جاگ گیا تھا، میں نظر انداز کرنا چاہتی تھی مگر ایک پل سے زیادہ نہ کر سکی۔ اگر میں اندر جا کے اسے نہ بھلاتی، تو پھوپھو جاگ کے اسے

سنبھالنے لگتیں۔ مجبوراً مجھے اندر جانا پڑا۔ اٹھنے کی کوشش کرتی، پھوپھو مجھے دیکھ کے مطمئن ہو کر پھر لیٹ گئیں۔ شاید انہیں یقین تھا میں فہد کو سنبھال لوں گی اور میں نے ان کا یقین نہ توڑا، میں نے فہد کو..... فہد عمر کو اپنے بھائی کو۔ اپنے باپا کی آخری نشانی کو..... اس کی آواز کا بنی۔

”فہد کو پہلی بار پھوپھو۔ میرے جسم میں گرمی کی لہر دوڑ گئی، جیسے ڈھیروں خون شریانوں میں اُمنڈ آیا ہو۔ اسے خاموش کرانے کے لیے بے ساختہ سینے سے لگا کر تھپکا تو جیسے دھڑکنوں میں عاصف اُٹھ گیا۔ میری آنکھیں اُمنڈ آئیں۔ اس کی پٹنی بدلتے ہوئے فہد پر تیار کرتے ہوئے، ٹھنکے پہ لٹا کے دودھ پلاتے ہوئے۔ ہل ہل کر اسے سلائے کی کوشش کرتے ہوئے میں روتی رہی۔ مسلسل روتی رہی۔ وہ سو گیا، میری گود میں بے فکر، منہ میں اگھوٹا دباؤ سو گیا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے اور میرا وجود یک بیک متاسفہ بچک چکا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر اپنا پہلا بوسہ دیا اور میرے لبوں سے اس کی پیشانی تک

ایک انوٹ رشتہ بندہ گیا۔ اب وہ میرا فہد تھا۔“ وہ چپ ہوئی۔ آنکھیں ساکت تھیں، لیکن اب سکرارے تھے، جیسے ابھی ابھی کسی نرم سی پیشانی کے گدگدائے تس نے انہیں ٹھنکے پہ مجبور کر دیا ہو۔ کچھ دیر اسے اسی طرح کم صدم دیکھتے رہنے کے بعد میں ضبط نہ کر سکا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا۔ تمہارے بھائی سے تو یہ برداشت نہ ہوا ہوگا۔“

”برداشت۔“ وہ پھر سے ماضی میں چلی گئی۔

”برداشت تو کیا، وہ تسلیہ کرنے سے بھی تیار نہیں تھے کہ میں حق پہ ہوں اور وہ غلطی پہ۔“ انہوں نے اب پھوپھو سے بھی سارے لحاظ ڈالائے طاق رکھ دیے۔ ان کے مطابق پھوپھو نے مجھے ورغلا یا ہے۔ اور وہ جائیداد کے لیے کمر میں محاذ قائم کرنے کی خاطر مجھے استعمال کر رہی ہیں۔ بہت ہنگامے ہوئے، لیکن میں ڈٹی رہی۔ اتنے بڑے اور ریک الزام نے پھوپھو کو سخت دل گرفتہ کیا۔ انہوں نے مجھے پلٹنے کو کہا اور یہ بھی کہ وہ اکیلے اسے پال سکتی ہیں۔ لیکن میں نے پلٹنے سے انکار کر دیا۔ میرا خون سفید نہیں ہوا تھا۔ وہ تھا پایا کا بیٹا..... زینیا کمر کا بھائی۔ فہد عمر.....

میں نے کوئی پروا نہ کی اور پھوپھو اور فہد کے ساتھ گن ہو گئی۔

وہ اب مجھے پہچانے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کے ہوا میں ہاتھ بلند کر لیں، جیسے اڑ کے مجھ تک آتا جانتا ہو۔ اس نے پہلا قدم میری آنکھوں کے اٹھایا تھا۔ اس کے لبوں سے پہلا لفظ ”آپ“ نکلا تھا وہ چار سال کا ہو چکا تھا۔ البتہ اس کی صحت پہلے جیسی تھی۔ جب اس کی

حالت بگڑتی، میں کانپ جاتی۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر آ کر مایا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی حملہ آور ہونے والے رفاق ان رومونیو اور پھر ابتدائی طور پہ برقی کی لاپرواہی اور غفلت نے اس کی صحت تباہ کر رکھی تھی۔

وہ انتہائی سردیوں کے دن تھے، پھوپھو کی اور میری لاکھ احتیاط کے باوجود وہ پھر سے موئے کا شکار ہو گیا۔ ہاپٹلا نر کرنے کے بعد، ایشیائی بائیوسکس سے بے دریغ استعمال نے اس کے اکلوتے گردے پہ برا اثر ڈالا۔ موئے کے اثرات دور ہو گئے، لیکن ڈاکٹر کے مطابق یہ کردہ اب اس کے جو دکا بوجھ اٹھانے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جسنی طور پر اتنا کمزور تھا اور صحت کی دیگر پیچیدگیاں کچھ اس طرح اس کی جان سے جمنی ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر تبدیلی کردہ کارپیشن کرنے سے ہچکچا رہے تھے اور یہی واحد حل تھا اسے پہچانے کا۔ ڈاکٹر کیمد کے مشورے کے مطابق میں نے شکاگو ہاپٹل میں منیب کے ذریعے اس کی رپورٹ وغیرہ بھیجیں۔ جلد ہی اس کا حوصلہ افزا جواب آ گیا۔ لیکن علاج اور ٹکٹ کے اخراجات میرے اور پھوپھو کے اختیار سے باہر تھے۔

پھوپھو کے نام وصیت میں نہانے کس لیے پایا نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں یہ جائیداد سچ نہیں کتنی تھیں، شاید انہوں نے بیوہ اور بے اولاد بہن کا اس میں کوئی بھلا سوچا ہو کہ کہیں کوئی انہیں پیچھے نہ چھوڑ کر کے خالی ہاتھ نہ کر دے۔ ان کے حصے میں آئی آبابی زمینوں کے علاوہ ایک مکان تھا اور بینک اکاؤنٹ میں چند لاکھ روپے جو اب تیزی سے ختم ہو رہے تھے، بھائی نے ان کی طرف سے بالکل ہاتھ ہٹچ رکھا تھا۔ وہ اتنا عرصہ اسی بینک اکاؤنٹ سے فہد کو پالتی آئی تھیں۔ ”مجبوراً“ ہم دونوں نے زید بھیا کے آگے فہد کی زندگی کے لیے ہاتھ پھیلا دیا۔ اور انہوں نے مرے ہوئے باپ کی لاج نہ رکھی تھی۔

ماں جیسی پھوپھو کی زندگی سے خارج کر دیا تھا تو پھیلے ہوئے ہاتھوں کا مان کیا رکھتے۔ بات چند لاکھ نہیں تھی بات ان کی ضد تھی۔ وہ ہر حال میں فہد کو منظر سے غائب دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے ان کی منت سماجت بھی کر کے دیکھ لی، خون کا حوالہ بھی دیا، خاندان کے چند سر کردہ بزرگوں کی سفارش بھی کرائی، خدا کا خوف بھی دلایا اور واسطہ بھی دیا۔ سب بے سود.....

اب میرے پاس آخری کارڈ تھا اور میں نے اس آخری حرے کو آ زمانہ کا فیصلہ کر لیا، اب میں کوئی سترہ اٹھارہ سال کی بامعجہ لڑکی نہ تھی جو بھائیوں کے نقش قدم پہ چلتی۔

آخر کار زین اور زید بھیا دونوں کی جانب سے صاف انکار سننے کے بعد میں نے وہ آخری قدم اٹھانے کا سوچ ہی لیا۔ پھوپھو نے مجھے بہت روکنا چاہا۔ لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ میں اپنے بھائیوں کی سوسائٹی میں پوزیشن فراموش کر چکی تھی، مجھے صرف فہد کو انصاف دلانا تھا۔ پھوپھو نے ایک بار پھر سمجھنا چاہا۔

”کیوں خود کو تنہا کر رہی ہو۔ نہ ماں ہے، نہ باپ، یہ دو بھائی ہی تمہاری چھت ہیں اور یہی سہارا۔

وہ بے لحاظ اور بے مروت ہو چکے ہیں، اپنی ضد پوری کرنے کی خاطر، ہر قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان کے دل نفرت نے سیاہ کر ڈالے ہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ سمجھو نہ کرلو۔ اگر فہد کی زندگی ہوئی تو تمہیں اس سے کون الگ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر خدا نے اس کی عمر اتنی ہی لکھی ہے تو تمہارے کچھ بھی کرنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں البتہ تم ساری عمر کے خسارے میں رہو گی۔“

”نہیں پھوپھو.....! میں فہد کو یوں بے بسی اور لا چاری سے مرمت نہیں دیکھ سکتی۔“ میں نے تہیہ کر لیا اور اسی شام وہ کیل سے ملی۔ اگلے ہی دن میں نے کورٹ میں فہد کی سرپرست کی حیثیت سے زید فاروق جیسی پر جانبدار میں حصہ کی اپیل کر دی۔ فہد کے وارث ہونے کے دعوے کو ثابت کرنے کی میں نے خوب کوشش کی۔ لیکن جانتے ہو عاشر کیا ہوا.....؟ میں سمجھتی تھی قانون فہد کو عمر فاروق کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے برابر کا حق دے گا میں اسے علاج کے لیے باہر لے جاؤں گی۔

پتہ ہے..... عاشر! بات میرے وہم و گمان سے بھی آگے تھی میں تو کیا مجھے اچھا برا سمجھانے والی پھوپھو تک دنگ رہ گئیں۔

انہیں اپنے بھائی کے خون سے اس بلکے پین کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے تو وہ کیا کہ میں کسی کو یہ بتاتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتی ہوں کہ وہ میرے بھائی ہیں۔ میرے اپنے بھائی۔ میرے اپنے باپ کی اولاد۔ جنہوں نے اپنے ہی باپ کی اولاد کو..... ”وہ اب کانٹے لگی تو میں بے تالی سے کہہ اٹھا۔“

”کیا انہوں نے فہد کو مراد یا۔؟“

”انہوں نے اپنے مرے ہوئے باپ کو ایک بار پھر مراد یا۔“ اس نے پچھلی لی۔

”عاشر انہوں نے اپنے اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے فہد کی ماں کے رشتہ داروں کو خرید لیا اور نکاح نامے کو غائب کرتے ہی عدالت میں یہ ثابت کر دیا کہ فہد ان کے باپ کا ناجائز اولاد تھا۔ فہد کے نانا نے بھی مری ہوئی بیٹی کی قیمت وصول کرتے ہوئے

پچھلی ہٹ کا مظاہرہ نہ کیا۔ میں اتنی حیران ہوئی کہ عدالتی کارروائی کے خلاف احتجاج تک نہ کر سکی۔ مجھے یقین بھی نہیں آیا کہ یہ حرکت میرے تعلیم یافتہ، اعلیٰ نسب خاندانی بھائیوں نے کی ہے۔

میں یہ بدلہ برداشت نہ کر سکی۔ اس دن میں نے اور پھوپھو نے فہد کے ساتھ وہ انوکھی خالی کر دی۔ وقت بہت کم تھا۔ اور فہد کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا واحد گردہ بچنے کی کوشش میں اور بھی پکڑا ہوا جارہا تھا، میں نے دوسرا نگر نہجا۔ آسان راستہ منتخب کیا۔ میں پڑوسی سال کی ہو چکی تھی۔ میری تعلیم مکمل تھی۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور بھائیوں نے لاتعلقی اختیار کرنے کا قانونی نوٹس دے دیا تھا۔ عدالت میں جانے بغیر بڑی آسانی سے صرف ایک نوٹس کے ذریعے میرا وکیل جائیداد میں سے میرا حصہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے اوٹے پونے وہ ساری جائیداد بیٹی، ویزا لگوا لی۔ پاسپورٹ بنوایا، میں پھوپھو اور فہد کے ساتھ جانے کی تیاری میں تھی کہ..... فہد..... عاشر وہ مر گیا۔ عاشر..... میں نے ایک بار پھر صبر کر لیا کیا کرتی اس بار بھی لینے والا اللہ تھا۔ ہاں بھیا کو میں نے خدا نہیں بنے دیا۔ ان کو میں ہر آتی لکھی۔ اتنا اطمینان تو مجھے تھا لیکن فہد..... میرا فہد.....“ وہ گھٹنوں پہ سر رکھ کے رونے لگی میں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کے قریب آ بیٹھا۔

”زیینا! بس کرو اس معصوم بچے کو تکلیف ہو رہی ہو گی۔“

”مجھے یہ احساس کچھ کے دیتا رہتا ہے۔ اگر بھیا اس کے علاج میں تاخیر کا سبب نہ بنے تو شاید آج وہ جی رہا ہوتا۔ پتا ہے آج اس کی دوسری رہی ہے۔

فہد کی وفات کے بعد بھیا مجھے مٹانے آئے تھے، ان کا خیال تھا کہ اب کاٹنا درمیان سے نکل چکا ہے۔ اور اس طرح اکلوتی بہن کا بھائیوں سے الگ رہنا ان کے لیے شرمندگی کا باعث تھا میں نے جانے سے انکار کر دیا۔

ان کے بار بار ٹھکرانے پر میں نے اسلام آباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا رزلٹ آچکا تھا۔ حسب سابق میں نے پوزیشن لی تھی۔

پاپا کی محبت کا قرض اور فہد کی محبت کا تقاضا تھا کہ میں زندگی بھر زید بھیا اور زین بھیا کی شکل نہ دیکھوں، کیونکہ وہ دونوں ان دونوں کے مجرم تھے۔ اور اس کا واحد صلہ تھا کہ میں اپنے بطن کو بچے کی کوشش کرتی۔ اپنی پر اپنی اونے پونے بیچ کے میں ویسے ہی نقصان اٹھا چکی تھی۔ جو بچا وہ سمیٹ کے پھوپھو کے ساتھ لاہور چلی آئی۔ اتنا کچھ تو تھا کہ

بیٹھ کے بھی کھا سکتی تھی، لیکن خود کو بھلانے کے لیے جاب کر لی۔ یہ چھوٹا سا گھر خیرا۔ جاب کرنے سے دوامی دل بہلا۔ تم جیسے دوست ملے۔ ملنا جلنا ہوا۔ پتا چلا کہ دنیا کسی ایک کے جانے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ تمہارے گھر فہد سے ملی تو احساس ہوا میرا فہد دنیا میں ایک ہی نہیں تھا۔ یہاں تو ہزاروں فہد ہیں۔ سب پیارے ہیں۔“ وہ آنسو ایک بار پھر صاف کرتے ہوئے مسکرائے گی۔

”آج اس کی دوسری بری بریں رونہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تمہارے گھر گئی فہد سے مل کے فہد کی یاد کو بھلانا چاہتی تھی۔“

فہد کے بارے میں اور کیا بتاؤں، سوائے اس کے کہ وہ میرا سچ کچھ تھا اب میں بالکل خالی تھا ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔“

”میں ہوں زینا....! میں ہوں تمہارے پاس۔“ میں کہنا تو چاہتا تھا، لیکن خود کو اس سپردگی پر آمادہ نہ کر سکا۔ میرے ہاتھ بڑھے، لیکن اسے سہارا دینے کے بجائے صرف دلاسا دے کر رہ گئے۔ میں اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

”میں نہیں جانتا کہ فرشتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر ہوں گی تو شاید، بلکہ یقیناً! ایسی ہی ہوں گی۔ پاک آنسوؤں سے دھلی پاک آنکھیں۔ یہ آنسو نہ پچھتاوے کے تھے نہ پشیمانی کے نہ دکھ کے، تو بڑے انوکھے سے غم کے انوکھے سے آتے تھے۔ میں دیر تک انگلی کی پورے ہیرے کے کئی کی طرح دیکھنے اس آنسو کو دیکھتا رہا۔“

☆☆☆

”اور آنسو ایسے بھی ہوتے ہیں۔ گدنے، مٹیالے سے بدبودار....!“ اپنی سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے اچانک حال میں واپس آتے ہوئے میں نے اپنی انگلی کی پور کو دیکھا، جہاں کچھ دیر قبل میری بھی آنکھ سے ایک آنسو آزاد ہو کر تھا۔ آنسو خشک ہو چکا تھا.... یا شاید گر گیا تھا اب میری انگلی پر ایک بونٹا سیاہ دھبہ باقی تھا۔

”کیا یہ میرے دل کی سیاہی تھی جو آنسو کے راستے باہر آ گئی۔ آنسو دل کے رستے ہی تو آتے ہیں۔ کیا اپنے دل کی سیاہی مکمل صاف کرنے کے لیے مجھے اور رونا چاہیے۔“

☆☆☆

اس کی اصلیت جان کر میں اب اسے پہلے سے بڑھ کے پسند کرنے لگا تھا۔ بھلے مجھ میں خود خامیاں ہوں، لیکن ہر نارمل انسان کی طرح میرا ایک آئینہ مل تھا۔ خامیوں سے پاک، ہر برائی سے برتر، اعلیٰ ظرف، بلند کردار، مجھوں کی انتہا چھو جانے والا ایک مثالی کردار.... وہ ایسی ہی تھی۔

امی سے اور سب سے بڑھ کے فہد سے اس کا لگاؤ بھی نہیں اور قریب لے آیا اب ہمارے تعلقات آفس تک محدود نہیں رہے تھے۔

وہ تو اپنی تمام زندگی میرے سامنے کھول ہی چکی تھی۔ میں بھی اپنی ہر قابل ذکر پریشانی اس سے شیر کر لے گا۔ لیکن میرے زیادہ تر مسئلے ایسے تھے جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ ان سے میرا اندر عیاں ہوتا تھا۔ زینا نے اپنا آپ اس لیے عیاں کیا تھا کہ اسے اپنے ہونے پر شرمندگی نہیں تھی۔ جب کہ میں..... میں اب گھبرا نہ لگا اپنے اندر کے عاشق ملک سے اپنی پر تکبر شخصیت اور خود غرض فطرت سے۔ ترک کرنے کا حوصلہ اب بھی نہیں تھا۔ بس پردے ڈالنے کا بہتر آگیا تھا۔ میں اپنے غرور سے الگ ہو کے جی نہیں سکتا تھا۔ یہی اگر مجھے اس کے آگے اٹھایا نہیں ڈالنے دے رہی تھی۔ وہ لاکھ اچھی سہی۔ میں اسے اپنی مرغوبیت کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ یہی تو میری غلطی تھی۔

میرا دل اس کے آگے مجھ سے کرتا تھا اور میں خود پہ شرمندہ ہوتا رہتا کہ وہ اس سے..... ایک عام سی لڑکی سے مرعوب ہے۔ اس عام سی لڑکی سے جو زمانے بھر سے خاص لگتی ہے۔ اس کے اسی خاص پن سے متاثر ہونے کے باوجود میرے اندر کا عاشق ملک چاہتا تھا کہ وہ اردوں کے لیے بے شک خاص، بلکہ خاص تر بنی رہے۔ مگر میرے سامنے ایک عام سی لڑکی ہی بن کر رہے۔ عام سی لڑکی، جو راتوں کو میرے خواب دیکھے۔ دن کو میرے خیالوں میں گم رہے۔ میرے نام کی باللا پیچنے والی۔ میرے ساتھ کی دعا میں مانگنے والی۔ میرے نام کی انگوٹھی پہننے کی تمنا رکھنے والی۔ اور اپنے نام کے آگے میرا نام لینے کی خواہش میں جیسے مرنے والی عام سی لڑکی..... میں اس کے عام ہونے کا انتظار کرتا رہا اور پہل میں کتر اتار رہا۔

فہد کے لیے وہ دیوانی تھی۔ شرمین کے بد صورت رویے کے باوجود جتنے میں ایک آدھ بار چاکلیٹس اور کھلونوں کے ساتھ اس سے ملنے آ جاتی۔

اس دن جب وہ فہد سے ملنے آئی تو سوئے اتفاق شرمین پہلے سے کسی بات پہ بھری بیٹھی تھی۔ فہد نے اس کے سامنے اس کا موازنہ کسی بات پہ زینا سے کیا تھا اور اپنی فطری ہنگامہ سازہ دلی سے کام لیتے ہوئے اپنی فیورٹ زینا آئی تو زیادہ مارکس دے ڈالے۔

شرمین سے یہ سچائی مضمون ہو گئی، اس نے نہ صرف فہد کو جھڑکے کر دیا بلکہ زینا کو بھی غائبانہ بے نقطہ سنائیں۔ مجھ سے برداشت نہ ہو۔ میرا بھڑک کے بول اٹھنا اسے مزید مشتعل کر گیا۔ ابھی ہماری کھار جاری تھی کہ زینا کی آمد ہو گئی۔ سارے معاملے سے یکسر انجان وہ بے چاری فہد کا بسورتا چہرہ اور خفا خفا انداز دیکھ کے پریشان ہو بیٹھی اور

صرف اتنا پوچھ بیٹھی۔

”کس نے ستایا۔ میرے بیٹے کو... مجھے نام بتاؤ؟“ اس کا پچکارنا شر میں لگا ہوا تھا۔

”کچھ نہ بھائیاز ہر لیے لکچ میں پھنکادی۔“

میں ہوں نا اس گھر کی واحد ڈائن، میرا ہی منہ سارے اس بے چارے سے بیٹے پہ، آدھیرا کام تمام کرو۔ مارڈالو مجھے۔ فہد کو میرے آسپ سے پھنکارا دو۔“

”آپ... شر... شر میں، یہ آپ کیا کہہ...“ وہ بھونکنی رہ گئی۔

خود مجھے اور ای کو بھی توقع نہیں تھی کہ وہ سارے لحاظ بالائے طاق رہتی ہوئی گھر آئی

مہمان کا تپا نچہ کرنے پہ اتر آئے گی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں، جس طرح تم میری اولاد کو میرے ہی خلاف بھڑکا رہی ہو اس سے تمہارے بارے میں اور کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے۔“ اس کا بس نہ چل رہا تھا

کہ وہ زہینا کو دھڑکے رکھ دے۔

”میں چلتی ہوں۔“ زہینا ابھی بیٹھی تھی کہ چل پڑی۔ منظر سے غائب

ہونے کے سوا اور کوئی چارہ بھی اس کے پاس نہ تھا میں نے آگے بڑھ کے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”ایک منٹ زہینا! تم جاسکتی ہو مگر ایسے نہیں۔ پہلے شر میں تم سے معافی مانگ لگی۔

شر میں تم نے زہینا کی جو انسٹ کی ہے اس کا زائد تمہارے دو لفظوں سے نہیں ہو سکتا، مگر تم

یہ بھی کہہ دو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔“

ای میرے کہنے پہ چپ ہی رہیں، جس کا مطلب تھا زہینا سے ہونے والی بدسلوکی اور شر میں کی بدگیزی انہیں بھی گراں گزری ہے۔ مجھے اور شہلی۔

”تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا۔“ وہ یوں کھڑی تھی جیسے میرا یہ حکم اس کی توقع سے باہر ہو۔ اچانک وہ دھاڑی۔

مقابلہ اس سے کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”تم... تم عاشر...! تم مجھے ہمیشہ ذلیل کراتے ہو۔ تمہارے ہوتے میں کبھی

خوش رہ ہی نہیں سکتی۔ اللہ کرے یا تم مر جاؤ، یا میں مر جاؤں۔“ اپنے بال نوچتی وہ جاہل

عورتوں کی طرح بد دعاؤں پہ اتر آئی۔ اب تک خاموش کھڑی ای نے اسے تنبیہ کی۔

”بند کرو یہ تمنا شر میں! تم میرے سامنے میرے بیٹے کو کوس رہی ہو۔“

”تمہارا بیٹا، تمہارا بیٹا۔“ وہ بدگیزی کی انتہا پہ اتر آئی اور اچانک فہد پہ

لپکی۔ ”یہ تو میرا بیٹا ہے۔ میرا اپنا بیٹا۔ میرا جودل چاہے گا کروں کی کوئی روک سکتا ہے

تو روک لے۔“

اس نے اچانک فہد کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بے چارہ حیرت کی شدت

سے چیخا تک بھول گیا اور کسی بے جان گڈے کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کے جنونی

ہاتھوں کی گرفت میں مار کھاتا رہا۔ زہینا کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ میں اور ای فوراً

”اسے پھرانے کے لیے بھاگے۔ مشکل اس کے ہاتھوں سے فہد کو پھرانے میں کامیاب

ہوئے۔ شر میں سرپٹ بھٹی گئی اپنے سرے میں چلی گئی اور دروازہ لاک ہو گیا۔ زہینا

میرے پکارنے پہ ہی فہد کو برسی آنکھوں سے دھکتی اُلٹے قدموں واپس لوٹ گئی۔

رات کو ساری روانداد باقر بھائی جان تک پہنچی۔ کچھ اسی کے بتانے پر کہ شر میں

نے نہ صرف مہمان کی بے عزتی کی بلکہ ان کے ساتھ بھی تو نکار ہوئی، ان کے بیٹے کو منہ بھر

کے بدعا میں دیں۔ اور کچھ فہد کی حالت دیکھ کے وہ سخت مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے

شر میں سے باز پرس کرنا تک نہ ضروری جاننا اور اس پہ ہاتھ اٹھالیا۔ یہ آخری قدم تھا جو ان

کے ساتھ تعلقات کو تباہ کرنے، ہانے تک لے آیا۔ شر میں اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ فہد کو

بھائی جان نے لے جانے نہیں دیا۔

ایک روز زہینا کو یہ سارا فہد سنایا تو وہ سخت نام نہون ہو گئی۔

”یہ سب بیوی وہ ہے۔ ہوا ہے عاشر۔“ نہیں وہاں آئی، نہ یہ سب بد مزگی پیدا

ہوئی۔“ وہ مناف سے ناگوار رہی تھی۔

”تم آں زہینا! یہ تو ایسا دن ہونا ہی تھا۔ شر میں اور بھائی جان آخر اور کتنا عرصہ اس

تعلق کو بحال نہیں کر سکتے تھے۔ تم خواہ مخواہ کٹنی قتل مت کرو۔ اس پاگل عورت

کو بہانا چاہیے تھا قاتل کھڑا کرنے کا۔“

”کوئی ایسا ہی پاگل نہیں ہوتا عاشر کوئی تو وہ یہ ہوگی۔“

”وہ اس کا حسد تھا اور تسلط پسند رویہ وہ برداشت نہیں کر سکتی کہ فہد اس کا اپنا بیٹا

کامیاب نہ ہو سکیں۔

”عجیب بہت دھرم اور سخت دل عورت ہے۔ مہینہ ہو چلا ہے گھر سے نکلے۔ پلٹ کے شوہر اور بچے کی خبر نہیں لی۔ چلو میاں ہے تو مارا لگی ہے، بچے کے کیا لڑائی۔ کیا بچے کی یاد بے چین نہ کرتی ہوگی اس کم عقل کو وہ تو سارے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی ہے۔ چلو نہ جھگے، ہم ہی جھگ جاتے ہیں۔ ایک بار فون پہ آئے تو سہی، ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لوں گی، بہو رانی سے ٹھیک ہی ہے۔ غیروں کے لیے اسے گھر میں کیوں فساد پیدا ہو۔ اگر اسے نہیں پسند تو میں منع کر دوں گی۔ زینیا کو فہد سے ملنے کے لیے، اگر چاہے تو باقر کے کان بھی اس کے سامنے پہنچ لوں گی۔ مگر بی بی بات تو کرے۔“ وہ مسلسل بڑبڑاتی رہیں۔ میں چپ چاپ سنتا رہتا۔ میری چپ تب بھی نہ ٹوٹی۔ چپ باقر بھائی جان کو شرمین کی جانب سے چلنے کا فون ملا۔ اس انتہائی قدم کی امید کسی کو نہ تھی۔

طلاق کے بارے میں شاید باقر بھائی جان نے بھی نہ سوچا ہو۔ یا شاید وہ سوچ چکے ہوں لیکن بیوی کی طرف سے ملنے والا فون اس کی مراد نہ انا ہے کاری ضرب کا باعث بنا۔ تدبیل کے احساس سے وہ بچھڑے ہوئے تھے۔ ای جان نے بڑی مشکل سے انہیں قابو کر کے ماموں کے گھر فون کیا۔ وہ الگ پریشان تھے۔

”کیا کروں آیا آپاں خود سمجھ نہیں پا رہا۔ اس نے پچھلے ہفتے پہلی بار مجھ سے ذکر کیا میں نے تو ظاہر ہے فوراً انکار کر دیا۔ ڈانٹا ڈپٹا، بھیا بھی کہ طلاق یافتہ عورت کا معاشرے میں کیا مقام ہے۔ لیکن وہ مجھے سے اکھڑ گئی۔ کتنے بچے تیار ہی نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ اس نے خود کشی کی دھمکی دے دی کہ اگر باقر سے اس کی طلاق نہ کروائی گئی تو وہ زہر لھا لے گی۔“

”اور تم دار کئے۔“ امی نے شرم دلائی۔

”جانتے بھی ہو کہ وہ قدر جذباتی اور غصیلی لڑکی ہے، لیکن کم ہمت بھی۔ مرنے کی بات نہیں اس میں، تم اس کی خالی فون کی جھمکیوں میں آکے اس کی زندگی برباد کر رہے ہو۔“ وہ اب کم ہمت نہیں رہی آپا۔ آپ نے محسوس ہی نہیں کیا وہ کتنی بدل چکی ہے۔ فونی ہو چکی ہے۔ لیکن میں تو اسے جھوٹی تسلی سے ٹال رہا تھا۔ لیکن اس نے چپ چاپ اپنے طور پر فون سمجھا دیا۔ اب آپ ہی بتا دیجئے کہ اس میں اتنی ہمت آئی ہے تو اس نے اپنے بل بوتے پہ یہ قدم اٹھایا۔“

”یہ ہمت بھی تم نے ہی دی ہے قاسم! اس کی ہر جا بے جا ضد پوری کی۔ اس کی ہر

ہوتے ہوئے تمہارے زیادہ قریب ہو جائے۔“

”تمہارا تجزیہ کسی حد تک درست ہے لیکن میں اسے فہد والے معاملے پہ لاگو نہیں کر سکتی۔ فہد کے بارے میں وہ لاکھ پٹئی ہو سکتی ایک ماں کے اندر اتنا یقین ہوتا ہے کہ اس کی اولاد صرف اس کی اپنی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ جذبات تو تھا، لیکن اس کی جڑیں کہیں اور گڑی ہوئی ہیں۔“ سوچتی نظروں سے وہ جھٹکتے ہوئے کہنے لگی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو تم۔“ میں چونکا۔

”تم نے ایک بار کہا تھا کہ شرمین کسی سے محبت نہیں کرتی۔ بلکہ کسی سے کیا وہ اپنے آپ سے محبت بھی نہیں کرتی۔ اسے خود سے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں عاشر! کل میں نے جانا ہے کہ تمہارا تجزیہ کتنا درست تھا اور کتنا غلط تھا۔“

اس نے کہیں اپنے منہ سے نکالے گئے دوں شہادت کی انگلیوں کے سرے پہ دکاتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھوں میں اپنی کھوج بھری آنکھیں کا زور دیں۔

”تم صاف بات کر دہیز۔“

”اسے کسی سے محبت ہے عاشر۔“ اس نے ”ہے“ پر زور دے کر کہا۔

”اتنی کہ اس نے خود سے بھی محبت کرنا چھوڑ دی۔ اس محبت نے اسے اس بڑی طرح مجروح کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی تک سے پیزار ہو گئی ہے۔ اس محبت کو نہ تو اظہار کا راستہ ملانے پڑی رائی کا۔ لانا دھکار اور نفرت نصیب ہوئی۔ بدلے میں اس نے بھی اپنی محبت کو نفرت کا پہنا دے دیا لیکن عاشر اندر سے یہ محبت چھین چھیلانے چھوٹی رہی۔ کل اس کی اس محبت نے حسد اور رقابت کی آگ میں جل کے نفرت اور کینے کے احساس سے سلگ کے اپنی ہی زندگی کو ڈس لیا۔ یہ آخری ظلم تھا۔ جو اس محبت نے اس لڑکی پہ ڈھایا۔“

”کیسی محبت۔“

”وہ محبت..... عاشر..... جو شرمین کو تم سے تھی اور ہے۔“ اس نے دھماکا کیا۔

☆☆☆

اس بار شرمین اکیلے گئی تھی۔ فہد گھر پہ ہی تھا اس لیے ابھی تک بھائی جان اس کے پیچھے سسرال تک نہیں گئے تھے۔ کچھ اس بات کی شرمندگی یا خوف بھی تھا کہ ماموں جان کا سامنا کیسے کریں گے۔ اس سے پہلے بھی ان دونوں کے درمیان کئی جھگڑے ہوئے مگر نوبت مار کٹائی تک نہیں پہنچی تھی۔ امی جان سے تو وہ کئی بار ڈانٹا کھا چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان کے کہنے کے مطابق اپنے سسرال بیوی کو منانے کے لیے جانے پہ تیار نہ ہوئے۔ امی جان نے دو تین بار بھائی کے گھر فون کیا لیکن شرمین سے بات کرنے میں

بے وقوفی میں اس کا ساتھ دیا۔ اسے گھر لسانے کی تعلیم دی ہوئی تو اب اس کے کام آتی، وہ تہارے کے لیے بیٹھتی۔“

ای نے ان کی تربیت کو الزام دیا تو اب تک قتل سے بات کرتے ماموں جان بھڑک گئے۔

”بس کیجیے آپا! زندگی میری بچی کی برباد ہو رہی ہے اور باتیں مجھے سننا پڑ رہی ہیں۔ یہ تو میری شرافت ہے جو کل سے معاملہ سنہالنے کی کوشش کر رہا ہوں، ورنہ پہلے تو باقر سے باز پرس کرتا کہ آخر اس نے ایسا کیا کیا کہ میری بچی اس حد تک خود سے اور زندگی سے بیزار ہو گئی۔

اور اگر وہ میرے کہنے میں نہ ہوتی تو باقر سے شادی ہی کیوں کرتی۔ اس نے کتنی بار کہا تھا چاہا کہ اس کی اور باقر کی عمریں بہت فرق ہے لیکن میں نے سختی سے یہ اعتراض رد کر دیا کہ عمر کا فرق تب میرے نزدیک مہم نہیں رکھتا تھا۔

پھر ساری عمر بیٹی سے شرمندہ ہی رہا۔ ہر بار اس کے میکے آنے کے بعد اس کے سوالوں کے جواب دینا پڑے۔ ڈیڑی آپ تو کتنے تھے۔۔۔۔۔

آپا! بات اب میرے بس میں نہیں رہی۔ باقر سے کہیں وہ اگر یہ رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے تو اپنے طور پر کوشش کرے۔ شاید معاملہ دب جائے۔“

بڑی مشکل سے ای جان نے باقر بھائی جان کو کنٹھ واسطے دے کر فون کرنے پر آمادہ کیا۔ ادھر ماموں بھی بمشکل شرمین کو فون تک لاسکے۔ طوعاً کرہاً بھائی جان نے اپنے طرز عمل کی معافی مانگی، آئندہ ایسا کچھ نہ کرنے کی یقین دہانی بھی کرائی۔ جواباً وہ بڑے تسخّر سے ہنسی۔ بھائی جان نے فون کے اسپیکر آن کر کے تھے تاکہ امی کو اندازہ ہو سکے انہوں نے اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے۔

”آئندہ ایسا ہوگا بھی کیسے۔ بس تمہارا اور میرا ساتھ یہیں تک تھا، مسٹر باقر۔۔۔۔۔!“

”شرمین! ابھی ہمارے سامنے زندگی بڑی ہے۔“

”ہاں وہ تو ہے، بلکہ میری زندگی تو شروع ہی اب ہوگی۔ تمہارا نام اپنے نام کے آگے سے کھرچنے کے بعد، میری ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔“

”میں نے تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔“

”تم نے بھی بتانے کی ضرورت بھی تو محسوس نہیں کی۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ کتنے سال پھر سے سر پھوڑتا۔ میں نے تمہیں بے تحاشا محبت دی، مان دیا تمہاری ہر

بات چاہیے وہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو برداشت کی، لیکن تمہاری سرد مہری ختم نہ کر سکا۔ جھٹکلا کر میری محبت بھی بار بار گئی۔ لیکن اگر تم ساتھ دو تو وہ دن پھر لوٹ سکتے ہیں۔ میں سب بھول جاؤں گا۔ جیسے تم پہلے کی طرح مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہو۔ میں پھر بھی تمہیں۔۔۔۔۔“

”مجھے نہیں چاہیے تمہاری یک طرفہ فقیانہ محبت۔“ بھائی جان کی اس درجہ مفاہمت پر بھی اس کا لہجہ نرم پڑا نہ دل۔

”نہیں چاہیے ایسی زندگی جس میں۔۔۔۔۔ میں خود۔۔۔۔۔ کسی کو پیار کرنے کے لیے ترستی رہوں۔ مجھے صرف تمہاری محبت نہیں چاہیے، میں جب خود تم سے محبت نہیں کر سکتی تو تمہارے ساتھ کیسے ہوں کسی طرح؟“

”تم۔۔۔۔۔“ فمکے کی زیادتی سے وہ کچھ بول نہ سکے۔ یہ سب سے بڑا حملہ تھا، جو ایک عورت نے ایک مرد کے پندار پر کیا تھا۔

”تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں، میں خود تم پر تھوکتا تک پسند نہیں کرتا۔ یہ میری ماں کی خواہش بھی اور میرے بچے کی زندگی کا سوال۔ اس لیے تمہیں فون کر لیا۔ تمہیں عزت داس نہیں آتی تو ٹھیک ہے۔ تمہیں طلاق نامہ مل جائے گا مگر صرف۔۔۔۔۔ طلاق نامہ، فہد کا خیال تک دل میں مت لانا۔

وہ صرف میرا بیٹا ہے، صرف میرا۔۔۔۔۔ خرد دار جو اس کے بارے میں کوئی سوال کیا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔ مگر اپنا خون ایسی عورت کے حوالے نہیں کروں گا جو مجھے نفرت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔“

ان کا خیال تھا شاید یہ دھمکی شرمین کو لرزائے رکھ دے گی۔

وہ روئے گی، مگر گڑا گئی، لیکن ایسا کچھ نہ ہوا، چند سیکنڈ وہ چپ رہی پھر اس کی آواز آئی۔

”مجھے منظور ہے، بلکہ میں لکھ کے دینے پہ تیار ہوں کہ میں غلیغلی کے بعد فہد کا مطالبہ ہرگز نہیں کروں گی۔ میرا اوکیل یہ کاغذات تیار کروا کے ثبوت کے طور پر تمہیں بھیجوا دے گا۔ سندر لکھنا۔“

”تم اور تمہارا اوکیل۔۔۔۔۔“ بھائی جان طیش کے مارے گا لیاں سکے گئے۔ امی نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے کر رکھنا چاہا، تاکہ شرمین کے کسی اور اشتعال انگیز فقرے سے کہیں وہ پاگل ہی نہ ہو جائیں۔ لیکن وہ ایک ہاتھ سے انہیں پرے کرتے بولتے رہے۔

”سنہال کے رکھو اپنے وکیل کو اور اپنے کاغذات کو میں لعنت بھیجتا ہوں عدالتوں پر تم میری طرف سے ابھی اسی وقت فارغ ہو۔ لو سنہالو اس آخری تحفے کو۔ تم اسی کے لائق نہیں، تمہیں زورقمانی میں بھی یہی تحفہ ملنا چاہیے تھا۔ طلاق طلاق“ ایک طوفان آ کے گزر گیا۔

ای کی دن فہد کو گود میں لیے آنسو بہاتی رہیں۔ باقر بھائی جان نے خود کو لا پروا ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں میں حیرت انگیز طور پر سکون تھا۔ یہ ہونا ہی تھا بلکہ یہی ہونا چاہیے تھا اس گھر کے لیے۔ ہم سب کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ شریں کا ہم سب سے دور جانا۔

زینا کو بھی اس واقعے کا بے حد افسوس ہوا۔ اس نے مجھ سے اس بارے میں بات کرنا چاہی لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ ”میرا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں، تم کیا جانتا چاہتی ہو۔ یہ باب ختم ہوا۔ اگر تمہیں اس پر اتنا ہی افسوس ہے تو جاؤ جا کے اسی اور بھائی جان سے اظہار افسوس کراؤ۔“

بلکہ! لیکن اس مرے ہوئے رشتے کا پوسٹ مارٹم مت کرنے بیٹھ جانا۔ سوائے رشتہ منقطع کے اور کچھ نہ ملے گا۔“ میں اس بے زاری سے بولا کہ کتنی دیر شاکی نظروں سے مجھے کتنی رہی۔

”تم کس قدر بے حس ہو۔“

”تمہیں آج پتا چلا ہے۔“ میں ہنسا۔ ”میں تو ہمیشہ سے بے حس ہوں۔“

”میں نے کہا تم بے حس بنے ہو۔“ اس نے بڑے پوزور سے کہا۔

”اور اگر میں بے حس ہوں کتنی ضرورت سے زیادہ حساس بنتی ہو۔“

میں نے جڑ کے جوابی کارروائی کی۔ بے حسی میرا پسندیدہ وصف تھا۔ مجھے اس پر اچھا خاصا فخر تھا اور وہ مجھے اس سے محروم ظاہر کر رہی تھی۔ بھلا بے حسی سے بڑھ کے نفرت اور کون سی ہوگی۔ زمانے بھر کا احساس پالے رکھنا تو زری درد سہی ہے۔

”کہہ لو، تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں ہوں جو۔ سوہوں۔“

اس نے پورے اعتماد سے کہنا۔ وہ بوجھی۔ واقعی بس وہ ہی وہ تھی کوئی اور اس جیسا ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ لیکن میں اس سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں تو کل کے خود سے بھی یہ اقرار کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ مجھے اپنے دل کا اس کے آگے متاثر ہو جانا نے والا فردا پانا انداز ذرا پسند نہ آیا۔

کیا قیامت ہے کہ دل جس کا نگر ہے محسن

دل پہ اس کا بھی اجارہ دیکھا نہیں جاتا

زینا کا گھر یہ آتا اور تسلسل سے بڑھ گیا۔ وہ امی جان کی دلجوئی کرنے اور فہد کو سنبھالنے کا فریضہ خوش دلی سے ادا کر گئی۔ وہ دونوں اس کے عادی بننے جا رہے تھے اور میں زینا کو اپنا دونوں کا خصوصاً ”فہد کا عادی بننا دیکھ کے مطمئن ہو رہا تھا، بس اب منزل کچھ ہی دور تھی۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب زینا ایک عام سی لڑکی بن کے میرے آگے اپنی بار بار مان جائی۔ اپنی خاموش محبت کو زبان دینے پہ مجبور ہو جائی۔ مگر وہ دن آ رہی نہیں رہا تھا۔ امی کی کچلی آنکھوں والی پرس بھی مسکراہٹ اب میرے سامنے اور بھی ریٹھ میں ہو جاتی۔ میری ہتھیلیاں اس مسکراہٹ کی لطیف سی گرفت میں جک جاتیں اور مجھے یقین ہونے لگتا۔ عاشر ملک، زینا عمر تمہیں چاہتی ہے۔ ٹوٹ کے چاہتی ہے، اسے چاہنے دو۔ چاہتے رہنے پہ مجبور کرے جاؤ۔ یہاں تک وہ خود ٹوٹ جائے۔ پھر اس ٹوٹی ہوئی عام سی دنیا بھر کو میں اپنے ہاتھوں سے جوڑ کے اس گھر میں عبادوں گا۔ عاشر ملک کا حوالہ دے رہا ہے پھر سے عام سے خاص بن جائے گی، لیکن وہ ٹوٹ ہی نہ پارتی تھی۔ میں نے لاکھ کوششیں کیں۔

دو لفظاں تھیں۔ سرخ گلابوں کا بو اس کے اس کی ٹیبل پہ رکھ کے میں خاموشی سے اپنی ٹیبل پہ آ کے بیٹھ گیا۔ گلاس والے سے اس کے کہیں کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ آئی، ٹھٹک کے بو کے گود کھینچنے لگی۔ پکلیں جھک گئیں۔ دو تین بار سر بالکل ویسے ہی ہلایا۔ جیسے اپنی مسکراہٹ کی لطافت سے خود ہی محظوظ ہو رہی ہو اس کے ہاتھوں میں بو کے تھا۔ جب وہ اٹھ گئی اسے میرے کہیں میں موجود تھی۔

”یہ میری ٹیبل پہ کیا کر رہا ہے؟“ حالانکہ میں نے اپنا نام نہیں لکھا تھا، لیکن وہ براہ راست مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

”سب کی ٹیبل پر کوئی نہ کوئی پھول، کوئی نہ کوئی گلاب پڑا تھا تمہاری خالی تھی، میں نے سوچا کہ تم ویلفٹان ڈسے کا حرا کیوں نہ لو۔“

”بڑی عینایت آپ کی۔ لیکن مجھے یہ مغربی روایات نہ پسند ہیں، نہ میں انہیں باقی ہوں۔ خیر ٹیبل تو آپ کی بھی خالی ہے۔“ اس نے بو کے میری ہی ٹیبل کے ایک طرف رکھ دیا میں ہنسنے لگا۔

”تم ان سرخ گلابوں کے قائل ہی کہاں، تمہیں تو وہ منحوس پیلے گلاب پسند ہیں اچھا ہوتا میں سروس کا پودا اکھاڑا تا تمہارے لیے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”لا نا کیا بہت ضروری تھا۔ ویسے بھی پھول دو موقوفوں پہ اچھے لگتے ہیں، شادی پہ یا میت پہ.....“

”اچھا تو جب تم مرو گی ناں، تو چلیز مجھے ضرور بتانا، میں یہ پھول لے کر سب سے پہلے پہنچوں گا۔“

میں اس کی بے نیازی پہ چڑتا جا رہا تھا۔ کتنی مشکل سے میں نے خود کو اس پیش رفت پہ آمادہ کیا تھا کہ شاید ان گلابوں کی مہک سے محروم ہو کے اگلا قدم وہ اٹھالے لیکن وہ اتنا مذاق اڑائے جا رہی تھی۔

”تم نے شاید غور سے سنا نہیں، میں نے کہا، شادی پہ یا میت پہ تم دوسری جانب کیوں زور دے رہے ہو۔ میری شادی پہ کیا خالی ہاتھ آؤ گے۔“

بیچہ ویٹ گھماتے ہوئے، جیٹری بیک سے ٹیک لگائے، وہ عجیب کریدتے انداز سے پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت کے ساتھ کچھ اٹھوا لینے کی خواہش بھی چمک رہی تھی۔ مجھ پر اچانک انکشاف سا ہوا کہ میری طرح وہ بھی میری جانب سے پہلے کے انتظار میں ہے۔ میں نے اپنے قلعے کے دروازے اوڑھ مضبوطی سے بند کر دیے۔

”خالی ہاتھ کیوں؟، آخر دوست ہوں تمہارا۔ پورا پھولوں کا ٹرک بھجوا دوں گا۔“

میں نے دوست پہ زور دے کے کہا۔ وہ جھکنائیں جاتی تو کیا عاشر ملک کوئی کمزور چیز ہے۔ جو گھٹنے ٹیک دے، مجھے توقع تھی۔ وہ بڑی آس سے پوچھ گئی۔ صرف

دوست..... لیکن اس نے فوراً ہاتھ آگے کیا۔

”تو پھر وعدہ کرو، بلکہ نہ سہی، کم از کم ایسا ہی ایک بوکے ضرور بھیجو..... نہیں بلکہ لے کر آؤ گے۔“

میں نے ایک نظر اپنے آگے پھیلی اس گلابی پتیلی کو دیکھا۔ دل پھر بے ایمان سا ہو کے کہنے لگا کہ اس بوکے سے ایک گلاب توڑ کے اس پتیلی پہ بجا دوں، لیکن میں نے ان سی کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

”وعدہ.....“

☆☆☆

”میں نے سرخ گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔“

میں نے اپنی سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے اس ہلکے گلابی کاغذ پہ انگلیاں پھیریں، وہ دس الفاظ پہ مشتمل فقرہ..... اور وہ فقہ ایک فقرے سے سجا بہم سا خط..... خط ہی باعث تھا، مجھے خود راہنمائی کی اس دلدل سے کھینچ لانے

کا۔

بہت دنوں بعد

تیرے خط کے اداس لفظوں نے

تیری چاہت کے ذائقوں کی تمام خوشبو

میری رگوں میں اندیل دی ہے

بہت دنوں بعد

تیری باتیں

تیری ملاقات کی دھمک سے دہکتی راتیں

اجاڑ آنکھوں کے پیاس پاتال کی تہوں میں

وصال واعدوں کی چاند چنگار یوں کو سانسوں کی آج دے کر

تیرے مہینے مہین لفظوں کی آبشاریں

بہت دنوں بعد پھر سے

مجھ کو رلا گئی ہیں

بہت دنوں بعد میں نے سوچا تو یاد آیا

کہ میرے اندر کی راہ کے ڈھیر پہ ابھی تک

تیرے زمانے لکھے ہوئے ہیں

بہت دنوں بعد میں نے سوچا تو یاد آیا

کہ میں کبھی ہاتھ بدل گیا ہوں

پتھر کے تھہرے

کئی ٹکڑوں میں ڈھل گیا ہوں

میں اپنے سگریٹ کے بے ارادہ دھوئیں کی صورت

ہوا میں تحلیل ہو گیا ہوں

نڈھونڈ میری وفا کے نقش قدم کے ریزے

کہ میں تو تیری تلاش کے بے کنار صحرائیں

نجاے نگر راہ میں کھو گیا ہوں

میں واقعی کھو گیا تھا، نجاے اس نے مجھے کیسے ڈھونڈ نکالا۔ میں تو خود اپنی تلاش

میں تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے کھوج نکالا بلکہ مجھے جھ سے ملوا بھی دیا اور میں عرصے بعد خود

کو دیکھ کے حیران تھا پریشان تھا اور پریشان تھا..... یہ میں ہوں۔ عاشر ملک۔ کیا میں زندہ

ہوں ، کیا میں زندہ تھا اگر تھا تو کہاں رہا.....

☆☆☆

”سوری راگ نمبر۔“

صبح سے پانچواں فون تھا جس پر دوسری طرف سے آتی آواز کو سننے ہی میں سوری راگ نمبر کہہ کے فون رکھ دیتا تھا۔ موبائل پر الگ شور مچا ہوا تھا، آف تو کر کے نہیں رکھ سکتا تھا۔ البتہ نمبر بڑھ کے آن کرنے کی ہمت کوارا نہیں کی۔

آفس کے فون سینک کا ریسپونڈ تار کے رکھ نہیں سکتا تھا، مگر ضروری فون آتے تھے۔ سارا دن یہی تماشا ہوتا رہا۔ آفس سے نکلے ہی میں نے اپنے موبائل سینک کو آف کیا۔ گھر پہنچے ہی امی کو فون سے تاکید کی، کسی کا بھی فون آئے مجھے ہرگز ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اپنے کمرے کے سینک سے میں نے پلگ کھینچ کے الگ کیا اور سکون سے بیڈ پر لیٹ پڑے آئندہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

امی جان سے بات کرنے کا اب درست موقع آچکا تھا، اس سے پہلے کہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو، ان سے بات کر لینی چاہیے۔ یہ بات کتنی ضروری تھی۔ میں جانتا تھا لیکن میں کر دیا گا کیسے، یہ نہ جانتا تھا، آخر کیسے.... کیسے میں امی سے کہتا۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ عاشق ملک کو کسی کی ضرورت ہے.... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

”تو پھر کیا کہوں۔“ میں سوچتا۔ ”یہ تو پھر کیا ہوگا کہ اس گھر کو، آپ کو ہندو زینیا کی ضرورت ہے، ہاں یہ ٹھیک ہے، دل کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور امی اور بھائی پہ احسان الگ کہ ان کی خاطر ایک عام لڑکی کو اپنا بے پر مجبور ہو گیا۔“

اس نکتے پہ دل اور دماغ دونوں متفق ہو گئے۔ دل کی مراد بھی پوری ہو رہی تھی، بغیر جھگڑے آسانی سے سن پسند چیز حاصل ہو رہی تھی اور دماغ کے خود غرض تھا نے بھی پورے ہو جاتے، ایک اور احسان میرے کریڈٹ پہ آ جاتا ، میں نے اگلے روز کا انتظار شروع کر دیا۔

اگلے روز ایک الگ تماشا میرا منتظر تھا۔ آفس جاتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران مسلسل موبائل کی بیپ اور اس پر لکھا نمبر مجھے ڈسٹرب کرتا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ اگلے ایک دو روز تک ایسا ہی ہونے والا ہے۔ میرا انکور کرتے رہتا ہی اس مسئلے کا واحد حل تھا۔ آخر کوئی تک سبک بند دروازوں سے سر پھوڑ سکتا ہے۔ بند دروازے کے اس طرف میں بڑے سکون سے بیٹھا یہ سوچتا رہا، یہ خیال تک نہ آیا، کہ دروازے توڑے بھی جاسکتے ہیں۔ اور دروازہ ٹوٹ ہی گیا۔

میں زینیا سے ہاشی گردپ کا پراجیکٹ ڈسکس کر رہا تھا۔ جس کی پریزنٹیشن کے لیے ہم دونوں کو ہی بل جانا تھا کہ میری سکرپٹری ٹیلم نے انٹرکام پہ مجھے اس کے آنے کی اطلاع دی۔ ایک ٹائیپ کو تو میں بیٹھا کے رہ گیا۔ مجھے تو یقین نہیں تھی کہ اس کی ہمت اتنی بڑھ جائے گی۔ میں نے فی الحال پس منظر میں رہنے کا سختی سے حکم دیا تھا۔ خیر اگر اسے اس معاملے کو اتنی جلدی منانا ہے تو ٹھیک ہے، مجھے بھی ٹینشن مول لینے کا شوق نہیں۔ اچھا ہے جتنی جلدی یہ قصہ تمام ہو۔ لیکن اس طرح.... زینیا کے سامنے سب کے سامنے اس بات کا کھانا میرے لیے درد مند نہیں تھا۔

”کہہ دو، میں میننگ میں ہوں اور یہ بھی کہ یہ میرا آفس ہے، یہاں میں پرسنل میگزین کی ڈسکشن افروڈ نہیں کر سکتا۔“

میں نے سختی سے کہا۔ زینیا لیٹا بھر کے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی اس نے انٹرکام پہ ٹیلم کے ذریعے سن لیا تھا کہ مجھ سے ملنے کو آن آیا ہے۔ اور میں کس سے ملنے سے کٹر رہا ہوں، اس کے خاموش سوال کا جواب میں نے ٹال منوں سے دینا چاہا۔

”پلٹل ہے، وہی فضول کے رونے، پہلے غصے میں اتنا بڑا اور سنگین فیصلہ کر لیا، اب بچے کے لیے تڑپتی پھر رہی ہے۔“

اور دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا۔ شرمین بیچ بیچ ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے اسے روکنے کی کوشش کرتی ہوئی ٹیلم بھی اس کی ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ زینیا بھی پیچھے مڑ کے اسے دیکھنے لگی۔ وہ زینیا کو دیکھ کے وہیں رک گئی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ پرسنل ، بے ترتیب لباس ، بھرے بال اسے اور وحشت زدہ کر رہے تھے۔ آگھوں میں دیوانگی ناچ رہی تھی۔ اب خنک تھے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پہلی بار میں خوفزدہ ہوا۔

میں نے ڈرے ڈرے انداز سے زینیا کو دیکھا۔ شرمین کے تیور میرا بنانا کھیل بر باد کر سکتے تھے۔

”تو..... یہاں بھی موجود ہے، تب ہی.... تب ہی تم مجھ سے ملنے سے کٹر رہے ہو.....“ وہ باری باری ہم دونوں کو دیکھ کے کہنے لگی۔ میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”یہ آفس ہے شرمین! یہاں زینیا نہیں ہوگی تو کیا تم ہوگی۔ اور میں تم سے اس لیے..... میرا مطلب ہے فی الحال اس لیے نہیں ملنا چاہتا تھا کہ میں ایک ضروری میننگ کر رہا تھا، پرسنل بائیں کہیں اور بھی، مگر ابھی وقت ہو سکتی ہیں۔“

”نامکن کا مطلب جانتے ہو تم۔ یعنی کہ اب یہ ہو نہیں سکتا۔ کبھی ہو ہی نہیں سکتا ایسا کیسے کہہ سکتے ہو۔“

تھکے تھکے قدموں سے پیچھے ہٹی وہ دیوار سے جا لگی۔ اس کی منگنی دیکھ کے میری شرمندگی زائل ہوئی اور میرے اندر کا کمینہ انسان پوری طرح طاقتور ہو کے اس کو اور ضرر میں لگانے لگا۔

”میں سب کچھ کر سکتا ہوں شرمین قاسم علی! جب تک تم شرمین باقر ملک تھیں، سب کچھ کرنے کا خیال، بصری خیال ہی رہتا تھا لیکن اب جب کہ تم اپنے نام کے آگے سے میرے بھائی کا حوالہ کھو چکی ہو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں اس نام کو اٹھورا کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں اب میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ سب کچھ میں تمہیں اکیلا بھی کر سکتا ہوں، اور وہ میں نے کیا۔ میں دھوکا بھی دے سکتا ہوں اور وہ میں نے دیا ہے۔ میں جھوٹ بھی بول سکتا ہوں اور وہ میں نے دروغ بولے ہیں۔ میں تمہیں فریب بھی دے سکتا ہوں اور وہ میں نے دیا ہے، میں تمہیں بے وقوف بھی بنا سکتا ہوں اور شرمین وہ تم بن چکی ہو۔“

میں مزے لے لے کر کہنے لگا وہ کرب سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تو وہ سب فریب تھا۔ جھوٹ تھا۔“

”تو کیا چاہتا تھا۔ تم نے عاشر ملک کو کچھ کیا رکھا ہے۔ مجھے کیا لڑکیوں کی کمی ہے، جو میں ایک شادی شدہ بچے کی ماں، ایک بے ڈول سی بھدی عورت کے پیچھے پاگل ہو کے سارے خاندان سے دشمنی مول لوں۔ تم میں سے ہی کیا، جس کے ذمے میں تم میرے ان جھوٹے دھوکے پر ایمان لائے تھیں، تم نے ایک بار بھی سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ تمہارے اندر ایسی کیا بات ہے جو عاشر ملک جیسے انسان کو متاثر کرے۔ تمہارا حسن دھندلا چکا ہے تمہاری خوبصورتی دوندی جا چکی ہے۔ تم ایک برتی ہوئی بلکہ تھوکی ہوئی عورت ہو۔ تعلیم، ذہانت، کردار، اخلاق، آخر کیا ہے تم میں؟ کن ہتھیاروں سے لیس ہو کہ تم مجھے فتح کرنے چلی تھیں۔“

”میں تو سارے ہتھیار ڈال کے آئی تھی۔ میں تمہیں فتح کب کرنے آئی تھی، میں تو اپنا آپ تمہیں دینے آئی تھی۔“

”اور میں کیا کروں کہ تمہارا؟“ میں نے تحارت سے کہا۔ ”مجھے اپنے گھر سے تمہیں دور کرنا تھا اور بس، تمہیں بتا ہے نا کہ مجھے ہر چیز ”بہترین“ چاہیے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا کہ تمہارے جیسی عورت میرے گھر پہرے، میرے بھائی سے وابستہ رہے اور

بظاہر ٹھنڈے لہجے میں لیکن شعلے برساتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے میں نے آخری الفاظ پر زور دے کر اسے کچھ باور کرایا۔

”اوکے عاشر! میرا خیال ہے آج کی میٹنگ کا نام تو ختم ہو گیا ہے، کل میٹنگ میں ملاقات ہوگی ہاشمی جیبر ز میں۔“

زمینا اپنا ٹیک اور فائلز اٹھاتی باہر نکل گئی۔ میرے سر سے ایک خطرہ تو ملا۔ اب میں با آسانی شرمین سے نمٹ سکتا تھا۔ آگے بڑھ کے اس کے بازو کو اپنی آگنی گرفت سے دبوچنے ہوئے میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

”تم سے کہا تھا کہ چپ چاپ بیٹھی رہنا، درحالات قابو میں آجائیں تو میں خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔“

”تمہیں حالات کی فکر ہے، میرا دل قابو میں نہیں آ رہا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان تھام لیا اور بلک اٹھی۔

”اپنے دل اور جذبات پہ قابو پانا سیکھو۔“ میں نے جھٹکے سے اپنی شرٹ اس کے ہاتھوں سے چھڑائی۔

”یہ تم اب مجھے کہہ رہے ہو۔ میں نے تو کتنا عرصہ بند باندھ کر رکھا تھا۔ تم نے ہی مجھے بے قابو کیا اور اب جب میں خود کو بھی سنبھالنے سے قاصر ہوں تو تم مجھے سنبھالنے کا

مشورہ دے رہے ہو۔ مجھ سے کتنا رہے ہو۔ دونوں سے تم میں سے رابطہ کرنے کی کوشش میں ہوں لیکن تم بری طرح آگود کر رہے ہو۔“

”تم کیوں نہیں سمجھتیں ابھی ہمارا ملنا مناسب نہیں ہے، اگر کسی کو شک ہو گیا تو.....“

”ہوتا رہے شک، اب چھپا کر کیا کرنا ہے۔ ہم ساری دنیا سے کٹ کے تو نہیں رہ سکتے۔ تم اب مجھے کیوں دنیا سے ڈرا رہے ہو، تب تو تم نے ہی میرے سارے ڈر ختم کیے تھے مجھے بے خوف کیا تھا یہ کہہ کر کہ تمہیں کسی کی پروا نہیں، کوئی کچھ بھی کہتا رہے، تم مجھے

اپنا کہہ رہے تھے تمہاری یقین دہانی یہ میں نے پا کر.....“

”پہلے کی بات اور کسی۔ مجھے بھی یہ سارا کھیل بہت آسان لگا۔ لیکن تم نے جارحانہ طرز عمل اپنانے کا سارا کھیل لگا ڈیا۔ اب بہت پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ تم نے باقر بھائی سے اور امی جان سے جس طرح کا رویہ اپنایا۔ اب میرے لیے تمہیں اپنا ناؤ دشمن بننا پڑ گیا ہے۔

خیر آسان تو پہلے بھی نہیں تھا۔ صاف بات کہوں تو اب یہ صرف مشکل بلکہ نامکن۔۔۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔

نہیں نکلتے۔ انہیں کھینچ کے اکھاڑنا پڑتا ہے اور میں نے شرین کو اکھاڑ پھینکا تھا۔

☆☆☆

اس دن امی جان نے ایسی بات کی کہ میں نے بے ساختہ خود کو اپنی بروقت پلاننگ پر چی بھر کے داد و پیش کی۔ سب کچھ میرے حسب فضا ہو رہا تھا۔ جیسا میں چاہتا تھا۔
 ”شرین کے جانے سے گھر کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اس نے خود کو گھر کا حصہ بنایا بھی کب تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا اس طرح ہم سب سے کٹ جانا سنا ہی تو ہے۔ باقر کا گھر اجڑ گیا، فہد سے ماں بچھن گئی، جا بے وہ برائے نام ہی کسی، لیکن کبھی تو ماں.... یوں ادھورا مانا جاسا گھر مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔“
 ”تو آپ بھائی جان کی دوسری شادی کروادیں۔ انہیں اس طرح اکیلا تو نہیں رکھنا ساری عمر۔“ میں نے بظاہر انجان جتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے لیکن ابھی اتنی جلدی، نہ میں اس سے یہ بات کرنا چاہتی ہوں اور نہ ہی وہ ذہنی طور پر تیار ہوگا۔ تھوڑا وقت گزرے دوں۔ اگر کامیابی ہو تو میں تمہاری شادی کا ارادہ رکھتی ہوں۔“

میں خاموش رہا۔ فی الحال میں صرف انہیں سننا چاہتا تھا۔ کچھ دیر میرے رد عمل کو کھوجنے کی کوشش کرنے کے بعد امی جان نے سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔

”دیسے تو تمہارے لیے میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔
 لیکن عاشر اب میں تمہاری شادی کا سوچوں تو ذہن میں بس ایک ہی نام آتا ہے۔ زینیا، اس کے سوا اب کوئی سوچتی ہی نہیں تمہارا کیا خیال ہے۔“
 ”میرا خیال۔“ میں چپ رہا مگر اندر سے قہقہے لگا رہا تھا۔

☆☆☆

”تمہارا کیا خیال ہے۔“ زینیا نے مجھے چونکا کے بعد میری رائے طلب کی۔
 اس کا تجزیہ میرے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ میں کچھ کہہ نہ سکا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔

”شرین تم سے محبت کرتی ہے؟“
 اور اب مجھے حیران کر دینے کے بعد وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ ”میرا کیا خیال ہے۔“
 ”میرا خیال.... میرے خیال میں تو تمہارا دماغ خراب ہے ہم نے ایسا سوچا ہی کیسے۔ تم مجھے اس حماقت کی توقع نہیں تھی زینیا!...! سچ تم نے واقعی مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“

میرے فہد کی ماں کہلائے۔“

”تم نے پلاننگ سے فہد کو بھی مجھ سے دور کر دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس سے جدائی اپنے مقدر میں لکھ لی۔“ وہ سسک پڑی۔

پھر تو تم ایسا نہ کرتیں..... میں نے شانے اچکائے۔“ میں نے کچھ بھی تم سے زبردستی نہیں کروا جتی کہ میں نے تو اصرار تک نہیں کیا۔ صرف چند راستے بتائے تھے۔ جن پہ چلنا یا نہ چلنا تمہاری اپنی مرضی پہ منحصر تھا۔ اتنی ہی متا کی ماری ہو تیں تو ٹھکرا دیتیں میرے مشورے کو۔“

میں نے اسے آئینہ دکھایا جو چہرے واقعی اگر وہ خود کچھ مٹی کی طرح میرے ایک اشارے پہ ڈھل نہ جاتی تو میں کیسے کامیاب ہو پاتا، اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچاتا میں۔

”بہت بڑے کھلاڑی ہو تا تم.... ہے نا عاشر ملک۔“ اس نے اچانک اپنے آنسو پونچھے

”بہت اونچا گیم کھیلا ہے تم نے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا ہے۔ تم پھر ”بہترین“ چن چاہتے ہو تو عاشر ملک کبھی اپنے دل کو زیادہ نہیں تو کچھ تو بہتر بنانے کی کوشش ضرور کرنا۔ لیکن میں جانتی ہوں تم ایسا کرو گے نہیں، کیونکہ تم خود میں کسی خامی کو تسلیم کر ہی نہیں سکتے۔ تو اسے سدھارنا تو بہت دور کی بات ہے۔ تم خود کو مرد کہتے ہو، تم نے ایک عورت کو ہر طرح سے تنہا کرنے کے بعد اس کی لاعلمی میں اس پہ وار کیا ہے لعنت ہے تمہاری مردانگی پہ۔“ اس نے زمین پہ جھوکا۔ میری کنکیشیں سلگ اٹھیں۔

”گیت آؤ۔“ میں نے اگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

”دبھی اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں تمہارے پاگل پن کا لحاظ نہیں کروں گا۔ دھکے مار مار کے ساری دنیا کے سامنے تمہارا نشان باندوں گا۔“

”تمہارا تو اب میں بناؤں گی، اور یاد رہے میں تمہاری طرح بزدل نہیں۔ میں تمہیں وارنگ دے رہی ہوں، خود کو بچا سکتے ہو تو بچالو۔ ورنہ تمہاری زندگی میں کچھ بھی بہترین نہیں رہے گا۔ نہ تم.... نہ تمہاری زندگی.... دونوں بد سے بدتر ہوتی جائیں گی۔“ وہ دھمکی دیتی چلی گئی۔

میں جانتا تھا وہ ذہنی طور پہ مفلوج عورت میرا کیا لگاؤ سکتی ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے تو کچھ کر نہ سکی۔ میرا کیا نقصان کرے گی۔ بلکہ میں اب پر سکون تھا، پچھلے دوروز سے اس کی فون کاٹنے جو سڑنس پھیلا رکھی تھی، اس کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ کچھ کانٹے آسانی سے تو

میں اس پر اپنی برائی ظاہر کر رہا تھا لیکن میرے اندر کچھ جل بجھ رہا تھا جیسے کوئی اشارے مل رہے ہوں۔ وہ بات بے بات شرین کا مجھ سے الجھنا، وہ جھجھلانا میری بے نیاز یوں پہ کلنا، رشک کے بارے میں تملکا کے ریمارکس دینا اور پھر اب عرصے بعد زینا نے اس کو اور بڑھا دیا تھا۔ میرا اس کی جانب جھکاؤ شاید وہ بھانپ گئی تھی اور ای جان کے ارادے کی سن گئی تھی مل گئی ہو اس لیے اس کی آمد اسے مشتعل کر رہی تھی تو کیا واقعی.... سچ شرتین مجھ سے، مجھے سوچ میں دوبارہ دیکھ کے وہ نامدمی ہو گئی تھی۔

”سوری عاشر! شاید میں نے واقعی بغیر سوچے سمجھے کچھ بول دیا، تمہیں جو ذہنی کوفت ہوئی۔ میں اس کے لیے معذور۔“

”معذرت بعد میں پہلے یہ بتاؤ یہ تمہیں سوچھی کیسے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ اصل میں میں خود یہ یقین چاہتا تھا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔

”پتا نہیں کیوں بس مجھے ایسا لگا، حالانکہ تم نے پہلے بھی کئی بار بتایا تھا کہ تمہارے بھائی جان کے اور اس کے تعلقات ہمیشہ سے خراب ہی رہے ہیں، لیکن اس طرف میرا دھیان نہیں گیا کہ ہو سکتا ہے شادی سے پہلے اس کی جذباتی وابستگی کسی اور کے ساتھ رہی ہو، لیکن عاشر بالفرض ایسا ہو بھی تو پانچ چھ سال بہت ہوتے ہیں دل کو سمجھانے کے لیے اگر کسی کی یاد بھلانے میں کوئی عورت ناکام بھی رہے تو محسوس تو کر ہی سکتی ہے۔ اپنے لیے نہ کئی اپنی اولاد کے لیے ہی سہی۔“

لیکن مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ تمہارا اس سے رشتہ کیا ہے، تم اس سے لاکھ تنفر سہی مگر بہر حال اس رشتے کی اپنی ایک نزاکت ہے، اپنے تقاضے میں نہیں جو کوفت.....“

”تم میری کوفت اور جذبات کو مارو گولی۔ میں صرف یہ جانا چاہتا ہوں کہ آخر تم نے کیا اندازے لگائے۔“

میں نے بے تابی سے پوچھا لیکن اس کی حیران شکل دیکھ کے بات بنائی۔

”آخر مجھے بھی تو پتا چلے تم میں ماہر نفیات بننے کی کتنی صلاحیت موجود ہے؟“

اصل میں میں خود کو یقین دلانا چاہ رہا تھا کہ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے، میں وہ سب جانا چاہتا تھا جنہیں اب زینا وہم فراروے کر شرمندہ ہو رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ بے معنی سے

وہم.... ان سے میں کچھ معنی ڈھونڈ ہی نکالوں۔

بھی اپنے شوہر سے یہ مطالبہ نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے اس گھر میں کچھ تو ہے جس کی کشش اسے باہر نہیں نکلنے دے رہی۔ دوسری بات میں نے ابھی کہا تھا کہ اگر اس کا تعلق کسی اور سے ہوتا تو بھی اس شادی کے بعد وہ جھجھکیلی جاتی۔

تیسری بات اس کا شکستہ رویہ اور دل چلا انداز یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اس کی یہ وابستگی ایک طرف ذہنی، وہ ہمیشہ ہلکی ہوئی، شکلی ہوئی نظر آتی تھی۔ خصوصاً..... جنہیں سامنے پا کے وہ اور بھی سلگ اٹھتی تھی۔

چوتھی بات.... فہد کا میری طرف جھکاؤ، وہ برداشت نہیں کر سکی۔ لیکن یہی رو یہ اس نے تمہارے ساتھ بھی رکھا۔ جب تم نے غصے میں میرے مقابلے میں اس کی چند خامیاں گنوائیں۔ جنہیں یاد ہے ناں اس نے کہا تھا کہ.... عاشر تم مجھے بھی خوش نہیں رہنے دو گے۔ تمہارے ہوتے میں خوش رہ ہی نہیں سکتی۔ اس وقت اس کے انداز میں غصہ تھا، نہ دلچسپی صرف بے کئی تھی۔ ہاتھی اور یہ بار کئی ایسی ویسی جنگ کی بار نہ تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ خود سے لڑ رہی ہے اور جان بوجھ کے ہار مان رہی ہے۔“ وہ چپ ہو گئی۔ تو میں نے غصہ کرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”بس باکوئی یا پوچس بات بھی ہے۔؟“

اس کے کئی میں سر ہلانے پر میں نے سرفاکی پہ جھکا لیا اور بڑے اٹہناک سے اسے دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کئی اور میں نے بھی غافل سے سر اٹھا لیا۔ اب میں اپنے لیکن میں اپنے شاطر دماغ کے ساتھ تھا۔ اس کے وہ چار نکلتے میرے ذہن کو کئی راہیں

اے گئے۔ مجھ پنے نئے راز مختلف ہونے لگے۔

پہلی بات

ہو اس سے ملوک، واقعی نارمل نہیں تھا، لیکن اس کی ایک وجہ تھی اپنی مین اتج میں اس نے تعلق اپنے دل میں جو جذبات دیکھ چکا تھا وہ مجھے اس کو بطور بھائی تسلیم کرنے نہیں دیتا تھا۔ یقین نہ نہیں بہ سنا تھا کہ میں اس سے شادی کا فیصلہ کرنا بتائیں۔

اس سے باوجود مجھے بھائی جان سے اس کی شادی ہونا اپنی سبکی لگا۔ ایسے لگا جیسے اس نے مجھے ملکر لے اٹھیں منتقب کیا ہو۔ فطری ہی بات تھی، میری جی کی محبت بیزاری میں ڈھل گئی۔ مجھے اس کا اپنے گھر میں چلنا پھرنا زہر لگنے لگا۔ وہ جس رشتے میں بندھ چکی تھی اس رشتے کے حوالے سے میں اسے عزت و احترام دینے سے قاصر تھا۔ لیکن اس کا رویہ.... وہ تو واقعی عجیب تھا، جراتی ہے میں نے بھی اس پر غور کیوں نہیں کیا۔ کیا وہ بھی

سے قبول نہیں کر پائی۔

دوسری بات.....

دیکھا جائے تو بھائی جان میں کیا کی تھی، وہ خاصہ کامیاب برنس میں تھے۔ فطرتاً شریف اور بھلے ماس انسان تھے۔ شروع کے سالوں میں انہوں نے بیوی کو نوٹ کے چاہا بھی تھا۔ ایک خوبصورت سا بچہ بھی اس تعلق کا تھوڑا تھا، لیکن اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے دل میں شوہر کے لیے جگہ نہیں پیدا کر سکی۔ اگر مالی آسودگی، وفا دار شوہر، صحت مند بچہ، بھی اسے اس زندگی کی جانب راغب نہیں کر سکا تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اس کے دل کی لک اسے زندگی کی طرف لوٹنے نہ دیتی تھی۔ اور یہ لک دینے والا اس سے کبھی دور نہ ہوا تھا۔ ورنہ شاید وہ اسے بھول جاتی۔ اور اس کے پاس ہونے نے اسے سمجھوتوں کے قریب نہ ہونے دیا۔

تیسری بات.....

چونکہ میرا دل اس کے رشتے کو کبھی تسلیم نہیں کر پایا تھا، اس لیے میرے اس سے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ جب ریشم کے معاملے میں اس نے اُبی جان سے چند طفرے باتیں کہیں تو شاید وہ بھی اس کے جذبات کی ترجمان تھیں اس سے برداشت نہ ہوا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اسی گھر میں میری من پسند ہستی کو بسا دیکھے۔ اس کا مغرور اور تکبرانہ انداز مجھے وہ چیلنج کرنے پر مجبور کر گیا تھا کہ میں ہر حال میں اس سے لاکھ دو بے بہتر شریک حیات پسند کر کے رہوں گا۔ میرا اس کے لیے حکم کھلا اٹھارہ پانچ سو بیس لاکھ ڈالریں لگا جاتا ہو گا اسی لیے زینیا کو وہ مل سکتی ہوئی، جھلکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

چوتھی بات.....

جس طرح میں نے سب کے سامنے اس کی خامیاں اور زینیا کی خوبیاں گواہیں اسے لگا اب اس کے پاس امید کی کوئی کرن نہیں رہی۔ اس لیے وہ بے بسی کی انتہا پہنچی۔ وہ ہار گئی۔ اسے ہی جذبات کے ہاتھوں شکست کھانی تھی اس نے، اسی لیے اس کا اندر لگا ایک عیاں ہو گیا۔ وہ ایک لڑش زینیا کی کچڑ میں آ گئی۔

میں نے اس کی کچڑ کو بے ساختہ داد دی۔ رہا میرا عمل تو وہ زینیا کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لیے ضروری تھا۔ میں اس میں کامیاب رہا تھا وہ اپنی انتہا نے میں کبھی بات یہ معذرت طلب کر لی، واپس چلی گئی لیکن میرے لیے ایک دلچسپ کھیل کا آغاز کر گئی۔ زینیا نے ہی میرے اندر کے عاشق ملک کو تھپک تھپک کے سلایا تھا۔ چاہے جانے کا خواہاں عاشق اب چاہتے کا لطف ہی لینے لگا تھا۔ میری خود پسندی اب چپکے چپکے اس کی اور کبھی

میرا بننے لگی تھی۔ میں اپنی ذات سے نکل کے کسی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

اور وہی زینیا عمر اس دن پھر سے اس عاشق ملک کو سمجھوتہ کے جگا گئی۔ وہ عاشق، جس کے لیے چاہے جانا ایک نشہ تھا، جسے دوسروں کو روندنے میں مزا آتا تھا۔ جسے خود پر حاوی ہوتے ہر انسان کو کچل دینے کی خواہش تھی۔

اس عاشق ملک نے ایک عجیب سی چال سوچی۔ اور اس پر عمل کرنے میں ایک دن کی دیر بھی نہ لگا گئی۔ میری پہلی فون کال پر شرمین مجھ سے بات کرنے پر رضامند ہی نہ ہوئی مگر دوسری ہی کال میں جب میں نے اس سے یہ کہا کہ میں اس سے اس کے شوہر کے بھائی کی حیثیت سے نہیں، اس دوست کی حیثیت سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ جس دوست کے ساتھ اس نے بچپن سے لڑکپن تک کا سفر طے کیا تھا۔ تو وہ نرم پڑ گئی۔ میں نے اسے ہمدردی کے جال میں پھنسا دیا۔ پچھلے اپنے طرز سلوک کی وضاحت کی کہ اس کی وجہ ایسی ہے جس کا ذکر کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میری اس بات پر چونک کے وہ یہ وجہ دریافت کرنے لگی جسے بڑی خوبصورتی سے ٹالنے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا۔

”تم میری وجہ سے اپنی زندگی مت برباد کرو اپنے کھلوٹ آؤ، تمہارے بچے اور شوہر کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں تو بس ایسے ہی ہواں کہ تمہارا ہوں۔ میری وجہ سے تم کیوں.....“

”تمہاری وجہ سے..... ہاں تمہاری وجہ سے.....“ وہ دوبار بولی۔ ”صرف اک تمہاری وجہ سے۔“

”دراصل..... اب میں تم سے کیا کہوں۔ اصل میں شرمین مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں، یہ تو ساری قسمت کی بات تھی اور میں نہیں الزام دیتا رہا اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی سزا دیتا رہا اب تمہیں بھلا کیا پتا تھا کہ.....“

میں خود یہ مصنوعی قوطیت طاری کرتے ہوئے اچھے اچھے ڈائلاگ جھڑتا رہا اور وہ ٹریپ ہوئی رہی۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو عاشق؟“ اس کے لہجے میں اب واضح ارتعاش تھا، ایک ہجیان تھا

”میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میری سب بدتمیزیاں، گستاخیاں بھلا کے گھروٹ آؤ۔ تم نے کہا تھا کہ صرف میری وجہ سے تم وہاں خوش نہیں ہو۔ تو دیکھو تمہاری خاطر میں یہ کر رہا ہوں کہ اپنا گھر، شہر، بچہ جو یہاں سے دور چار ہوں، اگر میں یہاں رہا تو پھر تمہارے لیے مشکلات کھڑی کر دوں گا۔ مجھے خود یہ بس نہیں رہتا۔ تمہارے

نے تاخیر کیوں کی۔ میں تمہیں ہمیشہ اس گھر میں دیکھنا چاہتا تھا مگر اس حیثیت سے نہیں جس حیثیت سے تم آج یہاں ہو بلکہ..... شرمین یہ نفرت نہیں بلکہ محبت ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میری یہ محبت تمہارے لیے سزا بن گئی ہے۔“

یہ سراسر ٹھونسا اظہار محبت کرتے ہوئے نہ میری زبان لڑکھائی، نہ دل کا تپا، نہ ہی میری گھنڈی فطرت کو کوئی گزند پہنچا۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ بچہ بولنے کا صرف سوچنا ہی تھا اور میرے خود ساختہ بت میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ اس وقت اگر میں اس کے سامنے سر جھکا کر یہ کچے ریشم کے جال بن رہا تھا تو صرف اس لیے کہ بعد میں اسی ریشم سے مجھے اس کی گردن گھونگی تھی۔

”میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، بہت دور۔“

”نہیں..... نہیں.... عاشر! ایسا مت کرو۔ بس یہ انتہا تھی اس کے ضبط کی.... وہ بھٹ پڑی۔ میں وہ کہہ رہا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ میں وہ کہہ رہا تھا جو وہ بھی کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔“

”نہیں عاشر! خدا کے لیے کہیں مت جانا، میری نظروں سے دور مت ہونا۔ تم نہیں جانتے۔ میں تمہاری وجہ سے وہاں سے واپس نہیں آئی، مجھے زبردستی وہاں بھیجا گیا تھا اور اتنے سال میں نے صرف تمہاری وجہ سے وہاں گزارے۔“

میں خود سے بھی چھپ چھپا کے تمہیں چاہتی رہی، لیکن میرا ضمیر مجھے جین نہ لینے دیتا تھا۔ میں تنگ آ گئی تھی اس سخت ملاصرت سے۔ اس لیے وہ گھر چھوڑ دیا۔ یہ تو میں نے سوچا تک نہ تھا کہ تم بھی مجھے چاہتے ہو گے۔“

اس کے اندر سالوں سے پکٹا لاوا اہل اہل کے باہر نکلتا رہا، وہ خالی ہو گئی۔ اب مجھے اپنی مرضی سے اسے بھرتا تھا اور میں نے خوب بھرا، وہ کھلی کی طرح میری انگلیوں کے اشارے پر ناچتی رہی۔ صرف ایک بار اس کے قدم ڈمکائے جب میں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ ہمد سے شہر داری کا تحریری بیان دے۔

”سجھا کر دو شرمین! باقر بھائی جان کو بھی تم ہی سے دلچسپی نہیں رہی، لیکن ہمد کی وجہ سے وہ طلاق دینے میں پس و پیش سے ضرور کام لیں گے۔ ابھی لو ہا گرم ہے، لیکن وقت گزرتا گیا تو ان کا ٹھنڈا پڑنا غصہ مصالحت کی راہ دکالنے کے لیے سوچنے لگے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ طلاق کا مطالبہ صرف تمہاری وجہ سے ہو۔ بلکہ اسے تم دونوں کی جذباتی اور وقتی جلد بازی کا نتیجہ سمجھا جائے گا۔ بعد میں میں خاندان کی بھلائی اور ہمد کی بہتری کی خاطر تم سے

تم فہم کی خاطر ایک دو بار خودکشی کی تاک مگر سی کوشش کرنا۔ امی مومہ ہو جائیں گی۔ میں تم سے شادی کر کے ہمد کو اور تمہیں لے کر باہر کہیں سیٹل ہو جاؤں گا۔ میں ہمد کا بچا ہوں، بھائی جان اور امی جان اسے خوشی میرے حوالے کر دیں گے۔“

اور اس نے میرے کہنے پر عمل کیا۔ سب کچھ میری خواہش کے مطابق ہو چکا تھا۔ شرمین اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی تھی۔

زینیا کے دل سے میں نے یہ جنگ فروری رفع دفع کر دیا تھا۔ یوں بھی اپنی تمام تر ذہانت اور معاملہ فہمی کے باوجود وہ بنیادی طور پر ایک سادہ مزاج لڑکی تھی۔ شاید اس کے اپنے اصول پرست دماغ نے یہ ساری کہانی قبول نہ کی ہوگی۔ کیسے ایک شادی شدہ عورت، اپنے اس دور کے عشق میں..... وہ کیا جانتی تھی کہ کہانیاں بچے سے بھی سنی جاتی ہیں۔ تو ایک آدھ عورت شرمین جیسی بھی ہوئی ہے، رشتوں میں ڈنڈی مارنے سے نہ چوکنے والی تھی۔

ہمد بھی میری توقع کے مطابق جلد ہی بھل گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امی نے بھی زینیا کو دل میں جگہ دے دی تھی۔ مجھے لب کھولنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اور وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔

”اب میں تمہاری شادی کا سوچوں تو ذہن میں بس ایک ہی نام آتا ہے.... زینیا.... اس کے سوا اب کچھ سوچتا ہی نہیں۔“ میں سن کے سکر ادا ہوا۔

”میری بات کا جواب دو۔ زینیا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”میری کیا رائے ہوئی ہے۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”حالات اور ہوتے تو میری رائے بھی اسی اور ہوتی، لیکن آپ کی اس بات سے میں بھی متفق ہوں کہ اس گھر کو زینیا جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ بہت عرصہ آپ نے گھر داری میں جان کھپائی۔ ہمد کے لیے بھی زینیا سے بہتر کوئی اور نہیں۔ تنہا ہے امی جان، اس گھر کی بہتری کے لیے آپ نے جو سوچا ہے، اچھا ہی سوچا ہوگا۔“

”یہ کیا بات ہوئی، گھر اور ہمد کے علاوہ زینیا تمہارے لیے بھی تو مناسب ہے، تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے.....“

”ایک ہی بات ہے امی جان! میں کیا اس گھر سے الگ ہوں۔“

نہ جانے کون سی بات تھی جو مجھے ماں تک کے آگے کھٹنے نہ دیتی تھی۔ کاش.... کاش.... میں تب اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کے کہہ دیتا۔

زینبیا نے خود ہی باقر کے حق میں فیصلہ دیا۔ اسے غایت ہوتا ہے کہ وہ فہد کے لیے کئی بچی ہے۔ اس کے لیے اس نے گھر آئے بہترین رشتے کو مسترد کر دیا۔ تاکہ ممتاز کی سولی پر پوری آتر سکے۔ میں تو شکرانے کے نفل ادا کروں گی۔“ وہ اٹھ میں لیکن مجھے تو جین اور زلت کے احساس سے سلگنا چھوڑ گئیں۔

”زینبیا عرا! یہ تم نے اچھا نہیں کیا.... میرے بھوکے نفس کے آگے سے روٹی اٹھالی۔ اور بھوکا شیر کتنا خطرناک ہوتا ہے، تمہیں اندازہ ہی نہیں۔ آخر تم نے ایسا کیوں کیا۔ کس لیے؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔

”یہ سوال میں تم سے نہیں کروں گا، سچی بھی نہیں۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی۔ میرے دل میں کیا تھا۔ مجھے تمہاری قسمت پر افسوس ہورہا ہے۔ زینبیا! تم نے بڑے گھانے کا سودا کیا ہے۔ عمر بھر کی زلت، پچھتاوا اور مردیاں خریدی ہیں، یہ تمہیں وقت بتائے گا۔ میں نہیں بتاؤں گا۔“

میں نے تہیہ کر لیا تھا کل آفس میں اس سے معمول کے مطابق ملوں گا۔ اپنے رویے سے کسی طور یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ مجھے اس کے فیصلے سے کوئی فرق پڑا ہے، نہ اچھا نہ برا۔ اس سے کسی قسم کی جواب ملنی نہیں کروں گا۔ لیکن میں اس کی سزا ضرور دوں گا۔

میں نے خود کو خدا تصور کیا اور سزا اور جزا دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ایک ذلیل ماسنوبہ بنانے لگا یہ جانے بغیر کہ اوپر جودا ایسا ہے۔

☆☆☆

”ڈیڑھ سو روپیہ۔“

نیکی ایک جھپٹے سے رُکی اور ڈرامیور نے کرائے کی رقم بتائی، مجھے اسی وقت احساس ہوا کہ میرے پاس پاکستانی کرنسی نہیں تھی۔ میں پریشان ہوا تھا۔

”میرے پاس تو صرف ڈالر ہیں چلیں گے۔“

”توسرا!“ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”بڑا لمبا جھپٹھ ہے۔“

”ڈیڑھ سو سے اوپر بنے گا۔“ میں نے چند ڈالر اس کے آگے بھرائے وہ ہنوز انکاری تھا۔

”سرا! آپ اندر سے پتا کر لیں۔“

”اندر.....“ میں نے گھر سے بڑے سے گیٹ کے اندر جھانکا۔ باہر کھڑا گیٹ کپیر میرے لیے نیا تھا۔ میں نے گیٹ کے اندر جھانکا چاہا، بڑا سا کار پورچ خالی تھا۔ یقیناً

”بھائی جان گھر یہ نہ تھے۔ میں کچھ سوچ کے آگے بڑھا۔ گارڈ سے اپنا تعارف کرانے کے بعد اس سے ڈیڑھ سو روپیہ طلب کیا۔

”ام کو کیا کھمبر بتو کون اسے کھا خواہ تم کو ڈیڑھ سو روپیہ دے دیں۔ ام کو پاگل واکل سمجھا ہے۔“ اس نے بیچنے سے صاف انکار کر دیا۔

گیٹ کپیر نے میرے کہنے پہ انکار کا پام اندر سے کسی کو بلا یا ایک آیا ناپ عورت باہر نکلی، وہ بھی میرے لیے نا آشنا تھی۔

”باجی! یہ صاحب کھودو بڑے صاحب کا بھائی بتاتی ہے۔“

”ہاں، ہاں میں نے ان کی تصویر اندر لگی دیکھی ہے۔ فہد کے کمرے میں بھی اور بڑے ہال کمرے میں بھی آکھ صاحب! اندر آئیں۔“

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب تک میرا چہرہ، میرا وجود اس گھر کے کینوں کے لیے اچھا ہے۔ اسی ملازمہ نے نیکی والے کو کرایہ دے کر فراغ کیا اور مجھے اندر لے آئی۔

”صاحب آپ کا کمرہ روز صاف ہوتا ہے لیکن جاپان بڑے صاحب کے پاس ہیں، وہ ایک ٹور کے سلسلے میں کراچی گئے ہیں، آج کوئٹہ گئے۔ فہد بابا سورا ہے ہیں۔ آپ فی الحال گیسٹ روم میں آرام کیجئے۔ صاحب ناشتا چائے۔“

”صرف ایک کپ کافی۔“ میں کہہ کر اندر چلا آیا۔ گھر میں بہت سی تہذیبیان آچکی تھیں اور بہت سی چیزیں اب تک وہی تھیں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو گھر کی ظاہری حالت میں اب پہلے سے کہیں بڑھ کے امارت اور آسودگی ٹپک رہی تھی۔

”یہ کس کی توجہ کا حاصل ہے.....“ میں نے گھوم پھر کے اعلا درجے کے نفیس اور قیمتی شاہکاروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پہلے ہی دولت کی کمی تھی، نہ خوش ذوقی کی۔ مگر امی جان کی سادگی زیادہ خوشاکی محفل نہیں ہوتی تھی۔ اور اب والوں والوں نے مجھے گھرے رنگوں کے کارپٹ، ڈیڑھ سائز فریج، بیٹی فائوس اور امپورنڈ ڈیکوریشن پیش کر دی۔

”کہیں باقر بھائی جان نے دوسری شادی تو نہیں کر لی۔“ پہلا خیال مجھے بھی آیا۔

”لیکن نہیں، ملازمہ نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا۔“ میں نے خود ہی خیال رد کر دیا۔

”ضرور بھائی جان کی تنہائی نے گھر کی دیرانی کو دور کرنے کے لیے یہ مصنوعی اور کھوکھلے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔“

میں ایک نیچے تک پہنچ گیا۔ پورے انتہائی کے ساتھ میں پورے گھر میں گھوم پھر کے جائزہ لے رہا تھا۔ ایک کپ گرم کافی نے بھی سفر کی ساری تکان زائل کر دی۔ امی جان

کے کرے کے بندر دوازے کے آگے میں قہم کیا۔ ہاتھ کے ہلکے سے دھکیلنے پر دروازہ پوٹ کھل گیا جیسے میرے پھونے کا انتظار کر رہا ہو۔

سب کچھ دیکھنے کا دیکھا تھا، وہی اسی جان کے جہیز کا بڑا سا بیڈ، اس پر بھی سفید دودھ جیسی بے شکن چادر۔ اسی جان کی وہی پسندیدہ رضائی۔ میری خشک بچر آنکھوں کے فرش بل میں گیلے ہو گئے۔ میں نے کرے کی دیوار پر لگی اپنی اور باقر بھائی جان کی تصویروں کو دیکھنا چاہا، سب دیکھی کی دیکھی تھیں، وہی تھیں ان میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔

اجانک میری نظر بائیں طرف والی دیوار پر لگی اسی کی بڑی سی تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر اس کرے میں نیا اضافہ تھا۔ میں بے جان قدموں کو کھینچتا اس تصویر کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اسی کے چہرے پر آسودگی تھی۔ آنکھوں میں خواب تھے۔ اور کھٹنیاں پوری کرنے کا سرور بھی۔ یہ تصویر باقر بھائی جان کی شادی کے موقع پر چھٹی گئی تھی اور تب آخری بار میں نے انہیں اتنا شاد و مطمئن دیکھا تھا۔ وہ کیا جانتی تھیں کہ یہ شادی..... یہ نہیں یہ تصویر یہاں کب لگائی گئی۔ اپنی زندگی میں تو وہ کبھی ایسا نہ کرنے دیتیں۔ شاید یہ تصویر بھائی جان نے ان کے جانے کے بعد لگائی ہو۔

ان کی وفات کی خبر مجھے تب ملی جب انہیں گزرے دو ہفتے ہو چکے تھے اور مجھے نیو یارک آئے ڈیڑھ سال ہو رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد کتنا عرصہ میں اس ڈر سے چھپا چھپا رہا کہ کوئی مجھے کھوج نہ کالے۔ کئی بار جانے کی خواہش دل میں ابھری کہ ایک بار پتہ تو کروں، وہاں سب کیسے ہیں، میرے جانے کے بعد کیا ہوا۔ لیکن کسی انہونی کی خدشے سے دیک کے بیٹھ جاتا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں جب میرا ضمیر خود ہی مجھے گڑے مار مار کے تھک گیا اور میری بزدلی جسے میں ہمیشہ اپنا غرور بھینتا رہا دم توڑ گئی تو میں نے ہمت کر کے پاکستان کی خبر پڑھ لینا چاہی۔ اور پہلی خبر جو ملی وہ یہ تھی کہ اسی جان کو گزرے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ یہ خبر اتنی اندوہناک تھی میرے لیے کہ دوبارہ کبھی کسی خبر کو جاننے کی آرزو بھی دل میں نہ جاگی۔

میں نے آہستہ آہستہ تصویر پر اپنی انگلیاں پھیریں۔

”مجھے معاف کر دیں اسی! میں آپ کے پیار کے قابل نہ تھا، میں بد نصیب تھا جو سب ٹھکرا رہا تھا۔ دعا میں بھی، وفا میں بھی۔ اور ایک وقت آیا کہ دعاؤں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ وفاؤں نے خود مجھ سے منہ موڑ لیا۔“

اور یہ سچ تھا مجھے دعا دینے والے لب لب کے خاموش ہو چکے تھے، مجھ سے وفا کا عہد کرنے والے ہاتھ اب مجھے کچھ بھولے بسرے عہد یاد دل رہے تھے۔

ہر شخص میں ڈھونڈتا ہوں خود کو
شاید میں کسی میں کھو گیا ہوں
اب تیرا وصل رائیگاں ہے
میں کب کا اداس ہو چکا ہوں
اندھا ہوں پکڑ لے ہاتھ میرا
اے جگر کی شب، میں بے حصا ہوں
خوش ہو اے بلندیوں کی خواہش
میں لوگ سناں پہ سج گیا ہوں
دریا کو شکست دی ہے میں نے
مشکیزے میں پیاس بھر رہا ہوں
کرتا ہے کون قبول مجھ کو
کسے ہوئے ہاتھ کی دعا ہوں
سچ یہ ہے کہ اجنبی ہوں خود سے
کہنے کو میں سب سے آشنا ہوں

یہ چند اشعار..... یہ غزل گزرے ان برسوں میں میں نے اتنی بار پڑھی تھی کہ اب اس کے مصرعے وقت بے وقت میرے اندر گونجتے رہتے۔ میں نے سچ سچ اپنے مشکیزے میں پیاس ہی تو بھری۔ اسنے ہاتھوں صحر ا پر کرا لیا تھا۔
ماں کس کی سدا جیتی رہتی ہے۔ لیکن میں ان بد نصیبوں میں سے تھا، جنہیں ماں کا آخری دیدار تک نصیب نہیں ہوتا۔ جنہیں اپنی ماں کے گزرنے کے کئی دنوں بعد پتا چلتا ہے کہ ان سے کیا چھینا جا چکا ہے۔

☆☆☆

”چاچو! آپ میرے چاچو ہیں؟“

جاگنے کے بعد جیسے ہی ہمد کو میرے آنے کی خبر ملی تو وہ دوڑ کے میرے کرے میں آ گیا۔

”فہد، میرا فہد، چاچو کا فہد۔“

میں نے اسے ہاتھوں میں بھر لیا۔ کیا وقت تھا، جب یہ جان کر کہ زینا نے مجھ پر باقر بھیا کو صرف ضد کی وجہ سے فوٹیت دی ہے، مجھے اس معصوم بچے سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اس بچے سے، جو دنیا کی واحد ہستی تھا۔ جس سے بے پناہ محبت کا اظہار

کرتے ہوئے میں کبھی ہچکچاہٹیں۔ یہ نفرت بھلے ہی بس ایک لمحے بھر کی تھی، لیکن پچھلے کئی سالوں سے میں اس ایک لمحے کے ہونے پچھتا رہا ہوں۔ شرمندہ رہا۔ شاید میں عمر بھر اسے ٹوٹ کر چاہنے کے بعد بھی اس ایک بد صورت لمحے کا ازالہ نہیں کر سکتا تھا۔

کئی ہی دیر میں اسے بازوؤں میں بٹھنے، سینے سے لگے کھڑا رہا۔ وہ دس گیارہ سال کا دبلا بچہ بھائی جان کی طرح لہسا تھا۔ میرے شانوں سے اوپر آتا۔ وہ میرے احساسات کو نئے نئے پیرا ہنڈا رہا۔ اس کی تیز دھڑکنیں میرے سینے میں یوں دھک دھک کرتی مدغم ہو رہی تھیں جیسے اس کا دل میرے اندر گھس آنا چاہتا ہو۔

”کیا ابو جان بھی مجھے سینے سے لگے اسے ایسا ہی محسوس کرتے تھے۔“

میں نے اس کی آری کنگ والے بکھرے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ اسے آنکھیں سے خود سے الگ کرتے ہوئے میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا

چہرہ قہاس کے غور سے دیکھنا چاہا، میرے دل نیا کنگو نہ سا گیا۔ وہ کھوئی کھوئی آنکھوں والا بچہ۔ بچپن کو نہیں دور چھوڑ آیا تھا۔ اس کی سنجیدگی وقت سے کہیں پہلے سر پٹ بھاگ کے اس کے پاس آ پہنچی تھی۔ شاید ان سب کا بھی ذمہ دار میں ہی ہوں۔

وہ میرے پاس بیٹھا میرے چھوٹے چھوٹے سوالوں کا جواب دیتے لگا۔ بھائی جان کے متعلق، ان کے برنس کے بارے میں، اپنے اسکول کی باتیں، تعلیمی ریکارڈ وغیرہ، جب میں نے اس سے، اس کے دوستوں کے بارے میں پوچھا تو جیسے وہ شروع ہی ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار دلچسپی کے رنگ دیکھے۔ اس کے بہت سے دوست تھے اور اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اس کے دوست میرے دوستوں کی طرح محض ٹائم پاس نہیں تھے۔ ان کے لیے محبت اور غلوں اس کے لہجے سے نکل رہا تھا۔ رشتوں کی کمی نے شاید اسے دوستی کے سہارے تلاشنے پوچھا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی پر جوش گفتگو سن رہا اور خود کو ملامت بھی کرتا رہا۔

”عاشق ملک! انہی کی زندگی مکمل ہونے جا رہی تھی۔ اس کو ماں ملنے والی تھی، صرف نام کی نہیں، بلکہ بچ بچ کی ماں.... شاید گزرتے برس اسے بہن، بھائی کے رشتے بھی دے جاتے، لیکن تم نے سب اس سے ایک جھٹکے میں پھینچ لیا۔ ایک بار اس کی ماں تم نے اس لیے الگ کی کہ وہ تمہیں پسند نہ تھی اور دوسری بار تم نے اس کی ماں اس لیے بھیج دی کہ وہ تمہیں پسند نہ تھی۔“



”یہ تم کیا کہہ رہے ہو عاشق۔؟“ امی جان میری ہرزہ سرائی پہ دنگ رہ گئیں، میں نے بات بھی تو آئیں پریشان کن حد تک حیران کر دینے والی تھی۔

”بات یہ ہے امی جان! کہ..... کبھی میں نہیں آ رہا کیسے کہوں۔ اگر دنیا کے بارے میں آپ اتنی سنجیدہ نہ ہوتیں تو شاید میں بھی اس کی ذاتیات میں ڈل نہ دیتا۔ وہ میری کو لیک ہے اور آفس ٹائم میں ہم اچھے دوستوں کی طرح رہتے ہیں، فید سے اس نے اپنی انسیت ظاہر کی تو میں نے اس کے اپنے گھر آنے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا، لیکن آپ کے اسے بہو کے طور پر منتخب کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس کے بارے میں کچھ تو چھان بین کرنا چاہیے، زمانہ بہت خراب ہے امی جان، لوگ ہزار چہرے ایک چہرے پہ سجا کے ملتے ہیں۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو، سیدھی طرح کہو؟“

”اس سے پہلے بھی صاحب نے اور اس اعتبار دونوں نے اس کے بارے میں کچھ اندیشوں کا اظہار کیا تھا، لیکن میں نے اسے پرمشعل جیسی جان کے جھٹکا دیا۔ اور پھر امی بڑے باوقوف ذرائع سے مجھے علم ہوا ہے کہ اس کا اپنے بھائیوں سے جھگڑا وہ نہیں جو اس نے مشہور کر رکھا ہے، اصل بات کچھ اور ہے۔ بدنامی کے خوف سے اس کے گھر والوں نے اس سے قطع تعلیق کر رکھا ہے۔ اس کے نام پہ ٹھوکتے ہیں وہ۔“

اور میری آنٹی بڑی بات پان کا حیران ہونا تو لازم تھا۔ میں نے اسی کا پتہ نہ کیا۔ ”اور وہ لڑکا، جسے وہ اپنا بیٹا سمجھتی رہی ہے۔ اس کا اپنا بچہ تھا۔ کچھ بتائیں، جائز یا ناجائز، اس کے باپ نے اسے جائیداد سے بے دخل کر دیا تھا۔ یہ بنگلہ، یہ کار، یہ ایک سابق ایم این اے سے تعلقات کا نتیجہ ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس نے تمہارے کان بھرے ہیں۔ میں بات کرتی ہوں زینیا سے۔“ میں نے فوراً انہیں روکا۔

”اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ۔ بھلا چور اپنی چوری تسلیم کرتا ہے۔ میں مکمل تصدیق کر کے یہ بات آپ سے کر رہا ہوں۔ آپ کی مرضی۔ یقین نہ کریں اور بیزار غرق کر لیں اس گھر کا، جو کئی شہرین کی جانب سے رہ گئی تھی، وہ اب پوری ہو جائے گی۔“ میری وارننگ پر وہ منتظر بیٹھی رہ گئیں۔ ظاہر ہے انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ زمانہ شناس نہ تھی مگر اچھے برے کی کچھ پہچان تو تھی۔ اور پھر اچھائی کی تو اپنی مہک ہوتی ہے۔ کیا یہ مہک انہوں نے زینیا سے محسوس نہ کی ہوگی۔ کی ہوگی تب ہی اپنے سگے بیٹے سے اتنے باوقوف، انہیں سننے کے بعد بھی وہ مکمل طور پر یقین نہ کر پارہی تھیں، اور دوسری

طرف ایک ماں ہونے کے خدشے تھے۔ وہ الگ تھیں۔

فی الحال میرے لیے اتنا کافی تھا، میری اگلی ضرب پہلے سے بڑھ کے کاری تھی۔ اور اس کا بھی میں نے پورا انتظام کر رکھا تھا، ایک جانے والے کو نوگرافر کے ذریعے میں نے زینیا کی ان تصاویر کو، جو پچھلے نیاویبر فکشن میں لی گئی تھیں، ایسے ایسے انداز دیئے تھے کہ امی جان تو دیکھتے ہی اس بے لوث بیچ دیتیں۔ اعتباراً میں نے ان تصاویر کی ایک کاپی باقر بھائی جان کے لیے بھی بھجوائی تھی تاکہ ان کی غیرت کو بھی درجہ اول تک لے آؤں۔ کل صبح تک ان تصاویر کو امی جان اور بھائی جان کے پاس پہنچانے کا مکمل انتظام کر کے میں بڑا مطمئن، بڑا فارغ سا بن کے زینیا کی طرف چل پڑا تھا۔

میں اسے یہ بتائیں سکتا تھا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ میں اسے یہ بھی نہیں دکھا سکتا تھا کہ دیکھو میں جیت گیا، لیکن میں یہ دیکھ کے دل ہی دل میں خس تو سکتا تھا کہ مجھ سے ہارنے والی وہ عام سی لڑکی، خود کو مجھ سے جیتتا ہوا جان رہی ہے۔

☆☆☆

”کیسے آنا ہوا.....؟“

میں جو نازل طریقے سے اس سے ملنے کے ارادے باندھ بیٹھا تھا اس کے پہلے ہی سوال سچ بڑا گیا۔ دروازے کے پتھوں سچ کھڑی وہ بڑی بے رخی سے مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

اس کے سنے سنے چہرے پر کچھ پالنے کا یا حاصل کر لینے کا سرور نہیں تھا۔ جس کا میرے اندر طوقا سا اٹھا۔

”بات کیا ہے۔ تم اتنی اکڑی اکڑی کیوں ہو؟“ وہ خاموش رہی، لیکن ایک طرف ہٹ کے اس نے گویا مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اب وہ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھی اپنی انگلیاں مسل رہی تھی، مجھے اپنے دل پہ چٹکیاں سی بھرنی محسوس ہوئیں۔ پتہ نہیں اس کی مسکراہٹ کا میرے ہاتھوں سے، اور اس کے ہاتھوں کا میرے دل سے یہ کیسا رابطہ تھا۔ سینہ سستے ہوئے میں نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

”فاشر! اب ہم کسی اور رشتے سے وابستہ ہونے جا رہے ہیں، مجھے تمہاری کہنی میں کام کرنا مناسب محسوس نہیں ہو رہا تھا، اس لیے میری زبان کر رہی ہوں اور جب تک اس نئے رشتے کو واضح شکل نہیں مل جاتی ہمارا ملنا مناسب نہیں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آخر ہم اچھے دوست ہیں۔ یہ نارشتہ ہماری دوستی پہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ان فیکٹ میں تو تمہیں مبارکبادی دینے آیا تھا۔“ میں نے پراسرا

طریقے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دوستی گزرتے کل کی بات تھی۔“ اس کے زوٹھے انداز یہ میں نے تنگ کے پوچھا۔ ”کیوں۔ یا پھر میں یہ سمجھوں کہ وہ دوستی آنے والے کل کو ہموار کرنے کے لیے کی گئی تھی۔“ وہ تپ اٹھی میرے الزام پہ۔

”میں تمہیں ایک اچھا انسان سمجھتی تھی، اس لیے تم سے.....“ وہ اب کانٹے ہوئے رک گئی۔ پھر اس اچانک وقفے کے بعد سنبھل کے بولی۔ ”تم سے دوستی کر لی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر گھٹانے کے کردار کے مالک ہو۔“

”واٹ ڈو یو مین.....“ میں غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”اگر میں اتنا ہی گھٹانا ہوں تو پھر صرف میرے رشتے سے انکار کرنے پہ ہی کیوں اکتفا کیا۔ میرے بھائی کو بھی ٹھکرا دیتیں۔ لیکن نہیں زینیا عمر! تم ایک سودخور ذہنیت کی مالک عورت ہو۔ پچھلے دس بارہ سالوں میں وہ اپنی ایک ذہنیت بنا چکے ہیں، جب کہ میں ابھی ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔ اور سود کے طور پر تمہیں ایک ایسا شوہر بھی مل رہا ہے جو تمہارے احسان کے جو بھتے دے دے ہمیشہ تمہارے تلوے چاٹتا رہے گا۔“

”کو اس کر رہے ہو تم۔“ کہنی مار میں نے اسے اس قدر جارحانہ انداز میں دیکھا۔ ”تم سے شادی نہ کرنے کی وجہ بھی اور تمی اور باقر کے لیے ہائی بھرنے کی وجہ بھی اور ہے۔“

”تم اس قدر گندے، بددیانت اور کردہ انسان ہو کہ تم نے اپنے بھائی کی زندگی میں زہر گھولتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس نہ کی۔“

ایک ایسی عورت سے ناجائز تعلقات رکھنے میں تمہیں کوئی خوف خدا نہ آیا۔ جو شرعی، اخلاقی ہر لحاظ سے تمہارے لیے محترم تھی۔ تم نے اپنے کردار کی گندگی چھپانے کے لیے اپنے اور اس کے رشتے پہ اختلاف کے پورے ڈالے رکھے تاکہ کسی کو شک ہی نہ ہو۔ جس چادر یواری کے اندر اور جس چھت کے نیچے اپنے شرمناک کھیل کھیلے جاتے ہوں میں اس گھر میں جانے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتی۔

لیکن اگر میں باقر ملک کے لیے رخسانہ ہوئی ہوں تو صرف ہند کی وجہ سے۔ پہلے مجھے اس میں صرف اپنے ہند کی جھلک نظر آتی تھی۔ اب خدا نے اسے میرے لیے پورے کا پورا فائدہ بنا دیا ہے۔ انسانیت کے ناتے صرف اور صرف انسانیت کے ناتے یہ شادی کر رہی ہوں تاکہ اس انسان کے ساتھ بے خبری میں اسنے سالوں تک جو خیانت ہوئی رہی اس کا کچھ تو ازالہ ہو سکے۔“

”کس نے کہا تم سے یہ سب۔ بولو۔ کس نے کہا۔ شرم نہیں۔“

میں اس کی باتیں سن کر بھڑ گیا۔ جنونی انداز میں اس کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے پوچھا، وہ زرد ہو کے پیچھے بٹنی۔

”مجھے ہاتھ مت لگانا عاشر!....! میں شرمن نہیں۔“

اس نے پاس بڑا اگلدان اٹھالیا، مجھے ایسے لگا جیسے اس نے مجھے تیل بچ کیا ہو۔ میرے اندر سے زبردست تحریک اٹھی، اسے مسل دینے کی۔ اس کا غرور پکنا چور کر دینے کی..... مگر میرے پیچھے کی سن وزنی برف کے تو دوں میں تبدیل ہو گئے۔ میرے ہاتھ سن ہو کے میرے ہی پہلو میں گر گئے۔ میں نے آنکھیں پھلکا کے اسے دیکھا۔

”نہیں عاشر ملک! تم بھی یہ نہیں کر پاؤ گے۔ جی نہیں، کسی کے ساتھ بھی نہیں، کم از کم زمینیا کے ساتھ تو جی نہیں۔“

میرے موہاں پہ پیپ بجتے لگی۔ ڈھیلے قدموں کے ساتھ پیچھے ہوتے ہوئے میں صوفے پر گر گیا۔ پیپ ابھی بھی بج رہی تھی۔

”تم نے بہت برا کیا زمینیا، بہت برا، میں اچھا نہیں ہوں، مجھے اعتراف ہے۔ میں پوری سچائی اور ہمت کے ساتھ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن یہ اتنا گھناؤنا الزام، اتنا برا جھوٹ۔“

”آج جب ضرب مجھ پہ پڑی تھی تو میں تڑپ گیا تھا۔

”کوئی عورت اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی عاشر! شرمن نے مجھے یقین دلادیا ہے کہ وہ شادی سے پہلے ہی تم سے محبت کرتی تھی، لیکن تم دونوں کی شادی نہ ہو سکی۔ کیونکہ تب تم اپنے بیروں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھے۔ نہ تو یہ کوئی انوکھی کہانی تھی، نہ ہی ایسا جیسا بار ہوا تھا۔ ایسے سانحوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ لوگ ٹھوکریں کھاتے ہیں، گم اٹھاتے ہیں خوابوں کی کرچیاں سینٹے ہیں اور پھر راضی برضا ہو جاتے ہیں۔ لیکن سانحو تو یہ تھا عاشر ملک کہ تم نے قدرت سے راضی برضا ہونے سے انکار کر دیا۔

تم اپنے ماں اور بھائی کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے، اور وہ اپنے شوہر کا حق ماوتی رہی۔ اس نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے، سب کچھ۔“

وہ ہنسی رہی اور میں بے حس و بے حرکت سنتا رہا، پیپ اب بھی وقفے وقفے سے بج رہی تھی۔

”اس نے مجھے یہ نیک بتادیا ہے کہ فہد باقر کا نہیں، بلکہ تمہارا خون ہے، تمہارے اور شرمن کے غلیظ مراسم کا نتیجہ۔“

یہ آخری الزام میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے ٹھیل پہ پڑی چیزوں کو ہاتھ کے

دھکے سے نیچے گر ڈالا اور وحشت سے چیخ اٹھا۔ میرا بس نہ چل رہا تھا کہ ساری کائنات درہم درہم کر دوں۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی اتنی گندی بات منہ سے نکالنے کی، وہ میرے بھائی کا بیٹا ہے، میرے بھائی کا بیٹا، ہاں وہ میرا خون ہے مگر.....“

میں بہت کچھ کہتا چاہتا تھا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن لفظ میرے لبوں تک آ کے ٹوٹ ٹوٹ گئے۔

”اور وہ بچہ جسے وہ اپنا سوتیلی بھائی بتاتی ہے، اس کا اپنا ہے، جائز یا ناجائز یہ پتا نہیں۔“ میرے ہی کہے الفاظ نے میرے منہ پہ طماچر سید کیا۔ اب زمینیا کے طماچے کا درد کم پڑ گیا۔

”وہ بھی تو اس کے باپ کا خون تھا، جسے میں نے اسی کی اولاد کہہ دیا۔ کیا یہ کم گندی گالی تھی جو میں نے اسی کے بدلے میں، میں اس سے کہیں بڑھ کے ذلالت کا حق تھا۔“ میں نے ساری عزائم ترک کر دی اور چپ چاپ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ میرے لبوں پہ ایسی مجرد جی مسکراہٹ تھی جیسے کسی سپاہی کے ہونٹوں پہ تب اُبھر آئے جب اس کا ہتھیار ڈالنے کا ارادہ نہ ہو، مگر اس کے بازو بھی ہتھیاروں سمیت کٹ کے زمین پہ آ رہیں۔

اب میں جان گیا تھا کہ میرے ساتھ جو رہا ہے وہ شرمن نے نہیں کیا۔ میں جو سن رہا ہوں وہ زمینیا نہیں کہہ رہی۔ یہ سب تو میرے اعمال کی سزا ہے۔

”اب خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی اور کبھی گھڑ لو عاشر ملک!۔“

میرے موہاں کی پیپ پھر سے بجنے لگی۔ مجھے سب سنائی دے رہا تھا۔ سب کچھ، زمینیا کی لعنت ملاحت بھی فون کی پیپ بھی۔ مگر یہ سب بس منظر میں گونج رہا تھا۔ میرے اندر سے سب سے بلند صدا گونجی وہ یہ تھی۔

”عاشر ملک، آج تم چاروں خانے جت ہو گئے۔ جب تک تم صرف اپنے غرور کی تسکین کے لیے، اپنی آکر کے دُغم میں اور اپنی خود پسندی کے نشے میں چور وہ چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں کرتے رہے، اللہ نے شاید تمہاری رسی دراز کر رکھی تھی۔ یا پھر وہ تمہیں کسی شریر اور نا سمجھ بچے کی رعایت دیتے ہوئے درگزر کرتا رہا۔ لیکن جب تم نے خدا کے کام اپنے ہاتھ لینے شروع کیے، تقدیر خود تم کرنے کے لیے قلم سنبھال لیے۔ تو یہ رسی تو اللہ نے بھیچنا ہی تھی۔ اب تم کچھ میں دھنسے ہوئے ہو۔

وہ عامی لڑکی جس کی ہار کا تماشما دم دیکھنے آئے تھے، تم پہ تھوکر رہی ہے، وہ عورت

جسے تم نے محض اس لیے ٹریپ کیا کہ اس نے تم سے محبت کرنے کی جسارت کی۔ جنہیں اس کی اپنے بھائی سے بے وفائی پسند نہیں آئی اور تم نے فریب سے اسے بھائی کی زندگی سے دور کر دیا اور تمہاری یہ بات اللہ کو پسند نہیں آئی۔ مزاد نے کا اختیار تو صرف اس کو ہے وہ شر میں کو معاف کرتا، سیدھی راہ پر لاتا، باسرا دیتا۔ یہ تو اس کی مرضی تھی۔

زینیا کو اپنانے کی تم نے ہر ممکن کوشش کی، اس کوشش کا اختار اللہ نے ہی تمہیں دیا تھا لیکن اس اختیار کو غلط استعمال کرنے کی اجازت تو تمہیں دی تھی تم ایک بار تو اسے محبت سے جیننے کی کوشش کرتے، اس کے انکار کی وجہ تو جاننے کی کوشش کرتے، شاید یہ بات پہلے کھل جاتی، تم اپنی صفائی پیش کر کے اس کا دل صاف کر لیتے۔

لیکن مانگنا، گروگڑانا تمہارے لیے مشکل تھا۔ یہ سوچنا آسان تھا کہ اگر وہ میری نہ ہو سکی تو کسی اور کا بننے بھی نندوں کا ہم نقد پر لکھنے چلے تھے تو اب تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانا ضروری تھا۔“

میں چپ چاپ آنکھیں بند کیے یہ طعنہ سنتا رہا۔ موبائل کی بپ بھی اور زینیا کا سوال بھی۔

اچانک اس کی نظر زمین پر پڑے مسلسل پکارتے موبائل پر پڑی وہ چونک اٹھی۔

”شر میں.....!“ اسکرین پر شاید شر میں کا نمبر آ رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھی۔

میں نیم دا آنکھوں سے بے جان بیٹھا اسے لبک کے زمین سے فون اٹھاتے اور کان سے لگاتے دیکھتا رہا۔ اس نے آن کرتے ہی چٹھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر وہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ شاید شر میں نے دوسری طرف سے آواز سننے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ اتنی دیر بعد رابطہ قائم ہونے پر ایک سیکنڈ کا انتظار کے بغیر شروع ہو گئی۔ بجائے وہ کیا کہہ رہی تھی زینیا سنتی گئی۔ اور اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹا گیا۔ وہ سستی گئی اور اس کی آنکھیں جھپٹی گئیں۔ وہ سستی گئی اور اس کے لب کپکپاتے گئے۔ کچھ دیر بعد اس نے موبائل آف کیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھا م کے سامنے والی نشست پر ٹیک لگائی۔ میں نے آنکھیں پھر سے موندیں۔ مجھ میں نہ تو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ شر میں نے اس سے اب اور کیا کہا اور نہ ہی اٹھ کے یہاں سے جاننے کی ہمت تھی۔

میں تو ایک الگ ہی کیفیت میں تھا۔

”اللہ اللہ، میرے اللہ مجھے معاف کر دے۔۔۔ میں اسی قابل تھا مگر تو مجھے سنبھلے کا ایک موقع دے۔“ مجھے نہ امت تھی۔

”یا اللہ، مجھے معاف کر دے۔ کل تک کوئی مجھے اس قابل نہ لگا تھا کہ میں اسے اپنے لیے جانتا، آج میں اس قابل نہیں کہ کسی کا ہو سکوں۔“

کتنے ہی لمحے گزر گئے تھے، میں بھول ہی گیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا زینیا بھی یہاں موجود ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے ہاتھ پر کسی کیلے کیلے کا احساس ہوا۔ کا پتھی سی انگلیوں نے اسی طرح میرا ہاتھ سہلایا۔ جیسے بار بار سہلایا تھا۔ میں نے ذرا سی پلکیں کھول کے دیکھا۔ زینیا میرے سامنے کارپٹ پر دوڑا تو بیٹھی تھی۔ میری آنکھیں پتہ نہیں کیوں دھندلی ہی ہو رہی تھیں، مجھے اس کے لیوں پر کوئی مسکراہٹ نظر نہ آئی، البتہ میرے ہاتھ پر وہ مسکراہٹ ابھی تک کلیاں چن رہا تھا۔ میں نے پلکیں جھپک کے پھر سے دیکھا۔ آنکھوں کی پتلیوں سے تیرے پھر تے گدے لے آئے پلکیوں کی سولی پر ٹپک گئے۔ منظر ذرا سا صاف ہوا۔ زینیا کی آنکھیں مجھ پر جھی ہوئی تھیں مگر اس کے لب ساکت تھے۔ کسی پرس مسکراہٹ کی بھلی ہی رتی بھی نہ تھی۔

”تو پھر یہ کا پتھی انگلیاں، وہ سہلانا۔“ میں نے چونک کے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس پر زینیا کا ہاتھ دھرا تھا۔ میری روح پوری شدت سے کانپ گئی۔

”مجھے معاف کر دو عاشر!“ بڑی دقت کے ساتھ اس نے زندہ گلے سے یہ چند الفاظ ادا کیے۔ میں پھر سے کپکپا اٹھا۔

”کیا یہ کوئی نئی سزا ہے، اللہ معافی تو مجھے اس سے مانگنا ہے۔“

”میں اس قابل تو نہیں عاشر، لیکن مجھے معاف کر دو۔ مجھے دوستی کا کچھ تو مان رکھنا چاہیے تھا۔“ میں نے اس کی باتوں پر یقین کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

”میں تو یہ جان کر اس کی بات سننا چاہتی تھی کہ جنہیں مزید شرمندہ کر سکوں، لیکن پتا ہے دوسری طرف وہ کیا کہہ رہی تھی۔“ وہ کہہ رہی تھی، عاشر میں نے تمہیں ہرا دیا۔ تم کبھی بار نہیں سکتے اس بات کا برا از م ہے نا تمہیں۔ تم زینیا کو اپنانا چاہتے تھے۔ کیوں؟ اس میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں، میں نے اسے تم سے دور کر دیا۔ تم نے مجھی مجھے اور میری محبت کو قبول نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اس قابل کر دیا کہ کوئی تمہیں قبول نہ کرے۔ تم اپنے بھائی کی زندگی سے مجھے اس لیے دور کرنا چاہتے تھے کہ تمہارے خیال میں میں نہ اچھی عورت ہوں، نہ اچھی بیوی، نہ اچھی ماں تو عاشر میں نے تمہارا اسے بھائی سے یہ فیڑ بھی چھین لیا کہ وہ ایک باپ ہے۔ میں نے زینیا کو یہ یقین دلایا ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان نا جائز تعلقات تھے، اور ان ہی تعلقات کا نتیجہ فہد ہے، کیوں عاشر مکملہ! جھوٹ کیا تم ہی بول سکتے ہو۔ دیکھو میں نے کس صفائی سے یہ جھوٹ بولے ہیں کہ زینیا بیسی اچھی خاصی عقل مند لڑکی تھی اسی لیے بنیاد باتوں پر ایمان نہ آئی۔“

شر میں کی ساری باتیں دوہرا کے وہ خاموش ہو گئی۔

میں حیران تھا، کیا میری توبہ اتنی جلدی قبول ہوگی۔ کیا اللہ نے مجھے اتنی جلدی معاف کر دیا۔ کیا میرے دامن پہ لگا داغ اتنی جلدی مٹ گیا۔
 ”عاشر.....! تم نے بھی مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم مجھ سے.....“

اب وقت آ گیا تھا، جب مجھے اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنا تھا، خدا کے آگے جھکنے کے بعد، گزر گزرنے کے بعد، مجھے احساس ہوا کہ معافی مانگ لینے میں تو نفع ہی نفع ہے۔ کیسے اللہ نے میری توبہ قبول کی اور مجھ پہ الزام لگانے والی نے خود اپنی زبان سے یہ الزام دھو بھی ڈالے۔ اب مجھے زینبا کے آگے بھی اپنا آپ کھول کے رکھ دینا تھا۔ سب کچھ بتا دینا تھا۔

”زینبا! بات اتنی سیدھی نہیں جتنی تم سمجھ رہی ہو۔“ کتنی دیر خاموش رہنے کے بعد میں بولا تو مجھے خود اپنی آواز ابھی سی لگی۔

”شرمین نے تم سے سب کچھ جھوٹ بولا، لیکن کچھ جچ میں بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں، یہ فیک ہے کہ ہمارے درمیان نہ تو اس کی شادی سے پہلے کچھ تھا نہ بعد میں رہا۔ یہ بھی جچ ہے کہ فہد..... لیکن ایک جچ یہ بھی ہے کہ اس نے باقر بھائی جان سے طلاق میرے ورغلانے کے بعد ہی لی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس طلاق کے بعد میں اس سے شادی کروں گا۔“

میں رکا، وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ میرے ہاتھ پہ رکھا اس کا ہاتھ مجھے بولتے رہنے کی بہت دلارا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں وہ یہ ہاتھ پھر سے اٹھانے لے۔

”لیکن اس کی ایک وجہ تھی، ایک شخص اور جائزہ دہ۔ وہ جس ذہنی ابتری اور اخلاقی کمزوری کا شکار تھی۔ اس پہ اب میرا سمجھنا بھاننا بے اثر جاتا، میں نے اس کا علاج اسی کے طریقے سے کرنے کا سوچا۔“

مجھے سب سے پہلے یہ احساس دلانے والی تم تھیں کہ شرمین مجھ میں دلچسپی رکھتی ہے۔ میں نے سوچا تو مجھے تمہارا انداز درست معلوم ہوا۔ میرے ایک ہی بار پوچھنے پہ شرمین نے اپنا آپ عیاں کر دیا۔ زینبا اب اس کا میرے بھائی کے ساتھ رہنا تم میں سے کسی کے لیے بھی ٹھیک نہیں تھا۔ جب تک اس نے خود پہ بند باندھ رکھے تھے تب بھی وہ خود کو اور اپنی اپنی ذہنی زندگی کو سنبھالتے ہیں ہری طرح کا کام رہی تھی، اور بات کھل جانے کے بعد، اظہار کو رست مل جانے کے بعد وہ کیسے خود پہ کنٹرول کر لی۔ زخم جب ناسور بن جائے تو اس پر مہر نہیں لگاتے۔ کاٹ ڈالتے ہیں۔ میں نے اسے اپنی باتوں سے یہ یقین دلادیا کہ اس کی طلاق کے بعد میں اس کی خواہش پوری کروں گا۔ اس نے طلاق لے لی، اب میرا بھائی ایک کمزور کردار کی عورت سے دوسرا تھا اور میرا بھتیجا ایک فطس کی ماری ماں

سے محروم، یہی میرا مقصد تھا میں نے شرمین کے تقاضے پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے انعام سے بھرے یہ قدم اٹھالیا۔
 ”اور میں کتنی بے وقف، آسانی سے اس کی باتوں میں آ گئی۔“ وہ بے چین ہو کے اٹھ بیٹھی۔

”اوہ! عاشر! یہ میں نے کیا کر دیا۔ تم مجھے معاف کر سکتے ہو نا۔ بولو کیا میں معافی کے قابل ہوں۔“ وہ پھر سے میرے قریب بیٹھی۔ تاسف، بے قراری اور ملال نے اس پہ اکٹھا مل کر دیا تھا۔ معافی کے لفظ پہ میں مسکرا اٹھا۔

”غلطی تمہاری نہیں، یہ تو میرے اپنے اعمال تھے جو میرے آگے.....“
 کہتے کہتے میں زک سا گیا۔ مجھے اچانک یاد آ گیا کہ میرے اعمال میں صرف اتنا ہی درج نہیں، میں ابھی ابھی ابھی میری بہت کچھ کر کے آ رہا ہوں وہ تصویریں، امی کے سامنے وہ زینبا کے بارے میں ہرزہ سرائی، سب مجھے یاد آئے لگا۔ میری ہڈیاں اندر سے تڑتڑا کے ٹوٹنے لگیں۔

”میں نے اللہ سے معافی مانگی اور اس نے مجھے معاف کر دیا۔“
 لیکن انسان سے بڑا جابر اور کون ہے، وہ ابھی ابھی جو کچھ میں کر کے آ رہا ہوں اس کا عمل تو نبھا نے کتنی صدیاں چلے گا۔ اور پتا نہیں زینبا کو مجھے معاف کرنے میں کتنی صدیاں لگیں گی۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ گلاب کھل رہے تھے۔

میں حیران سا ہو گیا۔
 ”عاشر.....! تم نے میری اتنی بڑی غلطی کو اتنی آسانی سے بھلا دیا۔ تم جچ بچ بہت اچھے انسان ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید مجھی تمہیں معاف نہ کرتی۔ یہی دیکھ لو۔ ابھی بھی صرف شرمین کی باتوں میں آ کے میں کیا فیصلہ کر بیٹھی تھی، حالانکہ میں تو ہمیشہ تم سے.....“ وہ پتا نہیں کیا کہنے جا رہی تھی۔ میرا دھیان تو اسی فقرے میں لنگ گیا۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو تمہیں بھی معاف نہیں کرتی۔“
 ”میں نے ہمیشہ تمہیں چاہا ہے۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ کی تمنا کی ہے۔“
 جھکی آنکھوں کے ساتھ اپنی مخصوص مسکراہٹ سے سہلاتے ہوئے اس نے ایک مہکتا سا اقرار کیا۔ وہ اقرار جسے سننے کی میں ضد باندھے بیٹھا تھا۔ اور آج یہ بہت اس نے کر ڈالی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی مسکراہٹ سے چھڑا لیا۔

”کیا وہ عاشر.....؟“ میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اور وہ ہراساں کھڑی پوچھ رہی تھی۔
 ”عاشر.....! کیا تم ابھی تک ناراض ہو، میں مانگی ہوں کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کئی الزام لگائے۔ کچھ اچھالے۔ تو دکھ تو ہوتا ہے اور یہ دکھ تب ناقابل برداشت

ہو جاتا ہے جب یہ کچھ اس ہستی کی جانب سے پھینکا گیا ہو، جس سے آپ سچ سچ محبت کرتے ہوں۔ عاشر اور مجھے اعتراف ہے کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو مرجانی لیکن تمہیں کبھی معاف نہ کرتی.... لیکن تم مجھ جیسے عام سے انسان تو نہیں عاشر تم تو مجھے معاف کر ہی سکتے ہو۔“

اس نے فریادی۔ میں ہلکی بھڑکتھا۔

”دکھو دکھو ہے، اور یہ دکھتا ناقابل برداشت ہو جاتا ہے جب یہ کچھ اس ہستی کی جانب سے پھینکا گیا ہو۔ جس سے آپ سچ سچ محبت کرتے ہوں۔“ یہ تو ہی اسی اہی نے تو صا اور کیا تھا۔ میں کیسے بھول جاتا۔

”میں تم سے محبت کرتی ہوں عاشر.....!“ اس کا یہ اقرار مجھے بار بار رہا تھا کہ میرا دیا گیا یہ دکھا اسے کتنی نہیں دے گا۔ میں کیسے رک جاتا۔

”اور میں تمہاری جگہ ہوتی تو مرجانی لیکن تمہیں کبھی معاف نہ کرتی۔“ فیصلہ تو اس نے سنا ہی دیا تھا۔ میں کیا معافی مانگا، مجھے یہاں سے جانا ہی تھا اور میں چلا گیا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے عاشر؟“ ☆☆☆☆

میں جانتا تھا، کسی نہ کسی دن مجھے اسی سوال کا سامنا تو کرنا پڑے گا اس کے باوجود میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں اس کا جواب کیا دوں گا۔ اور اب جب باقر بھائی جان مجھے گلے سے لگانے کے بعد یہ سوال کر رہے تھے تو مجھے اس کے سوا اور کچھ نہ سوچا کہ میں ایک بار پھر ان کے گلے لگ کے رونے لگا۔ انہوں نے بڑی حیرت سے میرے پشمرہ چہرے پر پھیلنے آنسوؤں کو دیکھا۔

”تمہیں ہو کیا گیا ہے عاشر! میرے بھائی، میرے بیٹے، آخر تم بتاتے کیوں نہیں۔ ہم سب سے کیا غلطی ہوئی تھی جو تم میں چھوڑ کے چلے گئے؟

میرے بیٹے، دل کی بات، دل میں رکھنے کی عادت کب چھوڑ دے۔“ میں تب بھی کچھ نہ بولا۔ بس آفسو بہا رہا۔

”تمہارے جانے کے بعد ہم لوگ کتنے پریشان ہوئے۔ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ ان تکلیف دہ دنوں کا ذکر بھی میرے زور ٹکٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ میں نے ہر ہسپتال، تھانے کے پتھر لگائے۔ ہاپو کی آخری حد تک جا کے میں نے یہاں تک سوچا کہ کہیں.... خدا خواستہ تم کسی حادثے کا.... لیکن ای جان نے مجھے ایسا نہ سونچنے دیا۔ انہیں یقین تھا کہ تم زندہ ہو۔ مگر ناراض ہو۔ کسی نہ کسی بات پر زور دے کہ چھپ بیٹھے ہو۔ وہ آخری دن تک تمہیں یاد کرتی رہیں۔ پکارتی رہیں مگر تم نہ جانے کہاں چھپ بیٹھے تھے

کہ ان کی صدمہ تک پہنچ ہی نہ سکی۔

میرے آنسوؤں میں پہلے سے بڑھ کے شدت آ گئی۔

”لیکن ان کے جانے کے بعد مجھ میں نے تمہارا انتظار نہیں چھوڑا۔

پہلے ای جان نے میرے اندر کسی نہ کسی دن تمہارے لوٹ آنے کی امید زندہ رکھی۔ پھر ان کے جانے کے بعد زینا نے میرے حوصلے نہ ٹوٹنے دیے۔ امی جان تمہیں منانے کی حسرت لیے اس دنیا سے چلی گئیں لیکن زینا ابھی بھی.....“

”زینا..... زینا عمر!“ میں ان کی بات کاٹ کر بے یقینی سے بولا۔

”ہاں زینا عمر، امی کے آخری وقت میں اس نے ان کی بڑی خدمت کی اور بہت دعائیں لیں۔ اسے پورا یقین ہے کہ ایک روز یہ دعائیں رنگ لے آئیں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگے۔ میں ہنوز اکھن کا شکار تھا۔

”وہ اب بھی.... اب بھی یہاں آتی ہے۔ اتنا سب ہونے کے بعد بھی۔“ میں حیرت زدہ سا بیٹھا رہ گیا۔ گالوں پر بیٹھے میرے آنسو بھی حیران ہو کے ختم ہو گئے۔

”عاشر.....! یہ آنسو.... یہ ایک اور تہذیبی ہے جو میں تم میں دیکھ رہا ہوں تم تو کہتے تھے، رونے ہی کسی کی آخری حد کا اظہار ہوتا ہے۔ اور عاشر ملک کبھی بے بس نہیں ہو سکتا اس کو چاہیے کوئی حد آخری نہیں ہو سکتی۔“

”بھائی جان! میں جان گیا ہوں کہ بے بسی اور عاجزی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ آخری حد جس کے نہ ہونے کا مجھے بڑا ذمہ تھا، اندھا دھند، سر پٹ بھاگتے ہوئے اسی آخری حد سے ٹھوکر کھا کے میں نیچے گرا ہوں، اور اب تک نیچے گرا ان آنسوؤں سے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے خدا سے دعا مانگ رہا ہوں کہ کب وہ مجھے معاف کر دے، میری خطا میں بخش دے۔ میری توبہ قبول فرمائے۔“ بھائی جان کچھ نہ سمجھے۔

”میرا خیال ہے تم آرام کرو، وہ فہم نہیں سونے تو نہیں دیا ہوگا۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور فہم دہی مجھے اس کا اشارہ کیا۔ میں مسکرا دیا۔ اور فہم کا ہاتھ تھام کے اسے روک لیا۔ بھائی جان کی حیرانی بجاتی تھی۔ لیکن وہ گزرے کل کی بات تھی۔ اس کل کی، جس کل میں اس کے پاس بس ”میں“، ”ہی“، ”میں“ ہوتا تھا اور اب ان کے بھائی کی ”میں“، ”ہی“ تو ٹوٹ چکی تھی۔ اب تو بس ”تو ہی تو“، ”رہ گیا تھا۔ اس ایک لمحے کے انکشاف نے مجھے سراپا بدل دیا تھا۔

کتنی عجیب سی بات ہے کہ آٹھ کھلے ہی میں نے خود پہ ہر طرح کی نعمتوں، آسائشوں کی برسات ہوئی دیکھی خدا کی ہر نعمت کا حرا خوب لوٹا، مگر اس سے انتہاں اور بے خبر رہے کہ اور جب اس ذات واحد کو پہچانا تو خود سے ہی نفرت ہو گئی۔ اپنی

اس خود ساختہ جلا وطنی میں میں نے اپنے نفس کو بھوکا پیاسا رکھ کے ملامت اور پچھتاوے کے ہزاروں کوڑے برساتے تھے۔ میں اپنے بھائی کے اس سوال کا کیا جواب دوں کہ میں کہاں رہا، میں نے کیا کیا۔ مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ.....

پہلا لفظ تھا تمام خدا کا، دوجا لفظ جدائی بعد کی گھٹول دار عبارت کچھ نہ سمجھ میں آئی

☆☆☆

زینیا کے گھر چے نکلے کے بعد مجھ میں اتنی ہمت تک نہ تھی کہ میں اپنے گھر جا پاتا۔ میرا پاسپورٹ، سرٹیفکیٹس، چیک بکس، سب آفس میں تھا۔ وہ سب لے کر میں سیدھا اسلام آباد چلا گیا۔ میرا امریکہ کا ویزا پچھلے سال ہی پانچ برس کی معیاد کا لگا تھا۔ ٹکٹ لینے میں مجھے صرف دو دن لگے اور یہ دو دن میں نے ہوش کے بند کر کے میں خود کو یہ سمجھانے میں گزارے کہ معاف کر دینے والی، صرف خداوند کریم کی ہے۔ اگر مجھے معافی مانگنا ہے تو اسی سے مانگنا ہے۔ زینیا تو کہہ ہی چکی تھی کہ میں تمہاری جگہ ہوتی تو تمہیں بھی معاف نہ کرتی۔

بہی تو اللہ اور بندے کے درمیان رشتہ ہے۔ کہ ہزار نافرمانیوں کے بعد بھی اس کا دور بندے کے لیے کھلا ہی رہتا ہے جب کہ..... زینیا..... میں جی بھی یہ تصور کرتا کہ میرے جانے کے بعد کیا کیا ہوا ہوگا۔ میرے روٹنے کھڑے ہو جاتے۔

جب امی جان اور باقر بھائی جان کو وہ تصاویر ملی ہوں گی جن میں زینیا کسی انجان شخص کے ساتھ حدود درجہ بے تکلفی سے قریب ہے تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ امی جان تو فوراً یہ تصاویر زینیا کے منہ پہ مارنے پہلی گئی ہوں گی۔

اور زینیا نے خود جب یہ تصاویر دیکھی ہوں گی تو اس کی اپنی حالت کیا ہوگی۔ اور جب امی جان اسے بتائیں گی کہ عاشر اس کے کروتوتوں سے پہلے ہی آگاہ کر چکا ہے تو وہ فوراً سمجھ جائے گی کہ یہ حرکت بھی میری ہے۔ ویسے بھی اس کی یہ تصاویر میرے ہی آفس کے فنکشن میں لی گئی تھیں اور ان کے ٹیکسٹ بھی میرے ہی پاس تھے۔ میرے علاوہ اور کون ان ٹیکو زکو غلط مقاصد سے استعمال کر سکتا ہے۔

اور میرا راز کھل جانے کے بعد اس نے..... بس اس سے آگے میں اپنے تصور کو روک لیتا۔ سوچوں کے دروازے مضبوطی سے بند کر لیتا، ابھی اس جلا وطنی کو بڑھ سال کا عرصہ ہی گزر تھا، کہ میرے دل کو اچانک ایک بے گلی نے آن گھیرا۔ وہ ہمک ہمک کے پاکستان کی طرف پلٹنے لگا۔

بے تاب ہو کے میں نے چوری چھپے کچھ اور ذرائع سے وہاں کی خبریں لینا چاہی اور

پہلی خبر جرمی وہ چچی کہ امی جان کی وفات کو پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اٹھارہ مہینوں کے بعد میں نے خود چارویں چار ڈرامی سرکے باہر دیکھنا چاہا تھا اور اسی ڈرامی اوٹ سے اتنی گرم کمرے کو کچھ پتیلے بڑے کہ میں نے گھبرا کے خود کو اور ڈھانپ لیا۔ اور کئی سال تک مجھ دوبارہ کوئی خبر لینے کی کوشش نہ کی۔

اسی روپوشی کے عالم میں کئی سال گزر گئے کہ ایک دن اچانک نوید سے ملاقات ہوئی۔ اس نے شادی کر لی تھی۔ اس کی خوبصورت بیوی اور پیاری سی بیٹی بھی اس کے ہمراہ تھی اس لیے ایک حد میں رہتے ہوئے وہ مجھے چشتی کا لیاں دے سکا۔ اس نے دیں۔ میں ڈر رہا تھا کہ اس کے سوالوں کے جواب کیا دوں گا، لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ البتہ زبردستی میرا ایڈریس ضرور لیا۔ میں نے اس کی منتیں کی۔ ”تمہیں قسم ہے نوید بھائی جان کو میرا پتا مت دینا۔ میں امی جان کی وفات تک پرتو وہاں جانے سکا۔“

اور اس نے وعدہ بھی کر لیا، بلکہ شاید کسی حد تک نبھایا بھی۔ اس نے بھائی جان کو میرے امریکہ میں ہونے کی اطلاع نہیں دی تھی لیکن اس کے پاکستان جانے کے صرف ایک مہینے بعد ملنے والے زینیا کے خط نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اسے میرا ایڈریس کہاں سے پتا چلا۔ چار اس خط نے مجھے کچھ ایسا الجھایا کہ میں جی کی فرصت میں پاکستان پہنچنے کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکا۔

”میں نے سرخ گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔“ اور ساتھ ہی مجھے اس کے وہ الفاظ بھی یاد آئے۔

”سرخ پھول تو دو ہی مواقع پہنچتے ہیں، یا شادی یا میامت پہ.....“ اور شاید وہ شادی ہی کر چکی تھی اور مجھے میرا عہد یاد دلانے کا بھی اس کا بھی یہی مقصد رہا ہوگا کہ وہ مجھے یہ بتائے کہ کسی کے لاکھ برا چاہنے سے برا ہو تو نہیں جاتا اور میں اس کے ساتھ کچھ اچھا ہونے کی دعائیں کرتا ہوا چلا آیا۔ کسی دوسرے موقع..... میں نے سر جھٹک دیا۔ ایسے کیا ہو سکتا ہے مجھے باقر بھائی جان کی بات بھی ڈسٹرب کر رہی تھی۔

”آخری وقت اس نے ان کی بڑی خدمت کی اور بہت دعائیں لیں۔“ فہد نے بھی اس کے بارے میں چشتی باتیں کی۔ ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ گزریے سالوں نے اسے زینیا کے اور قریب کر دیا تھا وہ تو اس کی خاصی حد تک انحصار کرنے لگا تھا۔ اگلے روز جب میں نوید سے ملنے اس کے آفس گیا تو مجھے میرا آفس تھا تو وہ مجھے دیکھ کے نہ چونکا۔ نہ حیران ہوا

”آؤ عاشر! میں کئی روز سے تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کے

مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ اس کی گرجوٹی نے مجھے گلے کرنے پر مجبور کیا۔

”نوید، زینیا کو میرا ایڈریس تم نے دیا۔“

”ہاں۔“ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس نے اقرار کر لیا۔

”مگر کیوں۔“ میں احتجاجاً جج اٹھا۔

”پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کیوں چھپتے پھر رہے ہو۔۔۔؟“ کس بات کی سزا دے رہے ہو زینیا

کو، اپنے بھائی کو۔۔۔؟“

”تم نہیں جانتے نوید تم کچھ نہیں جانتے۔ اگر تم جان جاؤ تو میرے لیے اس سے

کڑی سزا بخو کر دے۔“ ہاں یہ سزا میں خودی کو دے رہا ہوں۔“

”نہیں یہ سزا تم ان سب کو دے رہے ہو، جو تم سے محبت کرتے ہیں۔ اور ہاں عاشر

میں جانتا ہوں، سب جانتا ہوں۔“ اس نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔ میں پہلے

حیران ہوا، پھر شرم سے زمین میں گر گیا۔

”تو کیا زینیا نے تمہیں بھی سب کچھ بتا دیا۔“

”نہیں بلکہ اصل میں تو میں نے زینیا کو۔۔۔“ وہ زکا پھر کی چین اٹھا کے مجھے بھی

اشارہ کیا۔

”چلو اٹھو، باہر نکلے ہیں، آفس میں ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔“ میں کسی معمول

کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔

”جانتے ہو اس روز، اس روز جب تم جانے سے پہلے مجھ سے آخری بار ملے تھے۔“

اس نے اپنی کارڈ بوس روڈ سے نکال کر رینگ چوک پر ڈال دی۔

”ہاں لیکن تب تک میں نہیں جانتا تھا کہ میں کچھ گھنٹوں بعد کس طویل سفر پہ نکلے والا

ہوں۔“

”لیکن میں آدھ گھنٹے بعد ہی جان گیا تھا کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو۔“ اب کار

چوہر جی سے ٹرن لے کر فیروز پور روڈ پہ آ گئی تھی۔

”کیا مطلب۔“

”یاد ہے اس دن تم نے مجھے دو لفافے بٹکرائے تھے اور کہا تھا کہ دو بچے، کوریئر

سروں کا نمائندہ آ کے یہ لفافے کب کر لے گا۔ تم نے مجھے اس کی خاص حفاظت کی تاکہ

کسی۔ میں نے الٹ بلیٹ کے دیکھا ایک یہ تمہارے گھر کا ایڈریس تھا، دوسرے پہ باہر

بھائی جان کے آفس کا۔ لیکن دوسری طرف بھیجے والے کا کوئی نام وہ نہیں تھا۔ میں نے

بڑی حیرت سے تم سے اس راز داری کی وجہ دریافت کی اور تم نے بڑے پراسرار طریقے

سے سکرانے ہوئے کہا کہ تم انہیں کوئی سربراہ دینا چاہتے ہو۔ میں نے بھی زیادہ نہ کر دیا

تمہاری اوٹ پلاننگ سب پھر ہی حرکتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔“

کاراب و حدت روڈ سے گزرتی تھی۔ میری خالی خالی نظریں جانے پہچانے سائن

بورڈز کو سرسری سا دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ منوں پوری سفاکی کے ساتھ ذہن کے پردے

پر میری تمام تر منوں حرکات کے ساتھ ابھرتا تھا۔

”اس دن تصاویر بیک کرنے کے بعد میں نے اپنی مخصوص کوریئر سروس کو فون کیا۔

اسے دو بجے آنا تھا۔ جب کارابھی۔۔۔ میں نے نام نہ دیکھا اور سوچا کہ کہیں اس کے انتظار

میں دیر نہ ہو جائے۔ میں آج ہی زینیا سے آخری ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ آفس نہیں

آئی تھی۔ کل تک بہت دیر ہو جاتی کچھ گھنٹوں بعد میں اسے ہرانے والا تھا اور مجھے تو اس کو

ہارنے سے کچھ دیر پہلے دیکھنا تھا۔ میں نے تصاویر والا لفافہ نوید کے حوالے کیا اور خود زینیا

کے گھر چلا گیا۔ نوید کی ذمہ دارانہ فطرت پہ مجھے یقین تھا اور کوریئر سروس کی بروقت سروس

پہ بھی بھروسہ تھا۔

جس وقت میں شگسٹی سے دو چار شرم اور ذلت سمیٹے اس کے گھر سے نکلا۔ اس

سچے پھرے انداز سے کے مطابق وہ تصاویر اپنے مقام پہ پہنچ چکی تھیں اور میں چوہر جی

طرح اپنا تم چھپا کے دیاں سے بھاگ نکلا۔ ”کیا وہ تصاویر۔۔۔؟“ میں نے گردن موڑ

کے نوید کو دیکھا۔ کاراب سچ زانہ باپھل کے آگے سے گزرتی تھی۔

”وہ لفافے میرے بالکل سامنے دھرے تھے اور میں نیوز پیپر کا مطالعہ کرتے

ہوئے کافی بی رہا تھا کہ اچانک مجھے یہیں کیسے کافی میرے ہاتھ کے بالکل قریب رکھے

لفافے پہ چٹک لگی۔ یہ تمہارے گھر کے ایڈریس والا لفافہ تھا۔ کافی کچھ اس بری طرح

چٹکی تھی کہ ایڈریس تقریباً چھپ ہی گیا تھا اور مشکل سے بھی پڑھانہ جا رہا تھا۔ میں نے وہ

لفافہ تبدیل کرنے کا سوچتے ہوئے سائیڈ دروازے ایک نیا لفافہ نکالا اور اس نے تمہارے گھر

کا ایڈریس لکھا، جیسے ہی اس لفافے کے اندر موجود تھا ”سربراہان۔“ کا لٹنے کے لیے میں

نے اسے چاک کیا، چند تصاویر پھیل کے میری گود میں آن گئیں۔ ان چار تصاویروں میں

سے تین کی پشت میری جانب تھی جب کہ ایک تصویر میں زینیا، ہاشمی گروپ آف انڈسٹریز

کے بہروز کے گلے کا ہار تھی مجھے حیرت زدہ کر گئی۔

حیرت کی ایک وجہ تو زینیا عمر جیسی لڑکی کی ایسی تصویر کا ہونا تھا۔

حیرت کی دوسری وجہ ان تصاویر کا تمہارے پاس ہونا تھا۔

اور حیرت کی تیسری وجہ یہ تھی کہ ان تصویروں کو تم اپنے ہی گھر کیوں بھیج رہے تھے۔

میں نے جس کا شکار ہو کے دوسرا لفافہ بھی کھول لیا اس میں بھی یہی کچھ تھا۔ میں

سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن میری سوچ کو کوئی سراہا تھا نہ لگ رہا تھا، ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی

سودے کے لیے دو اردو چار کرنے کی سوچتا رہا۔ جب مجھے خسارے کا اندیشہ ہوا تو میں نے بے ایمانی کر کے منافع خوری کا سوچا۔ میں نے اعتراف کیا۔
 ”نہیں عاشق! یہ محبت ہی تھی۔ تمہیں بتا بعد میں چلا! احمق انسان تمہیں اس سے محبت نہ ہوتی تو اس کے لیے ایک بار بار سوچ لینے کی غلطی تمہیں اتنا نہ ستاتی کہ تم یوں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ اب بھی وقت ہے لوٹ جاؤ اس کے پاس وہ تمہارے انتظار میں
 ”لوٹ جاؤں، اس کے پاس۔ وہ میرے انتظار میں ہے۔ اگر میں تمہارے اس دلاسے کو چھ بھی جان لوں تو نوید جب وہ میری سچائی جان لے گی تو تب۔ تب کیا اسے اپنے اس انتظار پر افسوس نہ ہوگا۔“

”کیسے جانے گی۔ کون بتائے گا اسے؟“ چچی اور بھائی جان تک یہ سارا معاملہ کبھی پہنچایا نہیں۔ میں..... میں وہ تصاویر ایسی دل جلا بیٹھا جس دن زینیا کے اقرار پہ میں نے یہ ساری سچی سلجھائی تھی۔ اور کون ہے۔ کیا تم کہتم کہ تم پر گزرا سے یہ نہیں بتاؤ گے ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ وہ پہلے ہی ٹوٹی ہوئی ہے۔ ٹھہری ہوئی ہے اسے یہ غلط فہمی ہے کہ تم اس کی غلطی معاف نہیں کر پائے۔ وہ وہ خود پیچھا توڑوں میں گھری ہوئی ہے۔
 ”کیا واقعی اللہ نے میری توبہ قبول کر لی ہے۔ کیا واقعی..... مجھے اس نے معاف کر دیا ہے، نوید میں نے سوچا تھا جب میں اپنی زندگی میں کوئی خوش کن خبر سنوں گا تو جان پاؤں گا۔ میرے بچوں کے رائیگاں نہیں گئے۔ میری دعائیں قبول ہوئیں۔ اور اس سے وی خوش خبری، میرے لیے اور کیا ہوئی کہ وہ گناہ جس کے کرنے کے میں تمام ارادے کر آیا تھا، خدا نے وہ گناہ میرے نصیبوں میں ہونا لکھا ہی نہیں تھا۔
 ”وہ اللہ ہے عاشق..... ستر ماؤں سے بڑھ کے پیار دینے والا، تم نے

نجانے کس دل سے اسے یاد کیا کہ اس نے اپنی رحمت سے تمہارے دامن پہ گناہ کا یہ داغ غلے ہی نہ دیا۔ اور اتنے سال..... درمیان کے یہ اتنے سال شاید تمہیں نکلن بنانے کے لیے تھے، پہلے بھی تم نے محبت کی تھی۔ اب بھی تم محبت کرتے ہو لیکن اب تم صرف محبت کر ہی نہیں سکتے۔ اسے بھابھی سکتے ہو۔ تم نے خوب سزا بھگت لی۔ اور انجانے میں اس لڑکی کو بھی دے دی۔ اب لوٹ چلو..... اور اس کی سزا بھی ختم کر دو..... اس کے دل سے یہ پچھتاوا جاتا رہے کہ وہ تمہارا دل دکھانے کا سبب بنی۔“

”کتنی عجیب سی بات ہے نا نوید۔ میں تو اپنے کیے کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس سے مت چھپاے پھر رہا تھا۔ اس سے معافی نہ ملنے کا خوف مجھے بھگا رہا تھا اور وہ..... وہ بھی اتنے ہی سال اسی آگ میں جلتی رہی، اسے بھی یہی پچھتاوے تھے۔ کتنی عجیب سی بات ہے ہم دور رہے، انجان رہے۔ لیکن ہمارے جذبات ہمارے احساسات ایک رہے۔“

تھی جس کو بنیاد بنا کے تم ایسا کرتے۔ میں نے وہ تصاویر کو برسرِ دوس والے کے حوالے نہ کیں۔ میں تم سے بات کرتا چاہتا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے تم کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہو۔ تمہارے ذاتی معاملے کا مجھ سے چاہے مجھے تمہاری کتنی ہی بری محبت کیوں نہ ہو۔ میں تم سے اصل بات اگلوں کے رہوں گا۔ آخر یہ ایک لڑکی کی عزت کا معاملہ تھا۔ تو مجھے ان تصاویر کی حقیقت کے بارے میں ہی شک و شبہ تھا اور بالفرض اگر ایسا سچ بھی ہوتا تو تمہیں اس کو مستحکم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تمہاری کچھ نہ گنتی تھی۔ تمہارا اس کی اچھائی برائی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

میں تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم نہیں آئے، نہ اس دن نہ اس سے اگلے دن، میرا انتظار لمبا ہوتا چلا گیا۔ باقی بھائی اور چچی کی بار بار مجھ سے پوچھتے آئے۔ میں کیا کہتا۔ میں خود لاعلم تھا۔ دوسری طرف زینیا کی عروغ نے پچھنی بے تابی مجھے اور حیران کر رہی تھی۔ اسے تمہارا انتظار کیوں تھا۔ ”نوید نے اسلیپرنگ ٹھمایا۔ گاڑی کی پیس کی نہر کے کنارے سبک خراش سے رواں دواں تھی۔

”کچھ روز بعد چچی سے بھی علم ہوا کہ باقی بھائی کے لیے زینیا میں انٹرنل منڈ تھیں، لیکن زینیا نے پہلے اقرار کرنا پھر انکار کر کے یہ باپ ہی ختم کر دیا۔ یہ انکشاف مجھے کچھ اور حقیقت پہ مجبور کر لیا۔ زینیا نے ریزائن دے دیا تھا مگر وہ قوت سے تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لیے مجھ سے مسلسل رابطے میں تھی۔ ایک روز میں نے اسے دھڑلایا۔ وہ بے حد کڑور ہو رہی تھی۔ جذباتی طور پر بھی اور نفسیاتی طور پر بھی، زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکی اور اس نے میرے سامنے اقرار کر لیا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور اس سے کسی بات پر ناراض ہو کہ تم نے خود کو لاپتا کر لیا ہے۔“ اتنا کہہ کر نوید نے میری طرف دیکھا۔

”کیا اب بھی میں نہ سمجھتا۔ تم اسے چاہتے تھے اور وہ تمہیں اگر چچی کی وجہ سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو رہی تھی تو اسے طریقے سے بھی سمجھایا جاسکتا تھا۔ تم ان سے بات تو کر کے دیکھتے، کیا وہ تمہاری نہ سنا تیں۔ آخر تم نے یہ کیوں کیا کہس لیے۔ اگر وہ تصاویر..... سوچو ذرا زینیا پہ کیا گزرتی آخر اتنی سیدی سادی کہانی میں تم نے اتنی پیچیدگیاں کس لیے پیدا کیں۔“ بات اتنی سادہ نہیں تھی۔ ”میں نے کہا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ کچھ پیچیدگیاں میں نے خود پیدا کیں اور کچھ خود بخود پیدا ہوئی چکی گئیں۔

”کیوں نہیں تھی۔ تم اس سے محبت کر رہے تھے۔ نا بس اتنا کہہ دیتے چچی سے۔ اس فضول حرکت کی کیا وجہ تھی۔ یہ محبت کا کون سا انداز ہے۔“
 ”محبت..... میں نے محبت کب کی نوید۔ میں تو پلاننگ کرتا رہا ایک نفع بخش

میں نے پرسکون ہو کے اپنا سر ٹیک لیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ نوید نے کیمپس سے اب کار ڈاکٹرز ہاسپٹل۔“ کی طرف موڑ لی تھی۔ یہ وہی ہاسپٹل تھا جہاں سے واک کرتے ہوئے میں زینیا کو پہلی بار اس کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ میں سمجھ گیا، نوید مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔

ادا سی تم اسے کہنا
اکیلا تو نہیں دکھ میں
تیرا کچھڑا ہوا
اُجڑے ہوئے شہروں میں اکثر بھاگتا پھرتا ہے
اکثر بھاگتا پھرتا ہے

اور ادا سی

تم اسے کہنا
تسبی دکھ میں نہیں ہو
ہم بھی اپنی راکھ
ہاتھوں میں لیے
سسکیاں لیتی ہوئی

تہائیوں کے بال کھولے مین کرتے ہیں

”بس اب..... بس کر یہ تہائیوں کے نوچے، ادا سیوں کی باتیں۔“ نوید نے میری خود کلامی پہ مجھے ٹوکا۔

”بو تھا درست کر لے اور جیسا میں نے کہا ہے ویسے ہی کر، جب اللہ کو تیرا پردہ منظور ہے تو کیوں اپنے ہاتھوں اپنے لیے گڑھے کھودتا ہے۔ وہ صرف رحیم و کریم ہی نہیں، ستار و غفار بھی ہے۔ تمام عیوب ڈھک دینے والا، خبردار جو تم نے کوئی حماقت کرنے کی کوشش کی۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے اسے روکا۔ ”ذرا یہاں سے ٹرن لینا۔“ وہ اس اسٹریٹ میں مڑنے ہی والا تھا جب میں نے اسے سامنے کی مارکیٹ تک جانے کا اشارہ دیا۔
”وہاں کیوں؟“ وہ چونک کے مجھے گھورنے لگا۔ میرے لبوں پہ عرصے بعد..... یا شاید پہلی بار ایک چچی مسکراہٹ کی دھوپ پھیلی۔

”وہاں..... فلاور شاپ پہ..... مجھے گلاب لینے ہیں۔ سرخ گلاب.... زینیا کے لیے۔ سارے کے سارے گلاب.....“

